مقدمہ تفسیر قرآن

مصنفہ

فخر المحققین سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

ناشر ادارۂ علمیہ (پاکستان) لاہور

مقدّمہ

تفسیرِ قرآن

مُصنّفہ

فخر المحققین سیّد العلماء مولانا السیّد علی نقی صاحب قبلہ (دام ظلہٗ)

ناشر

"ادارۂ علمیہ" (پاکستان) لاہور

تعداد طبع ۱۰۰۰

قیمت للعہ

تعارف

یہ گرانقدر کتاب جس کی اشاعت کا شرف "ادارۂ علمیہ پاکستان" حاصل کر رہا ہے آج سے اکیس برس پہلے ۱۳۵۹ھ میں "ادارۂ علمیہ لکھنو" سے شایع ہوی تھی۔ اور اب عرصہ دراز سے نایاب تھی۔ چونکہ اب سرکار سیّد العلماء مدظلہ نے اصل تفسیر کی بھی کئی جلدیں مکمل فرمادی ہیں جن میں سے پہلی جلد عنقریب منظرِ عام پر آئے گی۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوی کہ اِس "مقدمۂ تفسیر" کو نظرثانی کے بعد دوبارہ شایع کر دیا جائے تاکہ اصل تفسیر کے ساتھ اُس کا یہ مقدمہ بھی جسے معارف قرآنیہ کا ایک خزانۂ عامرہ سمجھا جاسکتا ہے حاصل کیا جاسکے۔

والسلام۔

ادارۂ علمیہ (پاکستان)، لاہور

جمادی الاولیٰ۔

(سنہ ۱۳۸۰ھ)

فہرست مضامین

کتاب "مقدمۂ تفسیر قرآن"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ایک اُردو زبان کی مکمل تفسیر قرآن کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ روزانہ نئے نئے اعتراضات قرآن مجید پر کیے جا رہے ہیں جن کے جوابات یا تو عربی زبان کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں لیکن عام افراد کو اُنکی اطلاع نہیں اس لیے وہ ان سوالات سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور زیادہ اعتراضات خود نئے زمانہ کی پیداوار ہیں اس لیے قدماء کو اُن کے جواب کی طرف توجہ نہ ہوی تھی۔

فلسفہ کے نئے نئے نظریئے جو یورپ سے سمندر پار ہو کر اس سرزمین پر آتے ہیں اور مختلف افراد کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں، اُن کے دلوں میں مذہب کے ہر شعبہ کے متعلق ایسے شبہے پیدا کرتے ہیں جن کا حل اگر اُنہی کی ذہنیتوں کے موافق اور مذاق کے مطابق پیدا نہ کیا جائے تو وہ اُس شبہہ کے گرویدہ بنکر اُس کو عقیدہ کی حیثیت سے اختیار کر لیں گے اور مذہب سے دُور ہو جائیں گے۔

خاص ہندوستان کے ملک میں فرقہ سازی و مذہب تراشی کا وہ طوفان ہے کہ اللہ کی پناہ۔ روزانہ نئے نئے مذہب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نئے نئے پیغمبر اور امام ڈھلتے رہتے ہیں۔ نئے نئے اصُول اور عقیدے بنتے رہتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر قرآن کے آیات کو معنی بدل کر مفہوم میں تغیر دیکر عوام کے گوش گذار کرتے ہیں اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ لوگ جو اپنی "قرآن فہمی" کے بلند بانگ اظہار کو مکمل کرنے کے لیے یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ ہم ہر چیز قرآن سے ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ ایسے ایسے تاویلات آیات قرآن کے کرتے ہیں کہ ناواقف انسان عش عش کرنے لگتا ہے لیکن حقیقۃً الفاظ قرآن سے انکو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مناظرین، واعظین اور ذاکرین نے اس دائرہ کو بہت وسعت دی ہے اور اس دروازہ کو پاٹوں پاٹ کھول دیا ہے۔

اس سب کے بعد مسلمانوں کے قدیم تفاسیر میں وہ عربی زبان میں کیوں نہوں یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ تفسیر قرآن کے روایات میں نقد و تبصرہ سے کام نہیں لیا ہے۔

اُنھوں نے وہ تمام خیالات آنکھ بند کر کے نقل کر دیے ہیں کہ جو مختلف لوگوں نے بعض آیات قرآن کی تفسیر کے متعلق بیان کیے ہیں حالانکہ نہ تو وہ ظاہری الفاظ قرآن کے معانی ہیں جن میں ہر اہل زبان کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہو

نہ وہ رسالتمآبؑ سے بواسطہ یا بلاواسطہ منقول ہیں تاکہ اُن کی ذمہ داری اسلام اور مسلمانوں پر عائد ہو۔ مثلاً قیامت کی بات ہے کہ ہماری اسلامی تفسیروں میں حضرت داؤد کے واقعہ والے آیات کے ذیل میں وہ تمام واقعات درج کر دیے گئے ہیں جو توریت میں حضرت داؤد اور اوریائے حتی کی زوجہ کے معاملہ میں درج ہیں جس کی وجہ سے عیسائیوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ قرآن کی طرف بھی حضرت داؤد کی طرف زناکاری کے نسبت کی (معاذ اللہ) نسبت دیں حالانکہ جو شخص قرآن مجید کے آیات کا اس موقع پر بغور مطالعہ کرے اُسے پتہ چلے گا کہ قرآن مجید کے الفاظ اس الزام سے حضرت داؤد کی برات کرنے والے ہیں نہ اُن پر یہ الزام عائد کرنے والے۔

ان تمام مصائب کا واحد علاج یہی ہے کہ تفسیر قرآن صحیح طریقہ سے مکمل جانچ پڑتال کے ساتھ اُردو زبان میں پیش کیجائے جس سے عام افراد کو فائدہ پہونچے اور وہ ان تمام دشواریوں سے محفوظ رہیں۔

اور پھر قرآن کی نسبت مسلمانوں کی مذہبی کتاب، رسول کا اعجاز، معارف کا خزانہ، حقائق کا گنجینہ ہونے کی بنا پر بھی مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے معانی کو سمجھیں، غور کریں، سبق حاصل کریں اور دوسرے علم دوست حقیقت پسند۔ انصاف پرور افراد کو اُن پر صبر و سکون اور سنجیدگی کیساتھ غور کرنے، رائے قائم کرنے اور مستفید ہونے کا موقع دیں۔

قرآن کی تفسیر کی صحیح خدمت ادا کرنا صرف مسلمانوں کے لیے فائدہ بخش و منفعت رساں نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام اقوام کے لیے یکساں طور سے فائدہ بخش ہے اور کم از کم جس زبان میں وہ تفسیر کی جائے اُس زبان والوں کے لیے تو بلاتفریق مذہب و ملت وہ ایک مفید خدمت سمجھی جاسکتی ہے اور اسکے بعد یہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں منتقل ہو کر دوسرے افراد کے لیے بھی فائدہ بخش ثابت ہو سکے۔

یہ فرض انتہائی اہم ہے اور میں تو اس کو کسی حیثیت سے ادا کرنیکے قابل ہی نہ تھا اس لیے باوجود مدت مدید سے اس فرض کے احساس کرنے کے میں نے اپنے قلم کو خاموش رکھا لیکن احباب کے پیہم اصرار اور ضرورت کے ناقابل برداشت احساس نے بہزار دقت اپنی سیکڑوں مصروفیتوں کے باوجود اس کام کو شروع کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اور اس عظیم مقصد کو پیش نظر رکھکر جس کے پورا کرنے کے لیے ایک عمر کی ضرورت ہے صرف خدا کی تائید پر بھروسا کرتے ہوئے اس افتتاحیہ کو تحریر کر رہا ہوں۔

کامیابی و کامرانی اُسی کی توفیق اور تائید پر موقوف ہے۔

قرآن کی تفسیر کے اصل موضوع کو شروع کرنے کے قبل چند تبصرے ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا تبصرہ

قرآن کی لفظی تشریح

قرآن مجید اور حدیثِ قدسی میں تفرقہ

"قرآن" "قرأۃ" سے ماخوذ ہے۔ اسکے اصلی معنی لغت اور محاورہ کے اعتبار سے جمع کرنے کے ہیں کتابت کے عام طور پر رواج پانے کے پہلے کسی انشاء، نظم یا نثر مجموعہ کے جمع کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ اسکو سینہ میں محفوظ یعنی ازبر یاد کر لیا جائے۔ اسی بناء پر صدر اسلام میں "قراوت" بمعنی "حفظ" مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چونکہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقۂ اداء اور اُن کے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اور اُس کو لحن کے ساتھ پڑھتے بھی تھے اس لیے رفتہ رفتہ "قراءۃ" بمعنی علم مخارج حروف ہو گیا اور "قاری" یعنی مخارج کا جاننے والا اگرچہ "حافظ" نہ ہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہے۔ صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا۔ پھر چونکہ جمع کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہے کہ انسان پوری کسی تحریر پر نظر ڈال لے اور اس کو ذہن نشین کرے اس لیے "قراوت" کے معنی مطلق "پڑھ لینے" کے بھی عام زبانوں میں رائج ہو گئے اور یہ محاورہ بھی صدر اسلام کے شروع ہی سے نظر آتا ہے۔

"قرآن" خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہے اُن الفاظ و کلمات کا جو بطور وحی جبرئیل امین کے توسط سے حضرت خاتم النبیینؐ پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

اور اسی آخری قید (بحیثیت معجزہ) سے فرق ہو گیا ہے "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں کیونکہ حدیث قدسی بھی خدا کی طرف کے پیغام ہیں جو فرشتہ کے ذریعہ سے رسالتمآبؐ تک پہونچے ہیں لیکن وہ خاص آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل بنا کر یعنی معجزہ کی حیثیت سے نازل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ وہ خاص خاص مواقع اور حالات میں خاص خاص خطابات ہیں جو براہ راست رسول کی طرف متوجہ ہیں یا آپ کے توسط سے امت تک پہونچائے گئے ہیں جیسے لولاك لما خلقت الافلاك[1] عبدی اطعنی حتی اجعلك مثلی[2]۔ لا یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتی اکون سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به الخ[3]۔ لا اله الا الله حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی[4]۔ وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] اگر آپ نہ ہوتے (اے رسول) تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ [2] میرے بندے میری اطاعت کرتا کہ میں تجھکو اپنا نمونہ بنا دوں [3] میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میری درگاہ میں قریب ہوتا جاتا ہے یہانتک کہ میں اُسکا سننے والا کان اور دیکھنے والی آنکھ بن جاتا ہوں [4] لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے۔ جو میرے قلعہ میں داخل ہوا میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔

یہ کھلا ہوا اور صاف فرق ہے جو عام طور سے زبان زد بھی ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں ایک دوسری حیثیت سے بہت بڑا فرق ہے جسکی بنا پر دونوں کی نوعیت ہی جداگانہ اور مختلف ہو جاتی ہے۔ اسکے سمجھنے کے لیے انسان کو اپنے درمیانی نامہ و پیام کی نوعیت پر نظر ڈالنا چاہیئے، اسوقت حقیقت حال کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہوگی۔

ہم کسی اپنے عزیز کے پاس اپنے دوست خاص یا معتمد ملازم کے ذریعہ سے کوئی پیغام بھیجتے ہیں پیغام کے معنی ؟ یعنی ہم اپنے مقصد اور اپنے دل کی بات کو اُس دوست یا ملازم کے ذہن نشین کر دیتے اور خوب سمجھا دیتے ہیں تاکہ وہ اُس مطلب کو صحیح طور سے ہمارے اُس عزیز تک پہونچا دے۔ اس مقام پر سفارت کا مقصد اور پیغام رسانی کا مفاد صرف ہمارے دلی منشا اور مراد کا اس مرسل الیہ تک پہونچ جانا ہے۔ اگر قلبی مفاد کوئی مجسم شکل رکھتا ہوتا تو یقیناً ہم اُسے خود اپنے سفیر کے ہاتھ اُس کے ذریعہ سے مخاطب اصلی تک پہونچانے کی کوشش کرتے مگر مشکل یہ ہے کہ قلبی مفاد اپنے معنوی دائرہ کے اندر دیکھنے کے قابل شکل نہیں۔ سننے کے قابل آواز نہیں، پکڑنے کے قابل جسم نہیں۔ غرض کسی حیثیت سے ظاہری حواس میں آنے کے لائق نہیں، نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے قابل۔

اس لیے ہم بھی مجبور ہیں کہ اپنے نمایندہ تک "الفاظ" کے ذریعہ سے اپنے مقصد کو پہونچائیں اور وہ بھی مجبور ہے کہ ہمارے مخاطب اصلی تک اُس مقصد کو "الفاظ" ہی کے ذریعہ سے پہونچائے۔

الفاظ اس موقع پر ناگزیر صورت سے استعمال ضرور کیے جاتے ہیں لیکن حقیقۃً مفاد سفارت کا تعلق الفاظ کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ درمیانی سفیر الفاظ میں تغیر و تبدل کرے لیکن مطلب میں تبدیلی نہ ہونے پائے اور مقصد میں کمی نہ ہو تو وہ ایک کامیاب سفیر، صحیح پیغام رساں سمجھا جائے گا۔

الفاظ کے تبدیل سے اُس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا اور نہ وہ اس میں مجرم قرار دیا جائیگا۔

بلکہ اکثر اوقات اُسے الفاظ کی تبدیلی ضروری ہوگی۔ جیسے اُس وقت کہ جب ہماری اور ہمارے اصلی مخاطب کی زبان مختلف ہو اور ہمارا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقف تو ہم اُس سے اپنا مقصد اپنی زبان میں کہیں گے لیکن اُسے اصلی مخاطب سے ہمارا مقصد اُس کی زبان میں کہنا ہوگا۔

وہ اس موقع پر ہمارے ہی الفاظ کو نقل کرے تو یہ اسکی حماقت اور عقلی کوتاہی سمجھی جا سکے گی۔

اسی طرح ایک زبان کے جاننے والوں میں ہمارا پیغام رساں ذہین ہے مختصر لفظوں میں مطلب ذہن نشین کرتا ہے لیکن جسے پیغام دیا گیا ہے وہ جاہل، کند ذہن، نافہم ہے۔

تو ہمیں اپنے مخاطب یعنی پیغام رساں سے مختصر لفظیں کہدینا کافی ہونگی لیکن اُس کے عقل و تدبر کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مخاطب یعنی مرسل الیہ سے اتنا کھول کے اس مطلب کو کہے کہ وہ سمجھ جائے۔

اس کا نام ہے پیغام جس میں "نقل بالمعنی" یعنی اصل مقصود کو جداگانہ لفظوں میں بیان کرنے کی سفیر کو گنجائش حاصل ہے۔

دُوسری صورت ہے "نامہ" کی۔ اسکی نوعیت مختلف ہے یہاں معانی کو الفاظ سمیت نقوش کے طلسم میں محفوظ کیا جاتا ہے اور انہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہونچانیکی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں اگر ہمارا قاصد خط کو پھاڑ ڈالے اور دوسرا خط اُسی مضمون کا تحریر کر دے یا اُس کے مطلب کو بلا کم و کاست زبانی جاکر بیان کر دے تو وہ کبھی طرح اپنے فرض کو انجام دینے والا اور سفارت ادا کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہے اور بد دیانتی کا ملزم ہوگا۔

زبانی پیغام میں بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ غرض کسی نہ کسی طرح الفاظ سے متعلق ہو جائے بمثال کے طور پر ہمارے دوست نے ہم سے ایک دعا دریافت کی تھی کہ وہ صبح اٹھ کر پڑھ لیا کرے ہم نے کسی شخص سے جو وہاں جا رہا تھا کہا کہ تم اُن سے کہدینا کہ آپ صبح اٹھکر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔

یہاں اس جملہ تک کہ "آپ صبح کو اٹھکر یہ دُعا پڑھ لیا کیجیے" پہلی قسم کے پیغام کی حیثیت ہے جس میں درمیانی شخص کو الفاظ میں تغیر و تبدل کا حق ہے لیکن جہاں سے وہ دُعا شروع ہوی ہے پھر درمیانی شخص کو زیادتی کا اختیار نہیں ہے اگر اُس نے اسمیں کوئی کمی یا زیادتی کی تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جائیگا۔

دُوسری مثال ہمارے کسی شاگرد نے کوئی شعر سنایا تھا اور اصلاح چاہی تھی یا ہم نے خود اُس کا شعر سُن کر اسے پسند نہیں کیا، ترمیم ضروری سمجھی۔ ایک درمیانی شخص سے جو جا رہا تھا اور شعر یاد رکھنے اور سمجھنے کے قابل تھا۔ ہم نے کہا کہ فلاں شخص سے کہنا کہ آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے۔

یہاں اتنے الفاظ میں کہ "آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجیے" درمیانی شخص کو تغیر و تبدل کا حق ہے مثلاً وہ کہدے کہ آپ اپنے خط میں اس طرح اصلاح کر لیجئے، اسطرح ترمیم کر دیجیے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل شعر میں وہ کچھ تغیر و تبدل کرے یہ جائز نہ ہوگا۔ اس کو اُسے اُنہی الفاظ میں پہونچانا چاہیے جو ہم نے اس کے لیے بتلائے ہیں۔

جب یہ دو نوعیتیں معلوم ہوگئیں تو اب "حدیث قدسی" اور "قرآن" کا تفرقہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

"حدیث قدسی" خدا کا پیغام ہے جو جبرئیل امین یا کسی اور ملک مقرب کے ذریعہ سے رسالتمآبؐ تک پہونچا تھا، اسکی نوعیت پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔

یعنی اُس ملک پر حضرت احدیت کی طرف سے مراد الٰہی، منظور حضرت احدیت کا القاء بطور معانی ہوتا ہے۔ وہ اُسے رسالتمآبؐ تک بطور پیغام پہونچاتا ہے اور رسولؐ اسکو اپنی امت سے بطور اعلان و اظہار بیان فرماتے ہیں جس میں درحقیقت اصل پیغام کا انتساب خدا کی طرف بحیثیت معانی ہے۔ الفاظ اُس کے نقل و انتقال اور اظہار و بیان کا لازمی خاصہ ہیں جنکو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہے۔

اس قسم کے احادیث کے الفاظ اگر رسولؐ سے براہ راست سنے جاتے تو ان میں کسی قسم کا شک و شبہ ممکن نہیں تھا۔

اس لیے کہ ناقل معنی مراد الٰہی اور پیغام خداوندی کے ملک۔ اور رسولؐ دونوں معصوم ہیں جن پر کسی قسم کی غلطی کا

شک وشبہہ نہیں ہوسکتا لیکن ان احادیث کے بوسائط نقل ہونے میں جیسا کہ موجودہ نسلوں کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے رسالتمآبؐ کے علاوہ دوسرے رواۃ اور محدثین کے بھی نقل بالمعنی کا امکان ہے جس کے بعد اُن کے متعلق وہ یقین حاصل نہیں ہوسکتا جو خود رسالتمآبؐ کی زبان سے ان الفاظ کے سننے میں ہوتا یا موجودہ زمانہ میں قرآن مجید کے آیات کے متعلق حاصل ہے

قرآن کی نوعیت دُوسری قسم کے نامہ وپیغام کی ہے۔ یہاں اصل الفاظ ہیں جو حضرت احدیت کی طرف سے ہوا ہے اور وہ الفاظ ملک کی زبان سے رسُولؐ کے گوش گذار ہوئے رسول کے ذریعہ سے امت تک پہونچے اور امت میں سینہ بسینہ اور نقش وکتابت کے علامات کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوئے۔

اُن میں نہ نقل بالمعنی کی گنجائش ہے نہ کسی قسم کے تغیر وتبدل کا اختیار۔ بیشک ترجمہ کی اجازت ہے تاکہ اس کے معنی سمجھ میں آسکیں لیکن اس ترجمہ کو کلام الٰہی سمجھنا اور اُسپر احکام قرآن کا مرتب کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں الفاظ کی خصوصیت مد نظر ہے اور اسی بنا پر اُس سے جو یقین حاصل ہوسکتا ہے وہ حدیث قدسی سے نہیں۔ حدیث قدسی کی حیثیت دوسرے احادیث کی سی ہے جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے مروی ہیں کہ ان میں سلسلۂ سند کے دیکھنے کی ضرورت ہے جس کے اعتبار سے صحیح حسن، موثق ضعیف کے اقسام پیدا ہوں گے اور جن میں سے بعض معتبر قابل عمل ہوں گے اور بعض معتبر نہ ہوں گے۔

ان احادیث قدسیہ کا بڑا ذخیرہ شیخ حر عاملی صاحب وسائل نے اپنی کتاب "جواہر سنیہ فی الاحادیث القدسیہ" میں جمع کیا ہے جو بمبئی میں طبع ہوی ہے۔

قرآن مجید کے مذکورہ بالا معنی یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ الفاظ جو رسولؐ پر بطور معجزہ بذریعہ جبرئیل امین وحی کی صورت میں پہونچائے گئے" ایسے معنی ہیں کہ جس کے اعتبار سے کل اور جزو کم اور زیادہ یہانتک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت پر بھی "قرآن" کا اطلاق صحیح ہے بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اس کا لکھا جانا جزو قرآن ہونے کے قصد سے معلوم ہو لیکن نظر غور یہ بتلاتی ہے کہ "قرآن" کی لفظ صرف مذکورہ بالا مبہم اور عام مفہوم سے مخصوص نہیں ہے جو جزو کل، قلیل اور کثیر پر برابر سے صادق آتا ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ اس مکمل کتاب کا نام بھی ہے جو اس وحی کے اجزا کا مکمل اور پورا مجموعہ سمجھی جاسکے جیسے توریت۔ انجیل۔ زبور۔ اسی طرح "قرآن" اور اسی معنی سے ارشاد ہوا ہے۔ لقد اٰتینٰک سبعا من المثانی والقراٰن العظیم۔"

"ہم نے آپ کو عطا کیں سات دورنگ والی آیتیں (سورہ حمد) اور قرآن عظیم"

دُوسرا تبصرہ

نزول قرآن کی حقیقت

اُور

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے معنی

"ہمارا کلام" ہمارے لب ودہن سے نکلتی ہوی آواز ہے جو مختلف مقاطع پر رُکتی ٹھہرتی، بڑھتی گھٹتی ہوی مختلف حروف کی تشکیل کرتی اور اُنسے مختلف الفاظ کی صورت گری کرتی ہے۔

اسکی سیال ہستی ہے وہ بے ثبات وجود رکھتا ہے اس کا ہر دوسرا جُز بغیر پہلے جُز کے فنا ہوے آنہیں سکتا۔ اُس کا ہر حاضر بات کہتے کہتے غائب اور ہر حال زبان ہلانے کے ساتھ ہی ماضی بن جاتا ہے۔

ہمارا وجود غیر مستقل ہے، ہماری ہستی خود نفس کے آمد وشد کی رہین احسان ہے اس لیے ہمارا کلام بھی یہ ہوسکتا ہے، ہم اعضاء وجوارح کے پابند ہیں، ہم جسم وجسمانیات سے بے نیاز نہیں ہیں اس لیے ہمارے زبان بھی ہے تالو بھی، حلق بھی ہے اور حنجرہ بھی۔ دہن کی فضا بھی ہے اور اس میں آواز بھی،

حادث ہیں تو محل حوادث بھی اس لیے ہمارا کلام وہی ہے کہ جو خود ہمارے دہن سے نکلے، ہماری زبان سے صادر ہو اور ہماری آواز کے ساتھ مخاطب کے گوش گذار ہو۔

"خدا کا کلام" بھی اگر اسی حیثیت سے سمجھا جائے تو اُس میں اور ہم میں فرق کیا رہا۔ غیر مستقل، وجود کے ساتھ فوراً ہی سپرد عدم ہو جانے والے الفاظ، آواز کے اُتار چڑھاؤ کی پیداوار ان کا مرکز۔ ذات احدیت ہو تو وہ خود قدیم تغیر سے بری۔ حوادث کے دسترس سے بلند وبرتر کب رہ جائیگا؟ وہ محل حوادث ہو تو اس کے حادث ہونے میں کسر کیا رہ گئی؟

اس لیے کسی باہوش انسان کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ خدا کے کلام کے معنی اُس کے دہن سے نکلے ہوئے الفاظ وکلمات کی حیثیت میں قرار دے۔

فرقۂ اشاعرہ[1] نے اس مشکل کا واحد حل "کلام نفسی" کے الفاظ میں تجویز کیا۔

"کلام نفسی" کیا ہے؟ علم کے علاوہ، ارادہ کے علاوہ، مشیت کے علاوہ تمام اُن صفات کے علاوہ جو خدا کی ذات کے لیے انسانی عقل میں آئیں اور الفاظ سے ادا کیے جاسکیں وہ مرتب معانی نہیں استغفر اللہ کلمات اور جملوں کا مجموعہ ہے

[1] سواد اعظم یعنی اہلسنت کی اکثریت۔

جو نفس میں پیدا ہوتا ہے اور الفاظ اپنے تدریجی وجود سے اُسی مجموعہ کے آئینہ بردار، ناقل اور حاکی ہوتے ہیں۔

وہ خدا کی ذات میں ازل سے ثابت ہے۔ قدیم ہے لہٰذا اس میں تجدد اور تدریج نہیں ہے۔ یہ انتہائی توضیح ہے۔
"کلام نفسی" کی لیکن اس سے سمجھ میں کیا آیا؟ کچھ نہیں۔

علم سے الگ۔ ارادہ سے الگ۔ مشیت سے الگ جو چیزیں عقل میں آنے کی ہیں اُن سب سے الگ۔ پھر یہ کیا؟
کلمات اور جملوں کا مجموعہ نفس میں! یعنی چہ؟

کیا اس کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ جس طرح انسان بات کرنے کے پہلے سوچے کہ مجھے کیا کہنا ہے، وہ دل ہی دل میں الفاظ تجویز کرے کہ میں یہ کہوں گا۔ یہ کہوں گا۔ بیشک یہاں ایک مجموعہ الفاظ و جمل کا دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو زبان و دہن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہی ہے "کلام نفسی"؟ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ کلمات و الفاظ کا یہ تصور بھی بالکل وہی تدریجی وجود کی کیفیت رکھتا ہے جو خود الفاظ کے دہن سے نکلنے میں ہوتی ہے۔

یعنی ایک لفظ کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا یہ الفاظ ایک مسلسل نظام کیساتھ پیدا ہوتے ہیں جن کو مستقل بقا اور ثبات نہیں ہے۔

پھر اس کو قدیم، ازلی، ثابت الذات اور برقرار کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

یہ بھی غور کے قابل ہے کہ "کلام نفسی" میں تمام اجزاء اور حصص ایک درجہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حاصل ہیں تو کلام لفظی میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر ترتیب و تنظیم کہاں سے پیدا ہو جاتی ہے جبکہ کلام لفظی ایک آئینہ ہے جو اُسی "کلام نفسی" کی حکایت کرتا اور اسی کا ناقل ہے۔

پھر وہ کلام نفسی ازل سے موجود۔ قدیم خدا کی ہستی کے ساتھ یعنی اُس کی ذات کا ایک جزو ہے اُسے حضرت موسیٰ کے ساتھ کوہ طور پر کیا تعلق پیدا ہوتا ہے جو ارشاد ہوا "کلم اللہ موسیٰ تکلیما" خدا نے موسیٰ سے بات کی پوری پوری طرح وہ پیغمبر آخر الزمان پر کس طرح نازل ہوا اور ارت کے ہاتھ میں کس طرح پہونچا جو یہ کلام اللہ "خدا کا کلام" کہلاتا ہے۔

ہم تو ذات الٰہی کو قدیم ہونے میں یکتا اور ازلی ہونے میں بھی لاشریک خیال کرتے ہیں۔ ہم اُس کی ذات کے لیے صفات قرار ہی نہیں دیتے جو اس کی ذات کے علاوہ قدامت کا درجہ رکھتے ہوں تو اس کلام قدیم کو ذات الٰہی میں قائم کیونکر تسلیم کریں۔ اس لیے ہم خدا کے متکلم ہونے کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کلام کا خالق ہے اور کلام بحیثیت مخلوق اُس کی طرف نسبت رکھتا ہے۔

وہ لوگ جو خداوند عالم کو بندوں کے تمام افعال کا ذمہ دار اور اُن کے ہر قول و عمل کا خالق مانتے ہیں، ان کو اس میں کوئی ندرت معلوم نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا ہر اُس گفتگو کا جو کسی انسان کی زبان سے صادر ہوتی ہے خالق ہے لہٰذا یہ سب ہی کلام اللہ قرار پاتا ہے لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ہم انسانوں کے ذاتی افعال کا ذمہ دار خود انسانوں کو سمجھتے ہیں اور بندوں کے افعال و اقوال کا موجد خود بندوں کو، ان کو خدا کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اعضاء و جوارح اور آلات و ذرائع جن سے یہ اعمال و اقوال صادر ہوتے ہیں، خدا کے مخلوق ہیں لیکن اُن افعال و اقوال کا خود

صدور، وہ ہرگز خداوند عالم کی ایجاد و خلقت کا نتیجہ نہیں۔

اس طرح یہ دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ خدا کا کلام وہی کلام سمجھا جائیگا جو انسانی ارادہ و اختیار، کارگذاری و صناعی سے خارج ہو اور جس کی خداوند عالم نے اپنی طرف نسبت بھی دی ہو۔ ایسے اشیاء جو ذاتی حیثیت سے قوت نطق سے محروم ہیں جیسے نباتات، جمادات، اکثر حیوانات ان میں جب آواز پیدا ہوگی تو وہ ضرور بالضرور خداوند عالم کے ارادۂ خاص کا نتیجہ ہوگی، اب اگر خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا ہے بلکہ اُس آواز کی نوعیت ایسی ہی ہے کہ گویا وہ خود اس شے ہی کا کلام ہے، جیسے سنگریزوں کا دست رسالتمآبؐ میں تسبیح پڑھنا (جیسا کہ بعض روایات میں ہے) بچہ کا پاکدامنی یوسف کی گواہی دینا (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے) حضرت داؤد کے ساتھ دیوار و در، صحرا و فضا کا مشغول حمد و تسبیح ہو جانا تو اُسے کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا بلکہ اُسے یوں کہنا پڑے گا کہ سنگریزوں نے قدرت خدا سے تسبیح کی۔ بچہ نے قدرت خدا سے گواہی دی۔ دیوار و در نے قدرت خدا سے حمد و تسبیح ادا کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اُس شے میں طبعی طور سے سہی قوت گویائی عطا کر دی جس کے بعد جو کلام ہو وہ پھر اُسی شے کا خود کلام ہے، خدا کا کلام نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس کلام کو اپنی طرف منسوب بھی کیا ہو یعنی حضرت حق سبحانہٗ تعالےٰ نے اس شے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات کہنا تھی اسے بطور آواز اس شئے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات کہنا تھی اُسے بطور آواز اس شے میں خلق کر دیا ہو جیسے درخت کی آواز موسیٰ کو انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ بے جان چیز کی آواز۔ ہو نہ ہو خدا کی قدرت سے پھر طرز کلام، لب و لہجہ عنوان تخاطب سے ظاہر کہ آواز درخت کی سہی مگر کلام کسی کسی اور کی طرف سے ہے نہیں تو درخت خود خدا ٹھہرتا۔ موسیٰ کا پروردگار درخت بن جاتا لیکن حضرت موسیٰ سر خم رکھتے تھے درخت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے سمجھے کہ درخت مجازی پردہ ہے جس میں متکلم حقیقت اپنی خلق کی ہوئی آواز کے ساتھ مصروف کلام ہے۔ یہ خدا کا پہلا کلام تھا جس کے بعد موسیٰ کلیم اللہ قرار پائے اس کے بعد بھی جب گفتگو ہوئی ایسے ہی پردہ میں چنانچہ طور پر کی گفتگو میں زیادہ تر ابر کی صورت میں ہیں جیسا کہ توریت میں تذکرہ ہے۔

وہ لوگ جو خدا کو کلام نفسی کی بنا پر متکلم قرار دیتے ہیں انھیں بھی اس کے اعتراف سے گریز نہیں اس لیے کہ خدا کا قدیم ازلی کلام نفسی حدود میں اپنے اس قابل نہیں ہے کہ وہ موسیٰ کے گوش زد ہو نہ وہ اپنے ازلی و قدیم وجود سے موسیٰ کے کلیم اللہ بننے کا باعث تھا۔ موسیٰ کلیم خدا جو ہوئے تو وہ اسی کلام سے جو درخت یا ابر کی صورت میں ان کے گوش زد ہوا۔ اب اگر یہ خدا کا کلام نہ تھا تو موسیٰ اس کی بنا پر کلیم اللہ کیونکر ہو گئے اور اگر یہ خدا کا کلام تھا تو کس طرح جبکہ وہ الفاظ و کلمات کا مجموعہ اور گوش زد ہونے والی آواز ہے جس کے لیے نہ بقا ہے نہ ثبات۔ وہ حادث ہے اور اگر حادث نہ ہو تو ذات الٰہی کے لیے خود اُسکے ثابت ہونے میں کیا مضائقہ تھا جو کلام نفسی ماننے کی ضرورت ہوئی۔

جب حادث ہے تو اُس کا خالق کون؟ ظاہر ہے کہ خدا، خدا کے سوا کون خالق ہو سکتا ہے؟ تو اس کلام کا تعلق خدا کے ساتھ کیا ہوا؟ یہی نا کہ وہ مخلوق خدا ہے۔ پھر اگر مخلوق خدا کلام کی جہت سے موسیٰ کا کلیم اللہ بن جانا صحیح ہے تو اسی کے اعتبار سے خداوند عالم کا متکلم کہا جانا بھی صحیح ہو جاتا ہے کلام نفسی ماننے کا کیا سبب ہے؟

یہ وہ صورت تھی کہ جہاں کلام کا مظہر بے شعور و ارادہ ناقابل تکلم شے یعنی جماد، نبات یا حیوان کی کوئی قسم تھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کلام کسی ذی شعور با ارادہ و اختیار قابل نطق و تکلم انسان کی زبان پر آئے اور ہمارے گوش زد ہو مگر کلام ایسا ہو کہ جو اُس انسان کے ذاتی حدود ارادہ و اختیار کے باہر اور ناقابل صدور ہو اور پھر اُسکے تصریحات، نصوص وغیرہ سے اُس کا انتساب خدا کی طرف ظاہر ہوتا ہو۔ وہ خود بھی بتلا دے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس کلام کے خصوصیات و امتیازات بھی اُسے عام انسانی سطح سے بلند ثابت کر رہے ہوں۔

یہ کلام بھی خداوند عالم کا کلام قرار پائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اُس نے جس طرح کسی وقت میں درخت کو اپنا ترجمان، اپنے کلام کا محل مرکز قرار دیا اس طرح اب اس انسان کو اپنے کلام کا حامل، مبلغ اور ترجمان قرار دیا ہے۔

اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ براہ راست اپنے رسولؐ کی زبان پر وہ اُس کلام کو خلق فرمائے لیکن اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کچھ عرصہ تک رسولؐ کی زبان اور اُن کے دل و دماغ سے ذاتی ارادہ و اختیار کو سلب کر کے انہیں مسخر بنا لیا جائے اور قہری و غیر اختیاری طور پر کچھ اقوال کے ساتھ متکلم بنایا جائے۔

اس لیے کہ اگر ارادہ و اختیار باقی رہا اور اُس کی شرکت سے کلام ظہور میں آیا تو وہ انسان کا اختیاری کلام ہوگا خدا کی طرف منسوب ہونے کی صلاحیت نہ رکھے گا۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر ذی رُوح ہستی دیوار در پتھر وغیرہ میں خلق کر کے رسول کے گوش گذار ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام قدرت کی طرف سے عالم اعلیٰ کے کسی محل میں خلق ہو اور پھر ملک مقرب یعنی آسمانی فرشتہ کے ذریعہ سے رسالتمآبؐ تک پہونچایا جائے۔

پہلی صورت ایک کامل انسان اور مصلح خلق کے لیے کسی طرح لائق نہیں ہے اس لیے کہ رسولؐ کی تبلیغ اور تعلیم کلام الٰہی اس صورت میں اختیاری نہیں بالکل اجباری ہو جاتی ہے اور ایک صاحب شعور و اختیار شخص کا ایک وقت میں اپنی زبان پر بالکل بے قابو ہو جانا کمال انسانی کے خلاف بھی ہے، اس کے علاوہ حکمت الٰہی کے اقتضا سے رسول کی تبلیغ و تعلیم مصلحت وقت کے لحاظ سے مناسب موقع و محل ہونا ضروری تھی اس لیے کلام الٰہی کے اجرار کے لیے ایسی صورت ہونا چاہیے تھی کہ اُس کا پہونچنا رسول تک تو ہر وقت و ہر موقع پر ہو سکتا ہو۔ لیکن حضرت کی زبان پر اُس کا اجرا موقع و محل کی مناسبت سے ہو۔ یہ بات پہلی صورت میں نہیں ہے۔ دُوسری صورت وہ ہے جو حضرت موسیٰ کے لیے حاصل تھی لیکن اُمّت بنی اسرائیل کے ضروریات محدود تھے۔ موسیٰ نے ایک خاص محل تخلیہ کا (طور کی چوٹی) اور خاص اوقات مقرر کر لیے تھے۔ وہ وہاں جاتے۔ ابر آتا اور اُن سے ہم کلام ہوتا۔ وہ آکر جن جن باتوں کے تبلیغ کی ضرورت ہوتی اپنی امت کو تعلیم دیتے۔

یہ صورت ہمارے رسُولؐ کے لیے کافی نہیں تھی۔ ان کو جامع و مکمل قانون، باقتضائے وقت و محل احکام بتانا تھے۔ آپ کے پاس طرح طرح کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا۔ خلوت جلوت سفر حضر منزل۔ راہ مختلف مقامات پر کلام الٰہی کے پہونچنے کی ضرورت تھی۔ کوئی جسمانی چیز دیوار در، درخت، پتھر، ہوا ابر میں آواز پیدا ہونا جو ہر شخص کے گوش گذار ہونے کے قابل ہو حکمت الٰہی کے خلاف تھا۔

اس لیے ہمارے رسُولؐ پر کلام الٰہی کے القاء کے لیے تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔

الفاظ کی خلقت ملاء اعلیٰ میں جہان کی کائنات کی نوعیت سے ہم کما حقہٗ واقف نہیں ہو سکتے اس لیے کہ اُن کی مثال ہماری نظر کے سامنے نہیں آئی۔ ہندوستان کے باہر دوسرے ملک کے آدمی سے جس نے آم آنکھ سے نہ دیکھا ہو نہ اُس کا مزہ چکھا ہو آم کا وصف بیان کیجئے، وہ سوائے حیران و ششدر رہنے کے یا ظاہری الفاظ کے دلنشیں کر لینے کے کبھی اُس حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا جو ہمیں ظاہر کرنا منظور ہے۔

بس یہی صورت عالم علوی کے موجودہ کائنات کی ہماری نسبت ہے کہ ہمیں الفاظ سے کتنا ہی سمجھایا جائے ہم کبھی اُس حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے جو وہاں کے اشیاء میں مضمر ہے۔

قرآن کی خلقت کہاں ہوئی لوح محفوظ میں؟ لوح محفوظ کے کیا معنی؟ یہ مجھ سے سمجھنے کی بات نہیں ہے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ اس مادّی عالم کے اشیاء سے مختلف ہے وہ لکڑی۔ تانبے۔ لوہے۔ پیتل سونے چاندی کی کوئی تختی نہیں ہے جس پر ظاہری نقوش سے عبارتیں درج کی گئی ہوں۔ دواتیں رکھی ہوں قلم ڈبوئے جا رہے ہوں۔ لکیریں بن رہی ہوں بلکہ وہ معنوی چیز ہے۔ روحانی چیز ہے

عالم ملکوت کے قابل، آسمانی فرشتوں کے پڑھنے کے ...... لائق تختی اُس میں عجیب جامعیت اور وسعت ہے کہ احکام قضا و قدر اُس میں ہیں اور احکام وجوب و حرمت یعنی تکالیف شرعیہ بھی اُسی میں ہیں۔

وہی قرآن کا بھی مرکز اوّل ہے۔ پھر موقع و محل کے اقتضاء سے جیسی ضرورت پیش آئی اور جیسا موقع درپیش ہوا ملک مقرب یعنی جبرئیل امین کے زبان و دل پر جیسی آیت کا القا ہوا وہ مامور ہوئے کہ اُس آیت یا آیتوں یا پورے سورے کو آکے رسالتمآبؐ تک پہونچا دیں، آئے، روحانی ملک۔ روحانی بات چیت۔ دل کے ساتھ تعلق۔ نہ کسی نے آتے دیکھا، نہ بات کرتے سنا مگر خدا کا کلام رسول تک پہونچ گیا۔

اسی کا نام "وحی ہے" اسی کا نام "نزول قرآن" (قرآن کا اترنا) ہے۔ اسی کی بنا پر یہ قرآن کلام الٰہی ہے اور مخلوق کے کلام سے جداگانہ ہے۔

وہ خدا کی طرف نسبت رکھتا ہوا خاص اُس کا مخلوق کلام ہے اس لیے کلام اللہ ہے۔ (ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق) اور اُس کا اپنے حکم کے ذریعہ ملاءُ اعلیٰ سے آتارا ہوا ہے۔ اس لیے منزل من اللہ ہے (انا نحن نزلنا الذکر) اور جبرئیل امین کے ذریعہ سے نازل شدہ ہے اس لیے ارشاد ہوتا ہے (نزل بہ الروح الامین علی قلبک) اور رسول کے گوش گذار ہونے میں وہ جبرئیل کی زبان کا ہے اس لیے مجازاً جبرئیل کا قول ہے (انہ لقول رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین)۔

ضمیمہ کلام

خلق قرآن کا معرکۂ کارزار

حضرت باری تعالیٰ کے متکلم ہونے کے معنی میں جو اختلاف تھا اُس سے قدرۃً یہ نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا کہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے مفہوم میں بھی اختلاف ہو جائے جس کو ضروری توضیح کے ساتھ ہم نے پیش کیا۔

لیکن جانبین کے نقطۂ نظر کی بنا پر کم از کم یہ بات متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہونا چاہیئے تھی کہ یہ الفاظ و کلمات جو مجتمعہ حیثیت سے بحالت موجودہ "قرآن" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جو کاغذ پر لکھے جاتے، سینہ میں محفوظ کیے جاتے، زبان سے صادر ہوتے ہیں حادث ہیں قدیم نہیں ہیں اس لیے کہ اگر یہی قدیم ہوتے تو اکثریت کو مسلمانوں کی خدا کے متکلم ثابت کرنے کی غرض سے کلام نفسی کے ایجاد کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

یہ الفاظ حادث ہیں اور خدا محل حوادث نہیں، اسی لیے تو کلام نفسی کے تخیل کی ضرورت ہوئی اور جب یہ الفاظ حادث ہیں تو ہر حادث کے لیے موجد اور خالق کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مخلوق بھی ضرور ہوں گے۔

یہ کوئی پیچ دار مسئلہ نہیں تھا جس میں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا کی جاتیں لیکن افسوس ہے کہ بحث و نظر کے سدّ باب اور قوائے عقلی کے انسداد نے جو قرآن اور تعلیمات نبوی کے بالکل برخلاف نہ معلوم کس ذہنیت کے ماتحت رسالتمآبؐ کے بعد ضروری سمجھا گیا تھا اکثر مسلمانوں کے فکر و نظر کی قوتوں کو اس درجہ معطل اور بیکار کر دیا تھا کہ وہ معنی اور مفہوم پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے الفاظ اور تعبیرات کے غلام بن گئے تھے۔

وہ قرآن کو مخلوق کہنا اُس کی توہین سمجھتے تھے اور بہت بڑا جرم خیال کرتے تھے۔ یہ سادگی کا طلسم مسلمہ عقیدہ کی صورت میں خاموش اطمینان کے ساتھ رہتا اگر دُوسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں مامون الرشید خلیفۃ المسلمین عباسی کا ذوق تحقیق اس کے خلاف معروف جہاد نہ ہوتا۔

یہ خلیفہ (بدقسمتی سے) اپنے پیشرو دوسرے اموی و عباسی خلفاء کے برخلاف لہو و لعب اور صرف عیش و عشرت میں معروف ہونے کے بجائے ایک حد تک علمی تحقیقات اور وسعت علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔

اُس نے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل بڑی تکمیل کے ساتھ کی اور فلسفۂ و حکمت میں کافی وقت صرف کیا تھا (تاریخ الخلفاء سیوطی ص۳۱۰)۔

اس کی آنکھوں میں ایسی باتیں کھٹکتی تھیں جن کی بنیاد صرف عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے پر قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ

قرآن کریم کے زیر بحث مسئلہ پر اُس نے سنجیدگی سے غور کیا اور الفاظ قرآن کے قدیم و غیر مخلوق ہونے کو ایک لایعنی، خلاف عقل بات قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے اُس کا قدیم کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

طبری نے اس کا ابتدائی آغاز ۲۱۲ھ میں بتایا ہے اور لکھا ہے فیہا اظہر المامون القول بخلق القرآن" اس سال مامون نے قرآن کے مخلوق ہونے کے قول کا اظہار کیا"

سطحی نظر رکھنے والے ارباب ظاہر اور محدثین یقیناً اس سے متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اُنھوں نے اختلاف کیا اور سخت اختلاف جس سے شورش پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا اور اس وجہ سے مامون کو چند سال تک کے لیے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کرنا پڑا۔ جہاں تک اصل بحث کا تعلق ہے اس مسئلہ کو صرف علمی و تحقیقی حیثیت میں محدود رہنا چاہیے تھا یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کو کفر و اسلام کا معیار قرار دے لیا جائے۔ لیکن کیا کیا جائے عام افراد انسانی کی تشدد آمیز ذہنیت کو، وہ محدثین کو جو کفر و اسلام کے دائروں کی حدبندی میں اعتدال سے کوسوں دُور ہیں اُنھوں نے اس بحث کو اسلام اور کفر کا سوال بنا لیا۔

علامہ شبلی نعمانی جو ہمارے قریبی دور کے ایک کامیاب مصنف گذرے ہیں انھوں نے اپنی کتاب "علم الکلام" کے حصہ اول میں اس تشدد آمیز ذہنیت پر کافی افسوس کیا ہے ہم اس اختلاف اور محدثین کے تشدد آمیز اقوال کے نمونے انھی کے الفاظ میں پیش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

"مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کے صفات قدیمہ میں ہے وہ قدیم ہے[1] لیکن جو الفاظ آنحضرت صلعم پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے' محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔ زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن دونوں فرقہ نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دیا۔

امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، ہم اُس کی سند سے اس موقع پر چند بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

وکیع بن الجراح	من زعم ان القرآن محدث فقد کفر	جس شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے
یزید بن ھٰرون	من زعم ان کلام اللّٰہ مخلوق فھو والذی لا الٰہ الا ھو عندی زندیق	جو شخص کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے وہ خدا کی قسم زندیق ہے۔
مزنی شاگرد شافعی	من قال ان القران مخلوق فھو کافر	جو شخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

[1] معتزلہ کے قول کی جو ترجمانی کی جا رہی ہے وہ پورے طور سے صحیح ہونا بہت مشکل ہے۔ خود اس کے قبل صفحہ ۱۵ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ خدا کے صفات کو اگر قدیم مانیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے اور حادث کہیں تو خدا کا محل حوادث ہونا خدا کے حدوث کا مستلزم ہے' پہلی مشکل سے بچنے کی معتزلہ نے یہ رائے اختیار کی کہ خدا کے علیحدہ صفات نہیں ہیں بلکہ اسی کی ذات ہی سے وہ تمام نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ہم کو صفات سے ہوتے ہیں" پھر جب معتزلہ کے نزدیک خدا کے لیے ذات سے علاوہ صفات ہیں ہی نہیں تو انکی طرف یہ نسبت کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیم میں ہے وہ قدیم ہے کہاں صحیح ہو سکتی ہے؟

امام بخاری	نظرت فی کلام الیھود و النصاریٰ والمجوس فما رأیت قوما اضل فی کفرھم من الجھمیّۃ وانی لا ستجھل من لا یکفّرھم -	میں نے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں سب کے کلام دیکھے ہیں۔ جہمیہ کے برابر کوئی اُن میں سے کافر جاہل نہیں - میں اُسکو جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔ (جہمیہ کا اصلی جرم یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کو حادث کہتے تھے)
عبدالرحمن بن مہدی	لورأیت رجلا علی الجسر و بیدی سیف یقول القرآن مخلوق ضربت عنقہ -	اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن ماردوں -

بعض محدثوں نے جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے یہ مخلوق ہے اور حادث ہے لیکن محدثین نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ ذہلی امام بخاری کے استاد تھے اور صحیح بخاری میں بہت سی حدیثیں ان کی روایت سے مذکور ہیں۔ انہوں نے امام بخاری کا جب یہ قول سنا تو عام حکم دیدیا کہ جو شخص یہ لفظ کہے کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔ چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن شداد نے ایک تحریر میں لکھا تھا کہ "لفظی بالقرآن مخلوق" یہ تحریر امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے اس فقرہ کو کاٹ دیا اور کہا کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے۔ ابوطالب نے کہا تھا کہ امام احمد بن حنبل قرآن کے تلفظ کو مخلوق کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل کو خبر ہوئی تو غصہ سے کانپنے لگے اور ابوطالب کو بلا کر اس بات کی بازپرس کی" - (علم الکلام حصہ اول مطبوعہ انوار المطابع ص۱۷)

غالبًا اسی متشددانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید کو اس مسئلہ میں کد ہوگئی -

ایک تو بادشاہوں کا دماغی توازن ہر بات میں اعتدال کے حدود پر قائم نہیں رہتا۔ وہ جس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اُس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور انہماک اُن کا افراط کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے -

دوسرے عمومًا افراد انسانی کی ذہنیت کہ جس بات میں اُن کی زیادہ مخالفت ہو اُس میں اُن کو زیادہ کاوش اور ردّ عمل کی کوشش پیدا ہوتی ہے -

اس کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید نے عارضی طور سے چند سال کے لیے سکوت اختیار کر کے ایک مرتبہ اپنے عقیدۂ خلق قرآن کی حمایت میں جہاد کی ٹھان لی اور اسحق بن ابراہیم خزاعی کو جو بغداد میں گورنر کی حیثیت سے تھا ایک مبسوط خط کے ذریعہ سے حکم دیا کہ وہ تمام علمائے وقت کو جمع کر کے خلق قرآن کے مسئلہ میں ان کے خیالات دریافت کرے اور جو لوگ اس کے منکر ہوں انھیں سخت سے سخت سزا کا حکم دیا جائے -

طبری نے سنہ ۲۱۸ھ کے واقعات میں اس تاریخی یادگار خط کو نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے [1]

---

[1] طبری ج ۱۰ ص ۲۸۴، ۲۸۵)

اما بعد فان حق اللّٰہ علی ائمۃ المسلمین و خلفائھم الاجتھاد فی اقامۃ دین اللّٰہ الذی استحفظھم و مواریث النبوّۃ التی اورثھم و اثر العلم الذی استودعھم والعمل بالحق فی رعیتھم والتشمیر لطاعۃ اللّٰہ فیھم و اللّٰہ یسأل امیر المؤمنین ان یوفقہ لعزیمۃ الرّشد وصریمتہ والاقساط فیما ولاہ اللّٰہ من رعیتہ برحمتہ ومنّتہ وقد عرف امیر المؤمنین ان الجمھور الاعظم والسّواد الاکبر من حشو الرّعیۃ و سفلۃ العامۃ ممن لا نظر لہ ولا رویۃ ولا استدلال لہ بدلالۃ اللّٰہ وھدایتہ ولا استضآء بنور العلم و برھانہ فی جمیع الاقطار والاٰفاق اھل جھالۃ باللّٰہ وعمی عنہ وضلالۃ عن حقیقۃ دینہ وتوحیدہ والایمان بہ ونکوب عن واضحات اعلامہ و واجب سبیلہ وقصور ان یقدروا اللّٰہ حقّ قدرہ و یعرفوہ کنہ معرفتہ ویفرقوا بینہ وبین خلقہ لضعف اٰرائھم ونقص عقولھم و جفائھم عن التفکر والتذکر وذلک انّھم ساووا بین اللّٰہ تبارک وتعالےٰ وبین ما انزل من القرآن فاطبقوا مجتمعین واتفقوا غیر متعاجمین علی انہ قدیم اوّل لم یخلقہ اللّٰہ

پیشوایان اسلام اور خلفائے مسلمین پر خدا کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دین خدا کے لیے جس کی حفاظت کے وہ ذمہ دار بنائے گئے ہیں اور نبوت کے متروکات کے لیے جس کے وہ وارث قرار دیے گئے ہیں اور علم کے آثار کے لیے جو اُن کے پاس امانت رکھا گیا ہے اپنی تمام جدوجہد صرف کر دیں اور اپنی رعایا کے درمیان حق پر عمل کریں اور طاعت الٰہی کے لیے کمربستہ رہیں اور ہم جناب خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے رحم و کرم سے مجھ کو صحیح راستے پر قائم رہنے اور اس کو اپنے دل میں ٹھان لینے اور اپنی رعیت کے درمیان خدا کے عطا کردہ منصب یعنی فرماں روائی میں عدالت کرنے کی توفیق عطا فرمائے -

اینجانب کو معلوم ہوا ہے کہ سواد اعظم اور جمہور افراد عوام اور پست طبقہ کی رعیت میں سے جنکو قوت نظر اور طاقت استدلال نہیں ہے اور نور علم سے بہرہ مند نہیں ہوئے ہیں تمام اطراف و حدود سلطنت میں بالکل خدا کے مرتبہ سے ناواقف اور دین خدا کی حقیقت اور اسکی توحید اور ایمان سے کورچشمی و گمراہی میں مبتلا اور اُس کے روشن نشانوں اور واجبی راستے سے منحرف اور اس بات سے قاصر ہیں کہ وہ خدا کو اُس کی شان کے مطابق اوصاف کے ساتھ خیال کریں اور اُسکی حقیقت معرفت کو حاصل کریں اور اُس میں اور اُس کے مخلوق میں فرق سمجھ سکیں اس لیے کہ اُن کے افکار کمزور اور اُن کی عقلیں ناقص اور وہ غور و فکر اور یادداشت میں سُستی و کمزوری کرنیوالے ہیں اس کی تفصیل

ویحدثه و یخترعه و قد قال الله عزوجل فی محکم کتابه الّذی جعله لما فی الصّدور شفآء وللمومنین رحمة وهدی انّا جعلناه قراٰنًا عربیًّا فکل ما جعله الله فقد خلقه وقال الحمد لله الذی خلق السّمٰوٰت والارض وجعل الظلمات والنور وقالَ عزوجل کذلك نقص علیك من انبآء مَا قد سبق فاخبر انه قصص لامور احدثه بعدها وتلا به متقدمها وقال الٓرٰ کتاب احکمت اٰیاته ثم فصّلت من لدن حکیم خبیر وکلّ محکم مفصل فله محکم مفصّل والله محکم کتابه ومفصّله فهو خالقه ومبتدعه ثم هم الذین جادلوا بالباطل فدعوا الی قولهم ونسبوا انفسهم الی السّنّة وفی کل فصل من کتاب الله قصص من تلاوته مبطل قولهم ومکذب دعواهم یردّ علیهم قولهم ونحلتهم ثم اظهروا مع ذلك انهم اهل الحق والدّین والجماعة وان من سواهم اهل الباطل والکفر والفرقة فاستطالوا بذلك علی الناس وغروا به الجهلة حتی مال قوم من اهل السّمت الکاذب والتخشع لغیر الله والتقشف لغیر

یہ ہے کہ انھوں نے مساوات قرار دیدی خدا اور اُس کے نازل کردہ قرآن میں اور وہ سب کے سب متفق ہو گئے اس بات پر کہ یہ قدیم اور ازلی ہے اور خدا کا مخلوق اور اس کا حادث کردہ اور پیدا کیا ہوا نہیں ہے حالانکہ خداوند عالم اپنی کتاب محکم میں ارشاد فرماتا ہے "ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن" ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے بنائی ہو وہ اُسکی پیدا کی ہوی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا "حمد ہے اُس خدا کے لیے جس نے خلق کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکی و روشنی کو" اس کے علاوہ ارشاد ہوا "اس طرح ہم تم سے واقعات بیان کرتے ہیں اُس دور کے جو پہلے گذر گیا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد یہ کلام عالم وجود میں آیا ہے۔ نیز ارشاد کیا "یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں اور پھر حکیم خبیر خدا کی طرف سے اس کی تفصیل کی گئی" جو شے محکم شدہ اور تفصیل کی ہوی ہو اس کے لیے کوئی محکم کرنے والا اور تفصیل دینے والا ہوگا۔ وہی اس کا خالق اور موجد قرار پائے گا۔ اس کے بعد انہی لوگوں نے غلط بات پر بحث شروع کر دی اور اپنے قول کی تبلیغ بھی کرنے لگے اور اپنے کو سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ قرآن مجید کے ہر حصہ میں ایسے بیانات ہیں جو اُن کے قول کو باطل کرنے والے اور ان کے دعوے کی تکذیب کرنے والے ہیں اس کے باوجود یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اہل حق اہل مذہب اور اہل جماعت ہیں اور ان کے سوا جتنے ہیں سب اہل باطل اور کافر و تفرقہ پرداز ہیں اِس طرح

الذین الی موافقتهم علیه ومواطاتهم علی سیّئ اٰرائهم تزینا بذلك عندهم وتصنعا للرّیاسه والعدالة فیهم فتركوا الحق الیٰ باطلهم وَ اتخذوا دین الله ولیجة الیٰ ضلالتهم ــــــ

فاجمع من بحضرتك من القضاة واقرأ علیهم کتاب امیر المؤمنین هذا الیك فابدأ بامتحانهم فیما یقولون وتکشیفهم عما یعتقدون فی خلق الله القراٰن واحداثه واعلمهم ان امیر المؤمنین غیر مستعین فی عمله ولا واثق فیما قلده الله واستحفظ من امور رعیته ممن لا یوثق بدینه وخلوص توحیده ویقینه فاذا اقرّوا بذلك ووافقوا امیر المؤمنین فیه وکانوا علی سبیل الهدی والنجاة فمرهم بنص من یحضرهم من الشهود علی الناس ومسألتهم عن علمهم فی القراٰن وترك اثبات شهادة من لم یقر انه مخلوق محدث ولم یره والامتناع من توقیعها عنده واکتب الیٰ امیر المومنین بما یأتیك عن قضاة اهل عملك فی مسألتهم والامر لهم بمثل ذلك ثم اشرف علیهم وتفقد اٰثارهم حتی لا تنفذ احکام الله الّا بشهادة اهل البصائر فی الدین والاخلاص للتوحید واکتب

لوگوں میں انھوں نے اپنا اثر قائم کیا اور جاہلوں کے جوش کو برانگیختہ کیا یہاں تک کہ کچھ خود غرض گندم نما جو فروش، ریاکاری و ظاہرداری کے ساتھ اظہار زہد و تقویٰ کرنے والے افراد بھی اُن کے دلوں میں رسوخ قائم کرنے اور اپنی خیرخواہی جتانے کے لیے اُن کے ہمخیال ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے باطل کی غرض سے حق سے کنارہ کشی کی اور خدا کو چھوڑ کر اپنی گمراہی کے راستہ میں داخل ہوئے ہیں

تم کو چاہیے (یہ گورنر کو حکم ہو رہا ہے) کہ جتنے قاضی تمھارے یہاں ہوں سب کو جمع کرو اور اُن کے سامنے خلیفۃ المسلمین (اینجاب) کے خط کو پڑھ کر سناؤ اور اُن کے اقوال کی آزمائش کرو اور خلق و حدوث قرآن کے متعلق اُن کے خیالات کو دریافت کرو اور اُن پر یہ واضح کردو کہ خلیفۃ المسلمینؐ اپنی حکومت میں کسی شخص سے امداد حاصل کرنا اور سلطنت کے کسی منصب کو کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا پسند نہیں کرتا جس کے مذہب اور خالص توحید پر اُس کو بھروسا نہ ہو جب وہ اس کا اقرار کریں اور خلیفہ کی رائے سے متفق اور ہدایت و نجات کے راستے کے سالک ہوں تو اُنھیں حکم دو کہ وہ اس مسئلہ کو ان تمام شواہد و دلائل کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اُن سے اُن کے علم کے متعلق دریافت کریں جو شخص اس بات کا اقرار نہ کرے کہ قرآن مخلوق ہے اُس کی گواہی قبول نہ کی جائے اس کے بعد اینجاب کے پاس اطلاع بھیجنا چاہیے کہ تمھاری طرف کے قاضیوں نے کیا طرز عمل اختیار کیا پھر تم خود ان کے طرز عمل کے

الیٰ امیر المؤمنین بمایکون فی ذلک انشاء اللہ وکتب فی شہر ربیع الاوّل سنہ ۲۱۸ ۔

نگران رہو یہاں تک کہ خداوندی احکام بغیر صاحبان بصیرت اور اہل توحید خالص کی گواہی کے قبول نہ ہوں اور برابر ان حالات کی تفصیلی اطلاع خلیفۂ مسلمین کو دیتے رہو انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ماہ ربیع الاول ۲۱۸ھ

یہ مکتوب غیر معمولی درجہ تک طویل ہونے کے باوجود ہم نے قریب قریب پورا اس لیے نقل کر دیا کہ وہ بادشاہانہ تحکم کے ساتھ عالمانہ طرز استدلال اور قوت بیان کا بھی حامل ہے ۔ اُس میں خلق قرآن کے ناقابل استرداد دلائل ذکر کیے گئے ہیں جو کسی طرح غلط نہیں ہیں بے شک اس علمی انداز استدلال کے ساتھ ملوکانہ ذہنیت نے تشدد آمیز احکام جاری کرا دیے ہیں جو وقتی جذبہ و جوش مخالفت کا نتیجہ ہیں اور اُن کا سبب جیسا کہ ہم نے لکھا زیادہ تر فقہاء اہل مذہب کا تشدد آمیز کافر ساز رویہ تھا ۔

کوئی جاہل بادشاہ ہوتا تو وہ اس فتوائے کفر کے حربہ ہی سے شاید سپر انداختہ ہو کر خاموش ہو جاتا مگر مامون الرشید فقط بادشاہ نہیں ، وہ تھا جس کے متعلق حافظ سیوطی لکھتے ہیں کان یُعدّ من کبار العُلماء وہ اس فتویٰ کفر کے جواب میں خاموشی گوارا نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ قوت استدلال کے ساتھ اپنے حریفوں کو کافر ثابت کرنے کا در پے ہوا اور ملوکانہ اقتدار کے ساتھ اُن کو کافر کی پاداش دینے پر بھی تیار ہو گیا ۔

یہ تاریخ کی بڑی دلچسپ حقیقت ہے ، کہ اسکے بعد سوا امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح عجلی کے جتنے فقہا و محدثین تھے سب نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کیا اور اُسے تقیہ کے پردہ میں ظاہر کر کے اپنی جان بچائی جس تقیہ کو آج ہمارے برادران اسلامی شیعوں کے ناقابل معافی جرائم کی فہرست میں درج کرتے ہیں حافظ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں صاف لکھا ہے انھم توقفوا ثم اجابوا تقیۃ " ان لوگوں نے پہلے توقف کیا پھر تقیہ سے کام لے کر موافقت کا اظہار کیا" ان تقیہ کرنے والوں میں یحییٰ بن معین ، ایسے حفاظ وائمۂ فن حدیث تھے یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ اجبنا خوفا من السیف " ہم نے تلوار کے ڈر سے موافقت کی" ان لوگوں کی ان باتوں کی خبر بھی مامون کو پہنچ گئی تھی اور اُس نے حکم دیا کہ ان سب کو پابہ زنجیر کر کے روانہ کیا جائے ۔ لیکن اس کے بعد مامون کی مدت حیات ختم ہو گئی اور اس طرح یہ ہنگامہ بھی ختم ہوا ۔

تیسرا تبصرہ

نزول قرآن کی تاریخ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تدریجی حیثیت سے موقع و محل کے اقتضا سے

نازل ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے اُس میں ماضی مستقبل اور حال کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہو چکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالت کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے ۔ وہ روز وقوع واقعہ آنے والی آیت میں (الیوم) یعنی "آج" کی لفظ اور آیندہ کے تذکرہ میں سین اور سوف کے ساتھ قریب اور بعید کے حدود قائم کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی تاریخ مقرر کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ بیس برس کے عرصہ میں جستہ جستہ اترا ہے ۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُس میں نزول قرآن کی تاریخ کا تذکرہ ملتا ہے ایک طرف ارشاد ہے کہ شہر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن " رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا" ۔ اس میں قرآن کے اتارے جانے کو گیارہ مہینوں کی میعاد سے ہٹا کر ایک مہینہ میں محدود کیا گیا ہے دوسری آیت میں ارشاد ہوا اِنّا انزلناہ فی لیلۃ مُبارکۃ ہم نے اس کو ایک مبارک شب میں نازل کیا ۔ اس سے مبہم طور سے پتہ چلا کہ اس کا نزول کسی خاص رات میں ہوا ہے اور وہ ماہ رمضان کی کوئی رات ہے اس لیے کہ پہلی آیت کے خلاف نہ ہو ۔ تیسری آیت انّا انزلناہ فی لیلۃ القدر اس میں انضباط تاریخ مکمل طریقہ سے کیا گیا " ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا" اس طرح تاریخ معین طریقہ سے معلوم ہو گئی یعنی شب قدر ۔

اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلام نفسی کے ازل سے ذات الٰہی میں ثابت سمجھتے ہیں اُن کے لیے ، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو کاشف اور حاکی ہیں کلام حق کے وہ تو کسی ایک وقت پر نازل ہوئے نہیں ۔ بتدریج اُترے پھر اُن کی یہ تاریخ ہے نہیں ۔ قدیم چیز قدیم ہے اس کی کوئی ابتدا نہیں ۔ پھر اس کے لیے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟ لیکن میں کہ جو قرآن کو حضرت احدیت کا مخلوق جانتا اور اسی حیثیت سے اس کو کلام الٰہی سمجھتا ہوں ان آیات کی تاریخ کو اسی انشاء و خلق قرآن سے متعلق سمجھتا ہوں جو عالم ملأ اعلیٰ میں صورت پذیر ہوا جس کی نوعیت کے علم میں اسپر اندازگی کا اعتراف اس تبصرہ میں ہو چکا ہے ۔

یہ انشاء اوّل ہے کہ جو ماہ رمضان کی مبارک رات ، شب قدر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی مطابقت سے تدریجی طور پر قرآن مجید رسول پر نازل ہوا ہے ۔

چوتھا تبصرہ

اِعجازِ قرآن

معجزہ کے معنی

معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو جس کے مقابل لانے سے اسکی مخاطب دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوں ۔

بعض لوگ اسے "مادی" حیثیت میں محدود سمجھ لیے ہیں۔ ماہتاب کا شق ہونا آفتاب کا پلٹنا، سنگریزوں کا تسبیح کرنا، ایسی ہی باتیں ان کے نزدیک معجزہ ہیں اس لیے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہوں کہ وہ حقائق پر غور کر سکیں اُن کے لیے ان مادّی مظاہرات کی کیا ضرورت؟ میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے معجزہ ان غیر معمولی آثار کا نام ہے جو ایک مدعی نبوت میں اس کے دعوے کے مطابق خصوصی حیثیت سے پائے جاتے ہیں یہ آثار، ایک بلند مرتبہ فلاسفر کے لیے وہ رموز و اسرار عقلی ہوں گے جو اُس کے کلام میں ودلیت ہیں اُس کے اعتبار سے وہی معجزہ ہونگے اور ایک سطحی نظر رکھنے والے انسان کے لیے جو حقائق کلام کو نہیں سمجھ سکتا مادّی مظاہرات ہونگے۔

معجزہ کی ضرورت

انسانی افراد اپنی افتاد طبع کی بنا پر اقتدار پسندی و جاہ طلبی کے پُتلے سواد ہوس کے مجسمے اور ذاتی و نفسانی اغراض کے بندے ہیں۔ اُن کو ذرا سی کسی ایسی بات کا دعویٰ جس میں اپنی سیادت تسلیم ہوتی، اپنی بات بالا ہوتی اور دوسرے بہت سے سادہ لوح افراد کے دلوں پر اپنی حکومت کا سکہ قائم ہوتا ہو بہت آسان اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ اُن کو اس میں کسی سچائی، حقیقت اور واقعیت کا خیال پس و پیش کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ ایک ذرا سی وقتی شان و شوکت اُن کو بڑے سے بڑے غلط دعوے پر آمادہ کر سکتی ہے جس کی آخری حد خدائی کے دعوائے باطل تک پہونچتی ہے اُس کے آگے کوئی زینہ ہی نہیں کہ نقطۂ اعتلاء وہاں تک پہونچے۔

نبوت و رسالت جو ایک خداوندی منصب اور روحانی عہدہ ہے اپنی واقعی حقیقت کے اعتبار سے ایک روحانی اقتدار فرمانروائی اور سیادت کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ ضرور رکھتی ہے اس لیے عام انسانی افراد کے اقتدار پسند طبائع اس جامہ کو زیب تن کرنے اور اس منصب کے غلط دعوے کرنے پر بڑی جرأت کے ساتھ آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ دنیادی منصب ظاہری اسباب و ذرائع اور مادی ساز و سامان پر موقوف ہوتے ہیں، وہ ذرائع اور سامان جس کے لیے مہیا نہ ہوں اُس کے لیے اُن مناصب کے نام لینے سے کوئی حاصل ہی نہیں ہے۔ ایک بے تاج و تخت، بے مال و دولت زاویہ نشین فقیر یہ ادعا کرے کہ میں بادشاہ ہوں، وزیر ہوں یا رکن سلطنت ہوں تو کوئی کاہے کو ماننے لگا اور کیوں تسلیم کرنے لگا لیکن نبوت و رسالت وغیرہ یہ مناصب کسی ظاہری ذریعہ و سبب پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ روحانی پیغام اور باطنی وحی و الہام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو کسی شخص کو اُن کے ادعا میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی، ظاہری لوازم زندگی کے اعتبار سے انبیاء و مرسلین بھی عام افراد بشری کے ایسے انسان ہی ہوتے ہیں جن کو قدرت کی طرف سے رسالت کے عہدہ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں خدا سامنے آئیگا نہیں، دنیا خدا تک پہونچے گی نہیں پھر یہ کہنا کیا مشکل ہے کہ مجھ کو خدا نے عہدہ رسالت پر مبعوث کیا اور مجھ کو تمام خلق کی رہنمائی کے لیے مقرر کیا ہے۔

اس کی نظیریں بھی بار بار دنیا کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں یعنی ہر قوم کے نزدیک متفقہ طور سے بعض ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جنھوں نے غلط طریقہ پر نبوت کا دعویٰ کیا اور ایک باطل شریعت کی بنیاد قائم کی۔

ایک قانون کا مرتب کر لینا اور دنیا کی رفتار پر نظر کر کے کچھ اصول قرار دے لینا جن کو شریعت الٰہیہ کے نام سے پیش کیا جائے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کہ اُس کے تمام احکام صحیح اصول پر مبنی ہیں یا نہیں؟ عام افراد کا کام نہیں اس لیے کہ انسانی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں عقلائے زمانہ کے خیالات ایک نقطہ پر مجتمع نہیں چہ جائیکہ عام افراد۔

اس صورت حال کے بعد اگر اُس مدعی نبوت کے پاس جو حقیقۃً خدا کا فرستادہ، اس کا پیغام بر و سفیر اور اس کی شریعت کا مبلغ ہے صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو کہ میں خدا کا رسول یعنی اُس کا فرستادہ ہوں اور اس کے سوا کچھ نہ ہو تو اُس میں اور اُن لوگوں میں جو غلط طور پر یہی دعوے کر رہے ہیں فرق ہی کیا رہا اور عام افراد پر کیونکر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ اس سچے نبی کے قول کو تسلیم کریں۔ اس کے دعوے کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اطاعت کریں۔ اور دوسروں کے دعوے سے انکار کریں اور اُن کی شریعت کو تسلیم نہ کریں۔

اس کے لیے عقل ضروری سمجھتی ہے کہ یقیناً وہ شخص جو خدائے حکیم و خبیر کا حقیقی نمائندہ ہے اس کے لیے خدا کی جانب سے خصوصی طور پر ایسی بات ہونا چاہیے جس کو وہ بحیثیت دلیل دعوائے نبوت پیش کرے اور جس کے مقابلہ سے دنیا کی طاقتیں عاجز ہوں ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر اپنے آثار قدرت کے خود نہ پہچانا جا سکا اُس کے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیونکر پہچانیں؟

خدا کی معرفت یقیناً آثار کی محتاج ہے آثار بھی وہ جو مشترک نہ ہوں بلکہ الوہیت کے ساتھ مخصوص ہوں یعنی وہ آثار جو خدا اور غیر خدا میں مشترکہ حیثیت رکھتے ہوں وہ خدا کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتے۔ خدا کے وجود کی دلیل وہی آثار بن سکتے ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی قادر نہ ہو۔ اب آپ کو پہچاننا ہے خدا کے پیغمبر اور اس کی طرف کے سفیر کو۔ اگر کسی مادی ہستی کی طرف سے سفارت کا دعویٰ ہوتا تو اس کے پاس جا کر یا اُسکو خط لکھکر تصدیق کرائی جا سکتی تھی کہ یہ میرا نمائندہ ہے لیکن یہاں تو ایسا نہیں۔ جب خدا کو خود اُسے دیکھکر نہیں پہچانا تو سفیر کی سفارت کو خود بھیجنے والے سے پوچھ کر تو سمجھ نہیں سکتے۔ رہ گیا دعویٰ تو بہت سے دعویدار جھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھر جب بھیجنے والے تک رسائی نہیں بھیجے جانے والے کا دعویٰ مفید نہیں تو اب بتلایئے کہ کیونکر سمجھیں؟ خدا جس طرح غیر مادی تھا اسی طرح یہ مادی انسان اُس رشتہ کے لحاظ سے جس کا غیر مادی خدا کے ساتھ ادعا کر رہا ہے مادّی حدود سے بلند ہو گیا ہے اس لیے جس طرح اُس غیر مادّی ہستی کو پہچانا اسی طرح اس کے ساتھ تعلق کو پہچانیں، وہ صرف آثار ہیں جن کے ذریعہ سے ہم شناخت کر سکیں گے۔ آثار بھی وہ جو مخصوص ہوں یعنی جو سوائے مبعوث من اللہ کے دوسرے شخص میں عقلاً نہ پائے جا سکیں۔ اسی کو کہتے ہیں معجزہ۔

معجزہ اور اثبات حقانیت

یہ امر ایک حد تک محل بحث رہا ہے کہ معجزہ سے کسی نبی کی سچائی پر کیونکر روشنی پڑتی ہے بہت سے لوگ معجزہ کی حقیقت کو صرف ایک غیر معمولی، عجیب و غریب کرتب میں منحصر سمجھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی باتیں تو اکثر جادوگر، شعبدہ باز بھی پیش کر دیتے ہیں یا بعض غیر معمولی طاقت کے انسان اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے عام افراد قاصر نظر آتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک معجزہ سمجھا جائیگا اور اگر نہیں تو اس میں اور معجزات انبیاء میں کیا فرق ہے؟

یہ سوال حقیقۃً دلیل اعجاز کے متعلق ناسمجھی پر مبنی ہے۔

اعجاز کی بنیاد ایک باریک خصوصیت پر ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کا عجیب و غریب مظاہرہ ایک مدعی نبوت کے
لیے دلیل اعجاز اور سبب ثبوت نبوت ہوتا ہے اور اسی قسم کا مظاہرہ ایک ساحر اور جادوگر سے یا کسی غیر معمولی انسان کا کوئی مخصوص
کمال اُس کا معجزہ نہیں ہوتا اور دلیل نبوت قرار نہیں پاتا۔

غور سے ملاحظہ ہو۔ حضرت حق عزّ اسمہٗ حکیم علی الاطلاق نقص و عیب سے بری، ظلم و دروغ اور باطل کی حمایت سے بلند
و برتر ہے اُس کے دامن قدرت تک کسی باطل پروری اور ناحق کوشی کی حمایت کا الزام عائد ہونا اُسکے شان کمال و حکمت کے
خلاف ہے۔

ہمارے ایسے عام افراد میں کوئی ہماری جانب سے ایک غلط بات کی اشاعت کرے، ہمارا نام لیکر کسی غلط امر کا ادعا
کرے، اور ہماری طرف سے کوئی شناخت ثبوت میں پیش بھی کرے جس سے عام اشخاص کا دھوکا کھا جانا اصول فطرت کے لحاظ
سے حق بجانب ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حقیقت کا اظہار، واقعیت کا اعلان کریں، اور اپنی ذمہ داری کو اس سلسلہ میں پورا کر دیں۔

ایک گندم نما جو فروش، ریاکار و ظاہر دار زہد و تقدس کا بیپاری اور بناوٹی ورع و تقویٰ کا دوکاندار، میری طرف سے
اجازہ، اجتہاد یا پیشنمازی میرے جعلی دستخط اور مہر سے بنا کر اطراف و جوانب، شہر و دیہات میں جاتا، خلق خدا کی گمراہی کا سامان
مہیا کرتا ہے بیشک لوگوں کا یہ فرض ہے کہ جب وہ میری طرف نسبت دیکر اپنی انتہاری پیشنمازی یا اجتہاد کی دعوت دے
تو وہ اُس سے دلیل اور سند کا مطالبہ کریں لیکن جب اُس نے اس مطالبہ کے جواب میں دستخطی و مہری سند پیش کر دی تو عام افراد
کا فرض ختم ہو چکا، اُن کی فطرت کا تقاضا اُن کے سر تسلیم کو ختم کرا دے گا اور وہ یقیناً اُس کے غلط اور گمراہ کن دعوے کے فریب
میں مبتلا ہونے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن اس موقع پر مجھے اطلاع ہو جائے اور معلوم ہو تو لازمی فریضہ یہ ہے کہ جب میرے
جعلی دستخط اور مُہر سے خلق کی گمراہی کا سامان ہو رہا ہے تو میں اعلان کر دوں کہ یہ میرے دستخط اور مہر نہیں ہیں میری طرف
ان کی نسبت غلط ہے اور میرے اصلی دستخط اور مہر اس کے علاوہ ہیں۔

اس کے برخلاف اگر کسی ایسے شخص کے اظہار و اقرار کے بعد میں نے سکوت کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے
کہ میں اُس کے دعوے کا امضا کرتا، اس کے اعلان کو برقرار رکھتا اور عملی حیثیت سے اس کی تائید کرتا ہوں۔

بے شک اسی صورت سے جب خدا کی طرف سے ایک شخص نے کسی منصب، عہدہ اور مرتبہ کا دعویٰ کیا جو بالکل
روحانی بنیادوں پر مبنی ہے۔ جس کے آثار و خصوصیات مادی دنیا سے الگ اور عام افراد کے ظاہری معیار امتیاز سے
جداگانہ ہیں۔

اُس نے اظہار کیا کہ مجھے خدا نے نبوت و رسالت کے شرف سے مخصوص کیا، اور سفارت کے عہدہ جلیلہ سے ممتاز کیا۔
ہے۔ اُس نے مجھ کو ہدایت خلق کے لیے بھیجا ہے اور عامۂ خلائق کا رہنما قرار دیا ہے اس وقت عام افراد کا فرض ہے کہ وہ اُس
سے دلیل کا مطالبہ کریں اور ثبوت نبوت کے لیے برہان حقیقت کے پیش کرنے کی خواہش کریں،

اب اگر یہ مطالبہ ہوا اور اُس نے ایک غیر معمولی، عام انسانوں کے طاقت و اقتدار سے بالاتر اور بشری قوت سے
بالکل باہر ایسا امر پیش کیا جس سے انسانی کمال کا ہاتھ کوتاہ نظر آیا اور بشری طاقتیں عاجز ہوئیں۔ اُس نے کہا کہ یہ طاقت

مجھے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ میری سچائی کی پہچان ہے۔

اس موقع پر اگر خدا ہمارا ایسا ایک شخص ہوتا جس پر بے خبری اور سہو و نسیان وغیرہ کا امکان ہوتا تو بہت ممکن
ہے عرصہ تک اس کی خاموشی بے خبری کے سبب سے حق بجانب قرار پا سکتی لیکن عالم و حکیم خدا، حاضر و ناظر خدا اور نظام کائنات
کا مدبّر خدا اگر اس کے بعد خاموش رہا، یعنی اس کے دعوے کو برقرار رہنے دیا اس کی طاقت کے مقابل کوئی طاقت پیدا نہ کی
اُس کے ادعائے بیجا کو توڑنے کی تدبیر نہ کی اور اُس کی قوت کو عاجز نہ کیا نہ اُس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو قوت عطا
کی تو سمجھنا چاہیے کہ اس نے نمائندگی کا امضا، سفارت کا اقرار اور عہدہ کی تائید کی اور اُس کے دعوائے نبوت و رسالت کی عملی
طور پر تصدیق کی ہے۔

اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سچا نبی اور حقیقی رسول ہے۔

اگر ایسا نہیں تو خدا پر حمایت باطل، گمراہی خلق اور پامالی حق کا الزام آتا ہے جو کسی طرح خداوند عالم کی شان جلال و کمال
کے لیے جائز نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ میں جو روح اعجاز دوڑتی ہے وہ اُس دعوائے نبوت و رسالت کی بنا پر ہے جو اس قدرت
نمائی کا انتساب خدا کی طرف کر دیتا ہے اور جس کے بعد خدا پر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر دعوائے نبوت و رسالت نہیں ہے تو لاکھ کوئی عجائبات پیش کرے، حیرت انگیز کرتب دکھلائے اور محیر العقول
کام انجام دے ہر موقع پر خدا کا یہ فرض تھوڑی ہے کہ وہ بات کے مقابلہ میں ایک بات اور ہر چیز کے جواب میں ایک چیز پیش
کرتا رہے، آخر اس صورت میں یہ سلسلہ کہیں پر ختم بھی تو ہوگا تو وہ آخری چیز لاجواب ہی ہوگی اور اُس کی کوئی مثال موجود نہ
ہوگی۔

ان عجیب مظاہروں، حیرت انگیز کرتبوں اور تعجب خیز کارگذاریوں سے خدا پر ذمہ داری ہی کونسی عائد ہوتی ہے تاکہ ان
عجیب کارناموں کا برقرار رہنا کسی خاص حقیقت کی دلیل قرار پائے۔

مذکورۂ بالا بیان کی بنا پر معجزہ کی بنیاد حسب ذیل ارکان پر ہے جن کے بغیر کوئی چیز معجزہ نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۱) منصب روحانی یعنی نبوت و رسالت وغیرہ کا ادعا۔

(۲) غیر معمولی امر ہونا جو اُس حلقہ میں کہ جو دعوائے نبوت و رسالت کا مخاطب ہے، تمام افراد کی طاقت و اقتدار سے باہر
ہو اس لیے اگر ایسا امر ہوا جس پر دوسرے اشخاص بھی قدرت رکھتے ہیں تو وہ کسی مرتبہ و عہدہ کی دلیل خصوصی نہیں بن سکتا۔

(۳) اُس دعوے کے بعد کسی ایسے شخص کا پیدا نہ ہونا جو اُس دعوے کو توڑ سکے اور اُسے باطل کر سکے۔

(۴) حالات اور خصوصیات کی بنا پر کسی ایسے امر کا موجود نہ ہونا جو اُس مدعی نبوت کے دعوے کا قطعی ابطال کرنے کے
لیے کافی ہو اس لیے کہ اگر ایسا ہو، یعنی کوئی ایسا امر پایا گیا جو اُس کے دعوے کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہے جیسے
مستند تسلیم شدہ نبی سابق کا اعلان کہ میرے بعد آنیوالا مدعی نبوت غلط گو ہے یا یہ اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے
یا خود اس شخص کا جو مدعی نبوت ہے فاسق و فاجر اور اپنی سابقہ زندگی کے اعتبار سے بالکل ناکارہ ہونا جس کے ساتھ اُس

کا بعدہٗ نبوت و رسالت منتخب ہونا قطعی دلائل عقلیہ اور خدا کے مواعید یقینیہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا مدعی ہونے کے ساتھ کسی غیر معمولی امر کا اظہار بھی اُس کی نبوت کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ثبوت نبوت تو خداوند عالم پر ذمہ داری عائد ہونے کی بنیاد پر تھا اور یہاں خدا کی ذمہ داری نبی سابق کے اعلان یا اُن قطعی بیانات سے جو ایسے شخص کی نبوت کے منافی ہیں پوری ہو چکی ہے۔ جو خدا کی حجت تمام ہونے اور خلق کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے جس کے بعد خداوند عالم کو اس مدعی نبوت کے مقابل میں خصوصی حیثیت سے کسی طریقہ کے ابطال کی ضرورت نہیں ہے۔

معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ

پہلا اور تیسرا رکن وہ ہے جو معجزہ کو سحر اور جادو سے الگ کر دیتا ہے۔ یقیناً جادو بھی ایک حیرت انگیز صورت کا مظاہر ہوتا ہے لیکن یا تو اُس کے ساتھ دعوائے نبوت و رسالت وغیرہ ہوتا نہیں اس لیے خداوند عالم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی یا اگر دعوائے نبوت و رسالت کے ساتھ یا کسی سچے نبی کے دعوائے نبوت اور معجزہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو خدا اُس کے ابطال کا سامان کر دیتا ہے جیسا کہ ساحران فرعون کے قصہ میں واقع ہوا۔

بہت سے وہ اشخاص جنھوں نے حقیقت معجزہ اور دلیل اعجاز پر غور نہیں کیا ہے اعجاز نبوت کے مقابلہ میں بہت سے اشخاص کے ذاتی کمالات کو پیش کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن بحیثیت فصاحت و بلاغت اگر اس لیے معجزہ ہے کہ اُس کا مثل کوئی نہیں لا سکا تو بہت سے علمی و ادبی آثار مختلف ادباء کے مختلف زبانوں میں ایسے ہیں جن کا مثل و نظیر اب تک باوجود کوشش و کاوش کے ممکن نہیں ہو سکا ہے جیسے فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی، گلستان سعدی، اردو میں مثنوی میر حسن۔ مراثی میر انیس۔ انگریزی میں شیکسپیر وغیرہ کے آثار قلمی اور ادبی کارنامے،

ان کے جواب میں ہمارے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بے شک اگر فردوسی، سعدی، میر حسن، میر انیس، شیکسپیر وغیرہ نے نبوت، رسالت، مظہریت وغیرہ وغیرہ کا ادعا کیا ہوتا اور پھر بھی اُن کے شاہنامہ، گلستان، مثنوی، مراثی وغیرہ کا جواب نہ ہو سکتا اور نہ ممکن ہوتا تو ہم یقیناً ان کو معجزہ اور ان کو نبی تسلیم کر لیتے اور اُسے دلیل اعجاز سمجھتے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان کے قلمی آثار اُس نوع اعجاز سے عاری ہیں جو کسی حیرت انگیز امر کے معجزۂ ربانی و دلیل حقانی ہونے کی ضامن ہے اس لیے انھیں معجزہ سمجھنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

[1] یہ اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے ہے کہ مذکورہ بالا مظاہرات کا موقع ظہور اس وقت ہے جب ختم نبوت کے اعلان نے کسی نبی و رسول کی بعثت کا دروازہ بند کر دیا اس لیے چوتھے رکن کی بنا پر بھی دلیل اعجاز مکمل نہیں ہے۔ اور ان مظاہرات سے حقیقت اعجاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۱۲

دُنیا میں مختلف طرح کے کام ہوتے ہیں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی۔ خدا کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی ہی پیدا کرتا رہے۔ سحر بھی عالم اسباب کے ماتحت ہے۔ دنیا میں بہت سے اسباب کارفرما ہیں۔ وہ سب اسباب خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان اسباب میں کچھ وہ ہیں جو ہم کو معلوم ہیں اور کچھ وہ جو ہم کو نہیں معلوم ہیں۔

جو ہم کو معلوم ہیں وہ ہمارے لیے معمولی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اسباب جو عام طور سے نہیں معلوم ہیں وہ غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہے کہ کوئی اثر بغیر مؤثر رونما ہو جائے۔

سحر بھی عالم طبیعیات کے حدود کے اندر ہے۔ وہ بھی عالم کون و فساد اور نظام اسباب کے سلسلہ کے ماتحت ہے جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز یا خارق عادت تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُس عام دستور کے خلاف ہے جو ہماری آنکھوں نے قانون قدرت کے ماتحت عام طور سے دیکھا ہے۔

اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہو جاتے ہیں جن کو دنیا بے مثال کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔

ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اُس کے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔

ایک انشا پرداز بسا اوقات ایسی تحریر لکھ دیتا ہے جس کی نظیر اس کے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک شاعر بسا اوقات ایسا شعر کہہ جاتا ہے جیسا شعر اس کے قبل نہیں ہوا تھا، ایک کاتب بسا اوقات اُس کے ہاتھ سے ایسے نقوش نکل جاتے ہیں جن کے مثل پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ اُس طبیب، انشا پرداز، شاعر یا کاتب کو اپنے اس نتیجۂ عمل پر کچھ بھروسا بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دے سکے کہ اگر کوئی میرا مد مقابل ہو تو اس کے مثل بنا کر پیش کرے۔

سعدی اپنے گلستان پر، یاقوت مستعصمی اپنے کتبوں پر، میر انیس اپنے مرثیوں پر، بجا طور پر فخر کر سکتے تھے اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ بھی کسی نہ کسی حد تک درست تھا۔ خدا کو کیا ضرورت کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعوے کو غلط ثابت کرے۔ اس لیے کہ بہر حال نتیجۂ کمال ہے اُس کے ایک مخلوق کا اس کی پیدا کردہ طاقتوں کا ثمرہ ہے۔ وہ اگر کسی کو پیدا کرے جو اُس کے دعوائے کمال کو باطل کر دے تو پھر ضرورت ہے کہ اس کی بے مثالی باطل کرنے کے لیے ایک دوسرا پیدا کیا جائے اور پھر اُس کے لیے تیسرا پھر یہ سلسلہ کبھی تو ختم ہو ہی جائیگا کیونکہ دنیا کا نظام متناہی ہے لہذا آخر میں جو ہوگا اُس کا دعویٰ لاجواب ہی رہیگا پھر خدا کو کیا ضرورت کہ وہ اس جھگڑے میں پڑے اور ہر ایک کے دعوے کو باطل کرے لہذا ہر زمانہ میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہو سکتے ہیں جیسی قابلیت ان کے غیر میں مفقود ہے۔

ایک شاعر ایسا شعر کہہ سکتا ہے جس کے مثل کوئی اور نہیں کہہ سکتا۔ کاتب ایسا کتبہ لکھ سکتا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اور اسی طرح ہر شعبہ میں بے مثال مثالیں ہو سکتی ہیں۔

یہ سب ٹھیک ہے اس لیے کہ ان کے ساتھ کوئی دعویٰ شریک نہیں ہوتا جو خدا پر ذمہ داری عائد کرے لہذا خدا پر فرض نہیں ہے لیکن یاد رکھے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے نتیجۂ کارگزاری کو یہ کہکر پیش کرتا ہے کہ خدا نے مجھے کسی عہدہ پر مقرر کر کے بھیجا ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے اور یہ جھوٹا ہو تو خدا پر لازم ہوتا کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کر دے جو اُس

کے خلاف مظاہرہ کر کے اُس کے دعوے کو باطل کر دے۔

قرآن معجزہ ہے اس لیے کہ وہ ثبوت نبوت میں پیش ہوا، دلیل رسالت میں لایا گیا اور دنیا کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ نبوت میں شک رکھتی ہے تو اس کی مثال پیش کرے اور پھر بھی دنیا قاصر رہی اس سے معلوم ہوا کہ وہ حقیقۃً انسانی طاقت سے خارج اور خدا کی خاص قوت و قدرت کا کرشمہ اور مخصوص امتیاز اور روحانی اختصاص ہے جو ثبوت نبوت کے لیے قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

قرآن میں معجزات انبیاء کا تذکرہ

بہت سے افراد جنھوں نے اپنے دل خواستہ اور ساختہ و پرداختہ انبیاء کا حلقہ اطاعت زیب گردن کیا ہے اور زمانہ کے موجودہ دور سے قریب ہونے کی وجہ سے اُن کے لیے وہ کچھ معجزات اور خوارق عادات کے ظہور کے ادعاء کی جرأت نہیں رکھتے وہ اس اپنی کمزوری اور سرمایۂ اعجاز سے بے مائیگی و تہیدستی کو معجزات انبیاء کے انکار سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء عجیب و غریب مظاہرات ظاہر کر کے اپنی نبوت تسلیم نہیں کراتے تھے بلکہ صرف ان کی روحانیت تھی جو اُن کے لیے قلوب کو جذب کرتی اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں قرآن کے اندر معجزات انبیاء کے تذکرہ کیے جانے کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں کہیں معجزہ کو دلیل نبوت نہیں بتایا گیا ہے اور نہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے قرآن نے معجزات کا ادعا کیا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید نے اپنے انوکھے طرز حکایت کے ساتھ اکثر انبیاء کے معجزات کا تذکرہ صاف اور صریحی الفاظ میں درج کیا ہے۔ بے شک اُس کو "معجزہ" کے نام سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ "آیت" اور "بینہ" کی لفظ سے تعبیر کیا ہے اسی کو متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسکر معانی سے کنارہ کشی کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہم کو لفظ معجزہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کہ ہم آپ اس لفظ کو قرآن میں تلاش کریں اور اس کی تعریف ڈھونڈھیں قرآن کوئی فرہنگ او لغت مصطلحات نہیں ہے کہ اُس میں لفظ معجزہ اور اس کی تعریف مذکور ہو۔ بے شک ہم کو اس قسم کی دلیل نبوت جس کو متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور جس کے وجود کو ثبوت نبوت میں ضروری سمجھتے ہیں اُس کا پتہ قرآن میں لگانا چاہیے۔ اگر اس کا پتہ لگ جائے تو الفاظ میں اختیار ہے اور نام رکھنا آپ کے ہاتھ میں ہے آپ اُس کو معجزہ کہیں جیسا کہ اس لفظ کے معنی لغوی (عاجز کر دینے والی چیز) کی مناسبت سے متکلمین کی اصطلاح ہے یا جس لفظ سے قرآن مجید نے اُن دلائل کی تعبیر کی ہو اس لفظ سے تعبیر کیجیے یا کوئی نام اپنے دل سے تجویز کر لیجیے مجھ کو یا کسی شخص کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اب میں دکھلاؤں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی دلیل نبوت کا پتہ ہے یا نہیں اور اسی ذیل میں آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے کس طرح صداقت نبی کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن مجید نے ان حیرت انگیز مظاہرات قدرت اور دلائل نبوت کو جنھیں انبیاء پیش کیا کرتے تھے آیات اور بینات کے نام پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

والی ثمود اخاھم صالحا قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ قد جاءتکم بینۃ من ربکم ھٰذہ ناقۃ اللہ لکم

(قبیلہ ثمود کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی صالح کو انھوں نے کہا اے میری قوم والو عبادت کرو خدائے برحق کی اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے "بینۃ" آگیا ہے یہ خدا کا خاص پیدا کردہ)

اٰیۃ فذروھا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔

ناقہ جو تمہارے لیے "آیت" (نشانی) ہے اس کو چھوڑے رکھنا کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اسے کوئی برائی نہ پہنچانا جس سے تم عذاب دردناک میں مبتلا ہو۔

اس میں ناقہ صالح کو "بینۃ" اور اسی کو "آیت" کہا گیا ہے۔

ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ بآیاتنا الیٰ فرعون وملائہ فظلموا بھا فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین وقال موسیٰ یا فرعون انی رسول من رب العٰلمین حقیق علیٰ ان لا اقول علی اللہ الا الحق قد جئتکم ببینۃ من ربکم فارسل معی بنی اسرائیل قال ان کنت جئت بآیۃ فأت بھا ان کنت من الصادقین فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین۔

پھر ہم نے ان انبیاء کے بعد مبعوث کیا موسیٰ کو اپنی "آیتوں" کے ساتھ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف مگر اُن لوگوں نے اُن آیتوں کے ساتھ ناانصافی کی۔ اب ذرا دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہے اور موسیٰ نے کہا تھا کہ اے فرعون یقیناً میں خداوند عالم کی طرف سے فرستادہ ہوں اور میرے اوپر لازم ہے کہ میں سوائے سچی بات کے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت نہ دوں میں تمہاری طرف "بینۃ" لے کر تمہارے رب کی طرف سے آیا ہوں، تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی "آیت" لائے ہو تو اسے پیش کر دو، اگر سچے ہو، یہ سن کر موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا جو ایک مرتبہ صاف اژدھے کی شکل میں نمودار ہو گیا اور انھوں نے اپنا ہاتھ نکالا جو تمام دیکھنے والوں کی نظر میں چمکدار اور روشن نظر آیا۔

یہاں عصائے حضرت موسیٰ اور ید بیضاء کو "بینۃ" اور "آیت" قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ساحران فرعون کی آواز نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے معجزات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے فرعون سے کہا۔

وما تنقم منا الا ان اٰمنا باٰیات ربنا لما جاءتنا ربنا افرغ علینا صبرا وتوفنا مسلمین۔

تو ہم سے کس بات پر ناراض ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی "آیتوں" پر ایمان لائے۔ جب کہ وہ ہمارے سامنے آئیں۔ پروردگار ہم پر صبر کی افزائش کرے اور ہمیں ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھا

(اس کے بعد)

وقالوا مھما تاتنا بہ من اٰیۃ لتسحرنا بھا فما نحن لک بمؤمنین فارسلنا علیھم الطوفان و

ان لوگوں نے کہا کہ جو بھی چاہو، تم "آیت" ہمارے سامنے پیش کرو کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اس وقت ہم نے

الجراد و القمل و الضفادع و الدم اٰیات مفصّلات فاستکبروا و کانوا قوما مجرمین۔

ان پر بھیجا طوفان اور ٹڈیوں کا لشکر اور جوئیں اور مینڈک اور خون کھلی ہوئی "آیتیں" مگر انھوں نے ہٹ دھرمی سے کام کیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔

اس میں پہلے جزء سے صاف ظاہر ہے کہ "آیت" اس نوعیت کی چیز کو کہا گیا ہے جس میں کفار سحر و جادو کی صورت پاتے تھے اور آخر آیت میں طوفان۔ جراد۔ قمل۔ ضفادع۔ دم ان مصائب کو جو غیر معمولی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئے تھے "آیات مفصلات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثمّ بعثنا من بعدہ رسلا الیٰ قومھم فجآءوھم بالبیّنات فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل۔

پھر ہم نے بھیجے ان کے بعد کچھ رسُل ان کی قوم کی طرف اور وہ رسول ان کے سامنے لائے "بیّنات" کو مگر وہ کب ایمان لانے والے تھے اس چیز پر جس کی پہلے تکذیب کر چکے تھے۔

اس میں نوح کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ ظاہر ہونے والے امور کو اجمالی طور پر "بیّنات" سے تعبیر کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے۔

ثمّ بعثنا من بعدھم موسیٰ وھٰرون الیٰ فرعون و ملائہ باٰیاتنا فاستکبروا و کانوا قوما مجرمین فلمّا جآء الحق من ربھم قالوا انّ ھٰذا لسحر مبین۔ قال موسیٰ اتقولون للحق لمّا جآءکم اسحر ھذا و لا یفلح الساحرون۔ قال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم۔ فلمّا جآء السحرۃ قال لھم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فلمّا القوا قال موسیٰ ما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین و یحق الحق بکلماتہ و لو کرہ المجرمون۔

پھر ہم نے بھیجا اُن کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اُس کے گروہ کی طرف اپنی "آیتوں" کے ساتھ، انھوں نے ہٹ دھرمی کی اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے، جب اُن کے پاس اُن کے پروردگار کی طرف سے سچی حقیقت پیش ہوئی تو انھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے موسیٰ نے کہا تم سچی بات کو جو تمھارے پاس آئی ایسا کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہو سکتا ہے حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔ فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر کامل جادوگر کو بلا کر لاؤ جب سب جادوگر جمع ہوئے تو موسیٰ نے کہا کر دکھاؤ جو کرتب تم دکھا سکتے ہو۔ جب اُنھوں نے پھینکا اپنی رسیوں کو تو موسیٰ نے کہا کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ سحر ہے خدا یقیناً اس کو ابھی باطل کر دے گا خدا مفسدہ پردازوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا اور جو حق بات ہے اس کو وہ اپنے حکم سے پورا کرتا ہے اگرچہ گنہگار لوگ اس کو برا سمجھیں۔

ان آیات میں پورے طور سے اُس دلیل عقلی کا خلاصہ موجود ہے جو معجزہ و سحر کے تفرقہ میں عرض کی جا چکی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہری صورت سے جو امر بطور دلیل نبوت نبی کو عطا ہوا تھا وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جو سحر

کی ہوتی ہے یعنی غیر معمولی اور خارق عادت اور خلاف نظام عام، اسی بنا پر ان لوگوں نے کہا کہ ان ھذا لسحر مبین اور یہی خیال کر کے فرعون نے مقابلہ کے لیے ساحروں کو دعوت دی لیکن پیغمبر نے اس مختصر جملہ سے کہ اسحر ھذا و لا یفلح الساحرون فلسفۂ اعجاز اور آیت الٰہی و کرشمہ ساحری کے تفرقہ پر مکمل روشنی ڈال دی۔ اس میں اعجاز اور سحر کے تفرقہ کا معیار جو بتلایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اگر یہ سحر ہوگا تو اس کو کامیابی و سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی اس لیے کہ خدا پر لازم ہے کہ وہ اس کا ابطال کر دے اور اگر وہ سرسبز و کامیاب ہوا اور اس کا ابطال نہ ہوا تو سمجھو کہ حقیقۃً سحر نہیں بلکہ اعجاز ہے اور اس معیار کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ نے ساحروں کی کارستانی دیکھی تو فرمایا "یہ جو تم نے کیا سحر ہے یقیناً خدا اس کو باطل کر دے گا۔ خدا کبھی فساد برپا کرنے والوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا" معلوم ہوا معیار سحر یہ ہے کہ خدا اس کو باطل کر دے و یحق اللہ الحق بکلماتہ و لو کرہ المجرمون یعنی جو واقعی حق و صداقت اور سچ مچ خدا کی طرف کی نشانی ہے اُس کو وہ اپنے مظاہرات قدرت کے ساتھ برقرار رکھتا ہے چاہے گنہگار لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گذرے۔ یہ معیار اعجاز ہے اب اس سے بڑھ کر دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہوگا؟

اِن آیات سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اس مظاہرۂ قدرت کو جسے "آیت" اور "بیّنہ" کہا گیا ہے دلیل نبوت اور معیار صداقت کی صورت میں پیش کیا ہے بلکہ درحقیقت "بیّنہ" کہنا ان مظاہرات کو اسی اعتبار سے ہے کہ وہ کھلی ہوئی دلیل صداقت کی ہیں اور "آیت" کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ حقانیت کی نشانی ہیں۔

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو۔

اسلک یدک فی جیبک تخرج بیضآء من غیر سوء و اضمم الیک جناحک من الرھب فذانک برھانان من ربک الی فرعون و ملائہ۔

داخل کرو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن بغیر کسی ناگوار صورت کے اور ملا دو اپنی طرف اپنے بازو کو دہشت سے، یہ دلیل ہوگی تمھارے پروردگار کی جانب سے فرعون کی جانب۔

اس آیت میں صاف صاف حضرت موسیٰ کے معجزات کو "برہان" یعنی دلیل نبوت بتلایا گیا ہے۔

حضرت خاتم الانبیاء کے معجزات

جب کہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ قرآن میں معجزات کو "آیات" و "بیّنات" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اب آپ قرآن میں تلاش کیجیے آپ کو حسب ذیل ۲۸ مقام میں واضح اور صاف الفاظ میں ثبوت ملے گا کہ ہمارے رسول کو بھی معجزات عطا ہوئے ہیں۔

ولقد انزلنا الیک اٰیات بیّنات و ما یکفر بھا الّا الفاسقون ۱ بقرہ

یقیناً ہم نے اتارے ہیں تم پر روشن معجزات اور نہیں انکار کر سکتے ان کا مگر فاسق لوگ۔

(۲) و قال الذین لا یعلمون لو لا یکلمنا اللہ او تاتینا اٰیۃ کذلک قال الذین من

جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ کیوں ہم سے خدا بات نہیں کرتا یا کوئی خاص معجزہ کیوں نہیں اُترتا ایسا ہی کہا

قبلهم مثل قولهم تشابهت قلوبهم قد بيّنا الآيات لقوم يوقنون (پ۱ البقرہ)

تھا ان لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے ایسا ہی قول یقیناً ہم نے معجزات ظاہر کیے اُن لوگوں کے لیے جو یقین لانے پر آمادہ ہیں۔

(۳) فان زللتم من بعد ما جاءتكم البيّنات فاعلموا انّ الله عزيز حكيم (پ۲ بقرہ)

اگر تم نے لغزش کی بعد اس کے کہ معجزے تمھاری طرف آ چکے تو جان لو کہ خدا زبردست اور صاحب حکمت ہے۔

(۴) كيف يهدى الله قوما كفروا بعد ايمانهم وشهدوا انّ الرّسول حق و جاءهم البيّنات (پ۳ آل عمران)

کیونکر خدا راہِ راست پر لائے گا ان لوگوں کو جنھوں نے ایمان لانے کے بعد پھر انکار کیا اور گواہی دی کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس معجزے آئے۔

(۵) وما تاتيهم من آية من آيات ربهم الّا كانوا عنها معرضين (پ ۷ انعام)

ان لوگوں کے سامنے جو بھی معجزہ ان کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے یہ اس سے روگردانی ہی کرتے ہیں۔

(۶) قد نعلم انه ليحزنك الذى يقولون فانهم لا يكذبونك ولكن الظّالمين بآيات الله يجحدون (پ۷ انعام)

ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں ان لوگوں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے یہ لوگ تمھاری ذات کو تھوڑی جھٹلاتے ہیں بلکہ وہ ظالم خدا کے معجزوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

(۷) والذين كذّبوا بآياتنا صم و بكم فى الظلمات (پ۷ انعام)

جنھوں نے جھٹلایا ہمارے معجزوں کو یہ بہرے ہیں اور گونگے ہیں، تاریکی میں مبتلا ہیں۔

(۸) واذا جاءك الذين يؤمنون بآياتنا فقل سلام عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة (پ ۷ انعام)

جب آئیں تمھارے پاس وہ لوگ جو ہمارے معجزوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہو کہ سلامتی تمھارے واسطے ہے۔

(۹) واذا جاءتهم آية قالوا لن نؤمن حتى نؤتى مثل ما اوتى رسل الله، الله يعلم حيث يجعل رسالته (پ ۸ انعام)

جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ویسی ہی باتیں نہ آئیں جو اور پیغمبروں کو ملی تھیں خدا خوب بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کس طرح بھیجے۔

(۱۰) فقد جاءكم بيّنة من ربكم وهدى ورحمة فمن اظلم ممن كذّب بآيات الله وصدف عنها (پ ۸ انعام)

یقیناً آیا تمھارے پاس معجزہ تمھارے پروردگار کی جانب سے اور ہدایت و رحمت تو پھر کون شخص زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو خدا کی طرف کے معجزات کی تکذیب کرے اور ان سے روگردانی کرے۔

(۱۱) واذا بدّلنا آية مكان آية والله اعلم بما ينزل قالوا انما انت

جب ہم کسی ایک معجزہ کے بجائے بدل کر دوسرا معجزہ بھیج دیتے ہیں اور خدا زیادہ واقف ہے اس چیز کے متعلق جسے وہ

مفتر بل اكثرهم لا يعلمون (پ ۱۴ نحل)

اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے دل سے گڑھتے ہو بلکہ اکثر ان میں سے علم نہیں رکھتے۔

(۱۲) ان الذين لا يؤمنون بآيات الله لا يهديهم الله ولهم عذاب اليم (پ ۱۴ نحل)

وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے خدا کے معجزات پر خدا اُن کو جبراً راہ راست تک نہیں پہونچائے گا اور ان کے لیے دردناک سزا مقرر ہے۔

(۱۳) ونحشرهم يوم القيامة على وجوههم عميا وبكما وصمّا ذالك جزاؤهم بانهم كفروا بآياتنا (پ۱۵ بنی اسرائیل)

ہم ان کو روز قیامت اندھا، بہرا محشور کریں گے یہ ان کا بدلا ہے کہ انھوں نے ہمارے معجزات کا انکار کیا۔

(۱۴) ومن اظلم ممن ذكّر بآيات ربه فاعرض عنها۔ (پ ۱۵ کہف)

اُس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اُس کے پروردگار کی طرف کے معجزات کے ذریعہ سے یاددہانی کی گئی۔ مگر اُس نے روگردانی کی۔

(۱۵) افرأيت الّذى كفر بآياتنا (پ ۱۶ مریم)

کیا دیکھا تم نے اُس شخص کو جس نے انکار کیا ہمارے معجزات کا۔

(۱۶) وكذلك انزلناه آيات بيّنات وان الله يهدى من يريد۔ (پ ۱۷ حج)

ہم نے اس کو اتارا ہے روشن معجزوں کی حیثیت سے اور خدا ہدایت کرتا ہے جس کی چاہتا ہے۔

(۱۷) والذين هم بآيات ربّهم يؤمنون (پ ۱۸ مومنون)

وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی طرف کے معجزات پر ایمان لاتے ہیں۔

(۱۸) وانزلنا فيها آيات بينات (پ۱۸ نور)

اور ہم نے اس میں معجزات اتارے کہ جو روشن ہیں۔

(۱۹) ولقد انزلنا اليكم آيات مبيّنات ومثلا من الّذين خلوا من قبلكم۔ (پ ۱۸ نور)

یقیناً ہم نے تمھاری طرف اتارے ہیں واضح معجزات اور ویسی ہی باتیں، جو پہلے زمانے والوں کو ملی تھیں۔

(۲۰) لقد انزلنا آيات مبيّنات والله يهدى من يشاء الى صراطٍ مستقيم (پ ۱۸ نور)

ہم نے اتارے ہیں روشن معجزات اور خدا جس کو چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(۲۱) وقل الحمد لله سيريكم آياته فتعرفونها (پ ۲۰ نمل)

کہو الحمدللہ عنقریب ہم تمہیں معجزات دکھائیں گے۔ جنھیں تم پہچانتے ہوگے۔

(۲۲) واذا رأوا اٰية يستسخرون وقالوا ان هذا الا سحر مبين۔ (پ ۲۳ صافات)

جب وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔

(۲۳) ويريكم اٰياته فاىّ اٰيات اللّٰہ تنكرون (پ ۲۴ مومن)

دکھلا رہا ہے وہ اپنے معجزات پس خدا کے کن کن معجزات کا تم انکار کروگے۔

(۲۴) واذا علم من اٰياتنا شيئا اتخذها هزوا اولٰئك لهم عذاب مهين۔ (پ ۲۵ جاثیہ)

جب ہمارے معجزات میں اُن کو کسی کا علم ہوتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کے لیے ذلت آمیز سزا ہے۔

(۲۵) واذا تتلى عليهم اٰياتنا بيّنات قال الذين كفروا للحق لمّا جاءهم هٰذا سحر مبين (پ ۲۶ احقاف)

جب اُن کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ہمارے روشن معجزات تو جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ حق کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

(۲۶) هو الذى ينزّل على عبده اٰيات بيّنات (پ ۲۷ حدید)

وہ اتارتا ہے اپنے بندہ پر روشن معجزات۔

(۲۷) واذ قال عيسى بن مريم يا بنى اسرائيل انى رسول اللّٰه اليكم مصدّقًا لما بين يدىّ من التوراة ومبشّرا برسول يأتى من بعدى اسمه احمد فلمّا جاءهم بالبينات قالوا هذا سحر مبين (پ ۲۸ صف)

کہا عیسٰی بن مریم نے کہ اے بنی اسرائیل میں خدا کا رسول ہوں تمہاری جانب تصدیق کرنے والا اُس توریت کی جو میرے قبل تھی اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اُس کا نام احمد ہوگا، اب جب وہ آیا ان کی طرف معجزات کے ساتھ تو انھوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

(۲۸) وما تفرّق الذين اوتوا الكتاب الا من بعد ما جاءتهم البيّنة۔ (پ ۳۰ بینہ)

نہیں اختلاف کیا اُن لوگوں نے کہ جنھیں کتاب عطا ہوئی ہے مگر بعد اس کے کہ اُن کی طرف معجزہ آ گیا۔

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسالتمآبؐ بھی اسی طرح "آیات" اور "بینات" کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے جس طرح سابق کے انبیاء۔ اس کے علاوہ ۲۲، ۲۵، ۲۷ آیات میں بار بار اس تذکرہ سے کہ وہ لوگ سحر کہتے تھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو غیر معمولی اور تمام انسانی طاقتوں سے بالاتر مظاہرات نظر آ رہے تھے جس کا جواب اُن کے پاس سوائے الزام جادوگری کے اور کچھ نہ تھا تعجب ہے کہ اس سب کو دیکھتے ہوئے عیسائی مبلغین اور ان کے دیکھا دیکھی بعض دُوسرے اشخاص اس پر مُصر ہیں کہ حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معجزہ دکھانے کا دعوٰی نہیں کیا اور نہ انھیں خداوند عالم کی جانب سے معجزات عطا کیے گئے۔ پادری فنڈر صاحب عیسائی نے اپنی کتاب "میزان الحق" میں اس پر کافی خامہ فرسائی

کی ہے۔

ابھی حال میں ایسے ہی اشخاص میں سے ایک نے اس بارہ میں قرآن کی ۱۴ آیتوں سے استدلال کی کوشش کی ہے مگر جب ہم ان لوگوں کی استدلالی کائنات پر غور کرتے ہیں تو اُس کی حقیقت صاف معلوم ہو جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ تمام انبیاء کے معجزے یکساں نہیں رہے بلکہ ہر نبی کو حکمت و مصلحت کے اعتبار سے مخصوص معجزات عطا ہوئے جو اُسی نبی سے خاص ہیں ہمارے رسُولؐ کو بھی خدا کی طرف سے وہ معجزات عطا ہوئے جو آپ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔

مشرک لوگ عناد اور تعصب سے ان تمام معجزوں سے سرتابی کرتے ہوئے کبھی مضحکہ کے انداز پر اور کبھی بہانے کے طور پر نئے نئے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے حقیقت طلبی کے جذبہ سے نہیں بلکہ صرف اپنے انکار کی سخن پروری کے لیے اور کبھی یہ چاہتے تھے کہ بالکل وہی معجزے جو سابق انبیاء کو مل چکے ہیں وہ ان کو بھی دیے جائیں ان کے جواب میں کبھی یہ کہا گیا کہ یہ معجزات پہلے انبیاء پر آ چکے ہیں اور لوگوں نے تکذیب کی۔ پھر اب انھی معجزات سے کیا فائدہ (وما منعنا ان نرسل بالاٰيات الا ان كذب بها الاولون) اور کبھی یہ کہا گیا کہ اگر یہ معجزے دیکھیں گے تب بھی ایمان نہیں لائیں گے (وما يشعركم انها اذا جاءت لا يؤمنون) اور کبھی یہ کہا گیا کہ معجزے تمہارے سامنے موجود ہیں اگر تم ایمان لانا چاہو تو وہ کافی ہیں "قد بيّنّا الاٰيات لقوم يوقنون" حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر فرد کی فرمائش پر معجزہ ہی ہونے لگے تو معجزہ بازیچہ اطفال بن جائے اور اس کی غیر معمولی عظمت و اہمیت باقی ہی نہ رہے۔

یقیناً آیات اور معجزات کا پیش کرنا صرف لوگوں کی طلب پر نہیں ہوتا بلکہ خود نبی و رسول کی مرضی پر بھی نہیں ہوتا، وہ صرف خداوند عالم کی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ارشاد ہوا ہے۔

وما كان لرسول ان يأتى باٰية الا باذن اللّٰه۔

کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ کسی آیت کو ظاہر کرے مگر خدا کے حکم سے۔

اور اسی کو خاص انداز سے رسول کو مخاطب کرکے ارشاد کیا جس سے درحقیقت عام لوگوں کی تنبیہ مقصود ہے۔

وان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبتغى نفقا فى الارض او سلّما فى السّماء فتأتيهم باٰية۔

اگر تم پر (اے رسول) اُن کی روگردانی بہت سخت ناگوار گذرتی ہے تو اگر تم میں قدرت ہو زمین میں کوئی سرنگ لے جانے یا آسمان پر سیڑھی لگانے کی تو ایسا کرو اور کوئی آیت پیش کرو ایسی کہ جس سے یہ لوگ ضرور ہی ایمان لے آئیں)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی پیش کی ہوئی آیتیں ان کے ایمان لانے کے لیے بے کار ثابت ہوئیں تو اب رسول کے امکان میں نہیں ہے کہ ایسی آیت پیش کریں جس سے وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں اور رسول کی زبانی ان لوگوں کے مختلف مطالبات کے جواب میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ سبحان اللّٰه هل كنت الا بشرا رسولا "پاک ہے خدا کی ذات، کیا میں کچھ اور ہوں سوائے ایک انسان کے جو رسالت کے عہدہ پر مقرر ہوا" یعنی میں پابند

ہوں خدا کے ارادہ کا اور اس کے خلاف نہیں کر سکتا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے " واذا لم تأتھم باٰیة قالوا لولا اجتبیتھا قل انما اتبع ما یوحیٰ الیّ من ربی ھذا بصائر من ربکم وھدی و رحمة لقوم یؤمنون " جب تم کوئی خاص آیت پیش نہیں کرتے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے اسی آیت کو پیش کرنے کیلئے کیوں نہ منتخب کیا ؟ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے دوسری آیتیں پیش ہو چکی تھیں) کہو کہ میں تو وحی ربانی کا پابند ہوں، یہ تمھارے پروردگار کی بصیرت افروز نشانیاں اور مومنین کی ہدایت و رحمت کے ذریعے موجود ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ جس آیت کا مطالبہ جس وقت ہو وہ ضرور ہی اس کی خواہش کے مطابق پیش کر دی جائے لیکن یہ اُس وقت ہے کہ جب خداوند عالم کی طرف سے درحقیقت ایسے آیات و معجزات پیش ہو چکے ہوں جو بجائے خود اس نبی کی حقانیت کی دلیل ہیں لہٰذا کسی شخص کے دعوائے نبوت کے بعد مطلق معجزہ کا مطالبہ حق بجانب ہوگا۔ لیکن مطلق معجزہ کے بعد کسی معجزہ خاصہ کا مطالبہ ؟ نہیں لہٰذا ایک طرف مذکورہ بالا آیات سے عیسائی حضرات کی مطلب برآری کہ حضرت رسولِ اکرم کو مثل انبیائے سابق معجزات ملے ہی نہیں تھے ورنہ آپ معجزہ کی خواہش کو اس طرح مسترد کیوں کرتے ؟ ہرگز صحیح نہیں ہے اور دوسری طرف ہمارے بہائی اور قادیانی احباب کا یہ استدلال کہ نبی و رسول کے لیے معجزہ کی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی کو نبی سے معجزہ کے مطالبہ کا حق ہے پھر معلوم نہیں نبی پر ایمان کیوں لایا جائے اور راست اور دروغ کا امتیاز کیونکر ہو ؟

قرآن مجید کا اعجاز

تمام اُن معجزات سے قطع نظر کر کے جو وقتی حیثیت رکھتے تھے اور مثل دیگر انبیاء و مرسلین کے معجزات کے کسی خاص غیر معمولی حیثیت کے مظاہرہ پر مشتمل تھے خود قرآن مجید اس کلام خاص کو بطور اعجاز

---

[1] لطف یہ ہے کہ انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ (یسوع مسیح) کا معجزہ کا مطالبہ پر نہ صرف انکار کرنا بلکہ معجزہ کی خواہش کرنے والوں کو سخت و سست کہنا اور اپنے پاس سے نکال دینا اور یہ تصریح کرنا کہ اس زمانے والوں کو کوئی نشانی نہ دکھلائی جائے گی مذکور ہے ملاحظہ ہو انجیل مرقس باب نمبر ۱۱۔ ۱۲ پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے اور اسے آزمانے کے لیے اس سے کوئی آسمانی نشانی طلب کی۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں ؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا اور وہ انھیں چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھا اور پار چلا گیا " انجیل متی باب ۲ نمبر ۳۸۔ ۳۹ بعض فقیہوں اور فریسیوں نے اس سے کہا اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں اس نے جواب دے کر ان سے کہا کہ اس زمانے کے بُرے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا " انجیل یوحنا باب ۶ نمبر ۳۰۔ ۳۵ انھوں نے اس سے کہا پھر تو کونسا نشان دکھاتا ہے تاکہ ہم دیکھ کر تیرا یقین کریں ؟ تو کونسا کام کرتا ہے ؟ ہمارے باپ دادوں نے بیابان میں من کھایا چنانچہ لکھا ہے کہ اس نے انھیں کھانے کے لیے آسمان سے روٹی دی یسوع نے اس سے کہا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ موسیٰ نے تو وہ روٹی آسمان سے تمھیں نہ دی لیکن میرا باپ تمھیں آسمان سے حقیقی روٹی دیتا ہے کیونکہ خدا کی روٹی وہ ہے جو آسمان سے اتر کر دنیا کو زندگی بخشتی ہے انھوں نے اس سے کہا اے خداوند یہ روٹی ہم کو ہمیشہ دیا کر یسوع نے اس سے کہا زندگی کی روٹی میں ہوں جو میرے پاس آئے وہ ہرگز بھوکا نہ ہوگا اور جو مجھ پر ایمان لائے وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عیسیٰ نے طلب معجزہ کی بات کو حیلہ حوالہ سے ٹال دیا ہے اور ان کی خواہش کو پورا نہیں کیا ہے۔ انجیل لوقا باب ۲۳ نمبر ۸۔ ۹ ہیرو دلیس یسوع کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ مدت سے اس کے دیکھنے کا مشتاق تھا اس لیے کہ اس کا حال سنا تھا اور اس کا معجزہ دیکھنے کا امیدوار تھا۔ اور وہ اس سے بہتیرے پوچھتا رہا مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔

پیش کیا گیا اور دلیل نبوت رسالتمآب [2] قرار دیا اور تمام دنیا کے لبوں پر مہر سکوت لگی رہی اور کسی کو اس دعوے کے خلاف زبان کشائی کی مجال نہ ہو سکی۔ قرآن نے بلند آواز سے فضائے عالم کی خاموشی اور اس خاموش فضا کے سناٹے کو اپنی سچائی کا ثبوت قرار دیا اور ارشاد ہوا۔ " ام یقولون تقوله بل لا یؤمنون فلیأتوا بحدیث مثله ان کانوا صٰدقین۔ " کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے رسولؐ نے اپنے دل سے بنا لیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو ایمان لانا نہیں ہے اس لیے ایسی باتیں بناتے ہیں اچھا تو پھر ایسی بات چیت یہ بھی بنا لائیں اگر یہ سچ کہتے ہیں "۔ اور عقل رکھنے والوں کو اس نے آواز دی اس طرح کہ ان کے دلوں پر اثر ڈالے " افلا یتدبرون القراٰن ام علی قلوب اقفالھا " یہ لوگ آخر قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے ؟ یا حقیقت میں ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں "۔ اور اپنی مخاطب دنیا کی عاجزی پر رحم کھاتے ہوئے پورے قرآن سے اپنے مطالبہ کو تھوڑے حصہ کی طرف منتقل کیا اور کہا " ام یقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثله مفتریات وادعوا من استطعتم من دون الله ان کنتم صادقین فالم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم الله و ان لا اله الا ھو فھل انتم مسلمون " کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول نے اس کو اپنے دل سے گڑھ لیا ہے ؟ کہو کہ اچھا تم دس ہی سورے ایسے گڑھے ہوئے بنا کر لے آؤ اور خدا کے علاوہ جس جس کو چاہو اس کو بلا کر پیش کرو اگر سچے ہو۔ اگر یہ لوگ تمھارے اس مطالبہ کو پورا نہ کریں تو یقین سمجھو کہ یہ خدا کے علم و حکمت کے ساتھ نازل ہوا ہے اور یہ کہ سوا اُس معبود برحق کے کوئی خدا نہیں ہے تو کیا اب بھی تم اسلام نہ لاؤ گے ؟ "

جب سکوت کا دور دورہ رہا اور خاموش فضائے بالکل عاجزی کا اقرار کر لیا تو زحمت کم کر دی گئی۔ غرور و خود بینی کو ایک اور ٹھوکر لگائی گئی اور دس سورتوں کے بجائے صرف ایک سورہ کا مطالبہ کیا " وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شھداءکم من دون الله ان کنتم صادقین "۔

یہ تمام اعلانات کیے گئے اور باآواز بلند دنیا کو متوجہ کیا گیا لیکن دنیا پر ایک سکوت کا عالم طاری رہا اور " صدائے برنخواست " کا نقشہ رہا اسوقت اس نے اپنے زلزلہ افگن اور لرزہ انداز لہجہ میں للکار کر اعلان کیا :۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القراٰن لا یأتون بمثله و لو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

" کہدو اے رسول کہ تم کیا ہو ؟ اگر تمام انس و جن جمع ہو کر یہ چاہیں کہ اس قرآن کا مثل پیش کریں تو ہرگز اس کا مثل نہ لا سکیں گے چاہے وہ باہم ایک دوسرے کے پشت پناہ اور معین و مددگار بن گئے ہوں "۔

" عرب کی تمام گردنیں جھکی رہیں اور دہنوں میں قفل لگے رہے کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

اسے معمولی بات سمجھ کر سرسری طور سے ٹالدینے والے صبر و سکون کے لمحوں میں غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ صورت حالات پر نظر نہیں ڈالتے، عرب کے طبائع اور نفسانی حالات کا احساس نہیں کرتے واقعات و خصوصیات مقام پر نگاہ نہیں کرتے، سنو ذرا اور غور سے سنو۔

خدا کا رسول (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب کے قبیلۂ قریش میں بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ باپ اور ماں

دونوں طرف سے یتیم ہے اور نہ کسی سے تحصیل علم کرتا نہ ادبیات کی تکمیل کرتا اور نہ کبھی نظم و شعر اور انشاپردازی کا کوئی مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے علم و یقین میں پورے طور سے امّی اور ان پڑھ ہے اُسے وہ نظم و شعر کی قوت تک حاصل نہیں ہے جو عرب کے اکثر افراد کو حاصل ہوا کرتی تھی اور جس کو وہ اپنا خاص جوہر امتیاز سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف اُن میں ایسے ایسے افراد موجود تھے جو فصاحت و بلاغت کے خداوند اور نظم و شعر و کلام کے مستقل فرمانروا سمجھے جاتے اور اپنے کو سمجھتے تھے، وہ انداز گفتگو اور طریق بیان و انواع کلام کے متعلق نظر ناقد بھی ایسی رکھتے تھے کہ کلام کے تمام پہلو اور اطراف و جوانب کا احساس کرتے اور اس کے تمام نکات و اسرار پر حاوی ہو جاتے تھے۔

اس کے ساتھ ان میں وہ خاص حمیت نفسانی اور غیرت فطری بھی موجود تھی جو ضرب المثل کے طور پر دنیا میں مشہور اور خلق کی زبان زد ہے۔

وہ اپنے ذلت آمیز ٹوکے جانے کے موقع پر شیر کی طرح بپھرتے اور چیتے کی طرح حملہ کرتے تھے اُن کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا اور اُن کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جاتی تھی۔ جب تک اپنے مقابل کو شکست نہ دے دیں اور اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لیں اُن کا جوش طبعی کم نہ ہوتا تھا۔ اُن میں ابوطالب کا پرورش کردہ اسی قوم کا پالا پوسا سا یتیم بچہ کھڑا ہوتا اور اُن کو کلمۂ توحید کی طرف دعوت دیتا، اُن کے اُن خداؤں کو جن کی عبادت پر اُن کے آباؤ اجداد کی عمریں ختم اور خود ان کی پشتیں پشتیں خمیدہ ہوئی تھیں، وہ برا کہتا، ان کی عظمت و اہمیت کم کرتا اور ان کی خدائی سے انکار کرتا ہے۔

یہ ان کے دلوں پر تلوار سے زیادہ مؤثر اور نیزوں کے وار سے زیادہ کاری زخم کی حیثیت رکھتا اور انتہائی تکلیف دہ تھا، وہ اس تبلیغ کرنے والے کو ہر طرح کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ ارشاد ہوا ما اوذی نبی قط کما اوذیت کسی نبی کو اتنی تکلیف نہیں پہونچائی گئی جتنی تکلیف مجھے دی گئی۔

ان لوگوں نے ایسے تمام تدابیر اختیار کیے جن کے ذریعہ سے رسُولؐ کی زبان بندی کی جا سکے، ڈرایا، دھمکایا، ابوطالب کو واسطہ قرار دیا اور فہمائش کرائی۔ ترک موالات اور قطع معاملات کیا، ہنسی مذاق میں اڑایا اور تمسخر و استہزا کیا، پتھر مارے اور کوڑا پھینکا، مال و دولت کی لالچ دلائی اور حرص و طمع کے جذبہ سے فائدہ اٹھانا چاہا، جب یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو پورے طور سے آپ کا چراغ گل کرنے اور آپ کا نام و نشان محو کرنے پر تیار ہو گئے، جلسہ کیا، مسئلہ پر غور کیا اور تمام قبائل عرب میں سے خونخوار جوان منتخب کر کے رسُولؐ کے قتل کا منصوبہ باندھ لیا، گھر کو گھیر لیا اور پورے طور سے محاصرہ کر لیا۔

بے شک خدا نے حفاظت کی اور اپنی حمایت خاص کے پردہ میں رسُولؐ کو چلے جانے پر مامور کیا، رسُولؐ نے شہر چھوڑ دیا وطن سے جدائی اختیار کی، گھر بار اور خانہ کعبہ کا جوار سب کو اُن کے حوالہ کیا۔

اس پر بھی اُن کی کینہ پروری و عداوت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، آپ کے چند ساتھی جو مکہ میں رہ گئے تھے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں اور بعض کو اُن میں سے قتل کیا۔ خود آپ سے جنگ کے لیے آپ کے محل قیام یعنی مدینہ منورہ پر فوج کشی کی اور بار بار آپ پر حملہ کیا، ہر مرتبہ خدا نے انھیں شکست دی اور ہر بار جان و مال اور بڑے بڑے بہادر جوانوں کو ہاتھ سے کھو کر انھیں واپس ہونا پڑا۔

بدر کی شکست کا ایسا سخت اثر پڑا کہ عہد کیے گئے کہ کوئی شخص عورتوں کے قریب نہ جائے گا راحت و آرام سے دوچار نہ ہوگا، عورتیں سوگ کے کپڑے نہ اُتاریں گی، بالوں میں کنگھی نہ کریں گی جب تک مقتولین بدر کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے۔ یہ جنگ کی کاوش کا خاص نتیجہ تھا کہ اب کی عورتوں اور بچوں کی معیت میں میدان جنگ کا قصد کیا گیا تھا جو فرار کے وقت پیروں کی بیڑیوں کا کام دیں اور میدان جنگ میں ٹھہرنے پر مجبور رکھیں۔

وہ مردوں کو غیرت بھی دلاتی اور پست ہمتوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتی تھیں۔ لیکن اس جنگ کا بھی انجام مشرکین کے لیے اچھا نہ ہوا اور انھیں ناکامیاب واپس جانا پڑا، اب قریش کو اپنی انفرادی طاقت سے کامیابی حاصل کر سکنے میں ناامیدی ہو گئی تھی اس لیے تیسری مرتبہ انھوں نے آخری کوشش صرف کر دی کہ قبائل عرب کو جن میں یہودی بھی داخل تھے اپنے ساتھ متحد و متفق کر کے اجتماعی طاقت سے رسُولؐ کا مقابلہ کریں۔

یہ جنگ خندق ہے جس کا نام اسی وجہ سے جنگ "احزاب" ہوا ہے کہ اس میں تمام جماعتیں کفر کی متفق ہو کر برسرپیکار ہوئی تھیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ ہوا۔ ان کا ہزار کے مقابلہ میں اکیلے لڑنے والا بہادر عمرو بن عبدود تلوار کے گھاٹ اترا اور بڑی ذلت سے تمام افواج کو پسپا ہونا پڑا۔ پس یہ آخری جنبش تھی جس کے بعد ہمیشہ کے لیے ہمتیں پست ہو گئیں اس کے بعد مشرکین قریش سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی ہے، جو کچھ لڑائی ہوئی ہے وہ یہود خیبر یا بنی ہوازن وغیرہ کے قبیلوں سے جو مکہ کے باہر تھے۔

اب مشرکین اپنی تمام ناکامی اور مایوسی کے ساتھ مکۂ معظمہ میں مقیم رہے اور رسولؐ کی ترقیوں اور کامیابیوں سے کینہ و فساد کی آگ اُن کے دلوں میں شعلہ ور رہی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُس وقت جب رسالتمآبؐ نے بارادۂ حج مکہ معظمہ کا سفر کیا اور چاہا کہ طواف خانہ کعبہ کریں تو وہ لوگ آپ کے داخلہ مکہ سے مانع ہوئے اور آپ حدیبیہ میں صلح کر کے واپس چلے آئے لیکن مشرکین ان شرائط پر پورے طور سے قائم نہیں رہے جس کے نتیجہ میں رسالتمآب کو پھر مکہ پر حملہ کرنا پڑا اور فاتحانہ شان سے مکّہ میں داخل ہوئے، اکثر مشرکین نے بخوف و دہشت اسلام قبول کیا اور اٹھی ہوئی گردنیں پست ہو گئیں، انتہائی ذلت و حقارت نصیب ہوی۔ اتنی لڑائیاں اتنی مصیبتیں اتنے نقصانات اتنے خسارے برداشت کیے، لیکن قرآن پہلے ہی دن سے اُن سے انصاف کا طالب اُن کی ان تمام زحمتوں اور مشقتوں کا معمولی سا آسان حل پیش کر رہا تھا، وہ اُن سے صرف ادبی مقابلہ کا طالب تھا اور اپنے پورے مجموعہ نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹے کسی سورے کا جواب مانگ رہا تھا۔

اور بات ایسی نہ تھی جو ان کے زبردست علم و فن سے بے تعلق اور اُن کے حدود اقتدار سے خارج ہوتی، جس میں انھیں اس عذر کا موقع ہوتا کہ ہم اس علم کو کیا جانیں، بلکہ بات اُسی نوعیت کی تھی جس میں ان کو انتہائی کمال و اقتدار کا دعویٰ تھا۔ یقیناً اگر اُن میں قدرت ہوتی تو وہ قرآن کے مطالبہ کے مطابق عوض جنگی ہنگامہ آرائی کے ادبی معرکہ آزمائی کرتے صفوف لشکر کے بدلے سطروں کی صفیں قائم کرتے، تلوار کے بجائے قلم کے جوہر دکھلاتے اور جلسے محفلیں اور کانفرنسیں منعقد کر کے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرتے۔ اس صورت میں اسلام کی آواز پست، اس کی صدا خاموش اور اُس کا چراغ گل ہو جاتا۔ خونریزی کی نوبت نہ آتی، جنگ آزمائی کی ضرورت نہ پڑتی اور شورش اور ہنگامہ کی صورت پیدا نہ ہوتی۔

لیکن جب اُنھوں نے قرآن کے پے درپے تازیانوں کے باوجود اس میدان سے گریز ہی پسند کیا اور حرب و ضرب جنگ و جدل کو اس کے تمام مہلک نتائج کے باوجود مقابلہ کے لیے اختیار کیا تو اس سے اُن کی عاجزی، بے بسی اور پست ہمتی کا راز طشت از بام اور مقابلہ کے میدان میں اُن کی بے دست و پائی کا منظر بالکل نمایاں ہو گیا، پھر جب وہ باوجود اس اقتدار خاص اور کمال کے قرآن کے مقابلہ میں عاجز رہے تو دوسرے کو مجال دم زدن کہاں ہو سکتی ہے۔

اور پھر اس پر حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کو چودہ سو برس کے قریب ہونے آتے ہیں اور قرآن اُسی ایک آواز سے اپنی مقابل دنیا کے ہر طبقہ کو صدا دے رہا ہے اور للکار رہا ہے اور عالم کی فضا اُس کے دعوائے بے مثالی سے گونج رہی ہے اور اس کے مخالف اپنی تحریک کی اشاعت اور قرآن کے تعلیم کی پامالی میں سلطنتوں کی طاقت، مال و دولت کا زور اور گرانقدر خزانوں کا سرمایہ صرف کرتے رہے ہیں۔ لیکن قرآن کی آواز (لا یأتون بمثلہ) آج تک سچی ہے اور ہمیشہ سچی رہے گی۔ قرآن کی مخالف کوئی ایک جماعت تھوڑی تھی لا مذہب جماعتیں یعنی ملاحدہ زنادقہ و دہریے ایک طرف اور اہل مذاہب جو قرآن کے خلاف تھے اور ہیں جیسے یہود نصاریٰ مشرکین وغیرہ دُوسری طرف اور قرآن کے بعد حادث ہونے والے مذاہب اور ان کے بانیاں تیسری جانب، ان میں سے ہر ایک اسلام کے خلاف ہر طرح ہی کی کوششیں کرتے رہے اور قرآن کے خلاف ہر ایک جماعت ہی کی طرف سے مخالفتوں کے طوفان برپا رہے، یہاں تک کہ قرآن مجید پر (بزعم خود) ادبی اعتراضات کیے گئے۔ یہ ہوا کہ قرآنی واقعات کو بخیال خود مشکوک ثابت کیا گیا، یہ ہوا کہ قرآن کے مضامین کو کتب سابقہ سے ماخوذ بتایا گیا، یہ ہوا کہ قرآن میں مسلمانوں کی کتابوں سے تحریف کا ثبوت پیش کیا گیا، غرض ہزار ندبوجی حرکتیں کی گئیں مگر یہ نہ ہوا کہ کبھی ان میں سے (حالانکہ ان میں اہل زبان بھی رہے، بلند پایہ ادبا اور عربی زبان میں کوس لمن الملکی بجانے والے اہل قلم بھی رہے) کوئی ایک ایسا کرتا کہ قرآن کے کل نہیں بعض کا اُسی اسلوب و طریقہ کے ساتھ انہی خصوصیات کا حامل جواب تحریر کر دیتا میں سچ کہتا ہوں کہ وہ جواب اگرچہ کسی ایک مذہب یا جماعت کا نتیجہ قلم ہوتا مگر تمام مذاہب اور جماعتیں جو مخالفت قرآن میں یقینی ملت واحدہ کی حیثیت رکھتی تھیں اس کی حفاظت اور نقل و اشاعت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتیں، بلکہ اگر وہ بالکل اس کے مثل نہیں، کچھ اس کے لگ بھگ اور تھوڑا سا قریب بھی ہوتا تو یہ لوگ اپنے تعصب سے اُس کمی کو نظر انداز کر کے اُسے قرآن سے بھی زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور سب مل کر یہ کہتے کہ قرآن کا دعویٰ غلط ہو گیا۔ اور پھر موجودہ زمانہ تو علمی انکشافات کا ہے ریسرچ کا دور ہے۔ موجودہ دور کے علماء تو کسی مخاصمت کی بنا پر نہیں بلکہ ایک علمی انکشاف اور تحقیق ہی کی بنا پر ایک ایسی کتاب کو جو قرآن کے مقابلہ میں دنیا کے کسی خطہ میں بھی لکھی گئی ہوتی بڑی سرگرمی سے شائع کر کے اپنی علمی خدمت پر ناز کرتے، اگر ایسا نہیں ہوا اور جن جن نے اس طرح کی کوشش کی ان کے یک بیک نام تاریخ نے ہم تک پہونچا کر اُن کی ناکامی بلکہ ابدی موت کی بھی اطلاع دے دی اور اس طرح کی کوئی خدمت بھی کبھی انجام دی گئی تو وہ ایسی ہی کہ خود مخالفین اسلام کو اُسے اپنے ثبوت میں پیش کرنے سے پہلی ہی نظر میں شرما کر سر جھکا دینا پڑا تو صاف ثابت ہوا کہ قرآن کے مقابلہ میں دنیا کی طاقت حقیقۃً قاصر تھی، قاصر ہے اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ ہمیشہ قاصر رہے گی۔

یہ ہے قرآن مجید کا اعجاز جس کو دنیا زبان سے جھٹلائے لیکن اس کا دل اعتراف کرے گا اور ظاہر میں اس کو تسلیم نہ کرے

لیکن اس کی عاجزانہ سپر اندختگی خود اُس کی قلبی مرعوبیت کا اعلان کر دے گی۔

سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز

تمام انبیاء آیات و بینات یعنی معجزات کیساتھ مبعوث ہوئے لیکن اُن کی نبوتوں کے چراغ خاموش ہو گئے اس لیے کہ اُن کی بنیاد ایسے معجزات پر تھی جو فنا ہونے والے اور اپنے وجود کو ماضی کے سپرد کر کے مستقبل میں بے نام و نشان قرار پا جانے والے تھے۔ وہ اگرچہ اپنے وقت پر لوگوں کے سر تسلیم خم کرانے اور اتمام حجت کر دینے کے لیے کافی بھی تھے تو کچھ عرصہ کے گذرنے کے بعد ان کی صحت و واقعیت روایات اور مختلف المضمون حکایات کی رہین منت ہو گئی جو اگر قریبی زمانہ میں قرائن کی موجودگی کے باعث قطعی و یقینی بھی تھی تو اور زیادہ مدت کے بعد وہ مشکوک اور پھر موہوم کے درجہ پر پہنچ گئی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر یہود سے موسیٰ کی نبوت کا ثبوت کوئی شخص منکر ہو کر طلب کرے اور عیسائیوں سے عیسیٰ کی نبوت کا اسی صورت سے تو انھیں سوائے خموشی کے چارۂ کار نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی کوئی نشانی غیر معمولی طور پر زندہ جاگتی ہوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ موجودہ زمانہ میں ان کی تصدیق کا کوئی عقلی ذریعہ موجود ہے اور یہی بہت بڑی نشانی ہے اس امر کی کہ اُن کی نبوتیں محدود دور زمانہ سے متعلق تھیں جس کے بعد براہ راست ان کی نبوتوں پر ایمان لانے اور اُن کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہی نہیں باقی ہے۔ تاکہ بلا واسطہ اُن کے دلائل نبوت و وجہ حقانیت کے وجود کی ضرورت باقی ہوتی بے شک ان کے بعد آنے والے نبی کے ایمان کے بعد جس نے تصدیق کر دی ہو اپنے ماقبل دوسرے انبیاء کی خود بخود ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہو گا. مگر یہ ایمان ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے لیے وہی دلائل و بینات جو نبی مابعد کی حقانیت و صداقت کے لیے موجود ہیں پورے طور سے کافی ہیں لیکن کسی نبی نے ایسا معجزہ اپنے بعد نہیں چھوڑا جو تمام اہل عالم کے سامنے رکھ دیا جائے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے زمانہ کے ذرائع اور اپنے ترقی یافتہ دماغوں کے معیار سے اُس کو جانچ سکیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر سکیں۔

بس ایک پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنھوں نے معجزہ ایسا پیش کیا جو آپ کی نبوت کے لیے ہر دور میں دلیل حسی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر زمانہ میں حضرت کی نبوت کو تقلیدی حیثیت سے نکال کر تحقیقی دائرہ میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ قرآن ہے جس کے زیر دامن پیغمبر کی نبوت کا چراغ انقلابات زمانہ کی ہزاروں آندھیوں میں بھی روشن ہے، وہ اپنے اعجاز کی روح کو لیے ہوئے ہر انسان کو پکار کر غور و خوض کی دعوت دیتا ہے اور ہر ادیب جو قرآن کو سمجھ سکتا ہے وہ چاہے وہ ایمان والوں میں سے نہ ہو مگر پہلی نظر میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک زندہ زبان کے ایک اہم کارنامہ سے روشناس ہے اور اگر یہی دلچسپی اس کو کچھ زیادہ غور پر آمادہ کر دے تو بالآخر یقین کرے گا کہ وہ ایک زندہ نبوت کی زندہ دستاویز کا محافظ ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگرچہ ضروریات انسانی صدیوں بلکہ برسوں کے گذرنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مگر قرآن نے جو اصول زندگی اور اخلاق و فضائل کے معیار مقرر کر دیئے ہیں وہ صدیاں گزرنے کے باوجود عملی زندگی کا مکمل خاکہ

بن سکتے ہیں اور اس کے سچے ماننے والے ہر دور میں اُس کی مجسم تصویر پیش کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ تو صاف طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کسی گذرے ہوئے زمانہ کی نشانی یا دورِ ماضی کی یادگار ہی نہیں ہے بلکہ وہ عملی زندگی کا ایک دائمی دستور العمل ہے جو اس لیے اتارا گیا ہے کہ ہر بلند نفسِ انسانی اس کے معانی کا ایک زندہ مجسمہ یا اس کتاب کا ایک نسخہ بن جائے اور یہ کتاب صرف کتاب نہیں بلکہ ان تمام عملی انسانوں کی مکمل تصویرِ زندگی ثابت ہو کیا اس سے بڑھ کر کوئی زندہ معجزہ ہو سکتا ہے؟

یقیناً حضرت محمد مصطفیٰؐ کے لیے بہت سے غیر معمولی خارق عادات یعنی سابق زمانہ کے انبیاء کو ملنے والے وقتی معجزات بھی ظاہر ہوئے تھے جو کبھی مشرکین کے مطالبہ پر اتمام حجت کے طور پر (جیسے معجزہ شق القمر) اور کبھی بغیر کسی اہمیت پیدا کیے ہوئے صرف اقتدار روحانی کے سبب موجودہ ضروریات کی بناء پر (جیسے رجعت شمس) ظاہر ہوئے لیکن حضرت کی نبوت و رسالت کی بنیاد ان معجزات پر نہیں تھی بلکہ ان میں سے اکثر خوارق عادات کے اصطلاحی حیثیت سے تعریف معجزہ میں داخل ہونے میں بھی تامل کی گنجائش ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح موسیٰ کا برہان خصوصی ثبوت نبوت کے متعلق اژدہا بن جانے والا عصا اور چمک دینے والا ید بیضا تھا کہ جب پوچھا جاتا کہ آپ کی نبوت کی دلیل کیا ہے وہ اپنے عصا کو پھینک دیتے، اپنے چمکتے ہاتھ کو دکھاتے۔ جس طرح عیسیٰ کا برہان خصوصی ابراء اکمہ و ابرص، احیاء موتی، چڑیا کا پتلا بنا کر اس کو اڑا دینا اور خبر دینا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کتنا تمہارے گھروں میں رکھا ہے، یہ تمام امور تھے اور جب اُن سے دلیل نبوت دریافت کی جاتی تو وہ ان امور کو پیش کرتے، اس طرح ہرگز ہمارے رسولؐ کا برہان خصوصی آپ کا معجزہ شق القمر نہیں تھا کہ جب آپ سے آپ کی نبوت کی دلیل دریافت کی جاتی آپ اُس کے ثبوت میں شق القمر کے معجزہ کو پیش کرتے، ہرگز نہیں وہ چیزیں جو دوسرے انبیاء کے یہاں سرمایہ نبوت اور خزانہ ثبوت رسالت تھیں ویسی چیزیں ہمارے رسولؐ کے لیے بالکل سرسری اور ضمنی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ کے دور رسالت میں یہ کوئی اہم واقعہ نہیں تھا کہ آپ سے کسی موقع پر کسی جماعت نے یہ خواہش کی کہ ہمیں چاند دو ٹکڑے ہوتے دکھائی دے اور آپ نے دکھا دیا۔

یا آپ کے وصی کو وحی الٰہی کی خاطر نماز میں تاخیر ہوئی تو ڈوبتا ہوا آفتاب واپس ہوا، یہ چیزیں ان حضرات کے معمولی آثار زندگی اور واقعات حیات میں ایک جزئی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کو کبھی ثبوت رسالت میں پیش کیا جانا ہماری نظر سے نہیں گذرا ہرگز رسالتمآبؐ یا ان کے وصی حقیقی نے ان واقعات کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ کبھی اگر اپنی رسالت اور حقانیت کا ثبوت پیش کرنا ہو تو وہ ان واقعات کا حوالہ دیں اور کہیں کہ ہماری حقانیت کا یہ ثبوت ہے کہ فلاں تاریخ ہمارے لیے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے یا فلاں تاریخ ہمارے لیے آفتاب نے رجعت کی۔ یہ مخالفین اسلام کی ایک چالاکی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اگر بخیال خود ان کی کمزوری کو طشت از بام کرنے کے لیے اس قسم کے واقعات کو معرض بحث بناتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اصولی بحثیں دب جائیں اور ہم مسلمانوں کے عقاید کو اپنے نزدیک مجموعہ اوہام و خرافات ثابت کر کے زندہ دل دنیا کو تھوڑی دیر ہنس لینے کا موقع دیں۔

مجھے سخت افسوس ہوگا اگر مسلمان محققین ان اشخاص کی اس چالاکی کا شکار ہو جائیں اور وہ ان مباحث کو اپنے

مذہب کی اصل بنیاد سمجھ کر ان کے اثبات اور اُن کے اُوپر رد و قدح میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں۔

بے شک جیسے اکثر تاریخی واقعات کی نقلی اور عقلی ہر حیثیت سے جانچ کی جاتی ہے اسی اعتبار سے جب اس کا موقع آئے تو ان واقعات کی بھی علمی تحقیقات کر لی جائے جس کے لیے صرف دو بنیادی نگاہیں کرنا ہوں گی ایک یہ کہ واقعہ حقیقۃً غیر ممکن الوقوع اور عقلاً محال تو نہیں ہے؟ دوسرے بر صورت امکان وہ روایات جن سے ان کے وقوع کا پتہ چلتا ہے کس حد تک قابل تسلیم ہیں۔ اگر یہ امور غیر ممکن حیثیت نہیں رکھتے اور صحیح سچے راویوں نے اُن کے وقوع کی خبر دی ہے تو صرف عام طور سے ایسا نہ ہونا اور ان کا غیر معمولی ہونا ان کے عدم کی دلیل نہ ہوگا۔ بہرحال یہ ایک واقعاتی تحقیقات ہوگی جس کو مذہب کے اصول سے کوئی تعلق نہیں ہے ما سلام نہ صرف واقعہ رجعت شمس کا رہین منت ہے اور نہ معجزہ شق القمر کا۔

بلکہ اسلام اپنی صداقت و حقانیت کے لیے ہزاروں، لاکھوں معجزوں کا ایک معجزہ رکھتا ہے۔ جس کا نام ہے قرآن

بلاشبہ مسلمانوں کا سرمایۂ حقانیت، سرچشمہ صداقت، بنیاد دین و مذہب جو کچھ ہے وہ یہی قرآن ہے۔

قرآن کو جو امتیاز حاصل ہے وہ دنیا کے کسی معجزہ کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن ہمیشہ زندہ ہے اور رسولؐ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کو زندہ کیے ہوئے ہے۔

وہ عہد ماضی کا افسانہ نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ کے حال میں موجود ہے اور دنیا کو اپنی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

یہ اس کتاب کا ایک ثمرہ و فیض ہے کہ سابق انبیاء کی نبوتیں بھی مسلمانوں کے لیے قابل تسلیم اور لائق قبول ہو گئی ہیں ورنہ اگر قرآن میں موسیٰ و عیسیٰ وغیرہ کا تذکرہ نہ ہوتا تو کسی طرح موسیٰ اور عیسیٰ کی نبوت دائرہ احتمال سے نکل کر لحاظ یقینیات میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔

معجزۂ قرآنی کی ایک اور خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے معجزہ میں پائی نہیں جاتی یہ ہے کہ جتنے ارکان اعجاز کے ہیں ان سب کو وہ خود اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور مقدمات و قرائن خارجیہ یا صرف عقل کے سپرد نہیں رہنے دیا ہے دوسرے معجزات کی صورت یہ ہے کہ خارق عادت اور آنکھوں کے سامنے پیش ہوا لیکن اُس کے معجزہ ہونے میں جتنی باتوں کی ضرورت ہے وہ خود اُس میں مضمر نہیں ہیں، وہ ایک خاموش مشاہدہ غیبی ہے لیکن وہ اپنی زبان سے یہ نہیں اعلان کرتا کہ میرا ظاہر کرنے والا مدعی نبوت و رسالت بھی ہے جو ایک خارق عادت کے معجزہ ہونے کا رکن اعظم ہے اس کے لیے ضرورت ہوگی کہ علیحدہ سے اس شخص کے دعاوی کو دیکھا جاوے تو معلوم ہو کہ وہ مُدعی ہے نبوت کا یا نہیں؟

اس کے علاوہ وہ اس استدلال کو بتلا نہیں سکتا کہ خارق عادت کے ظاہر کرنے اور اس کے مظہر، مدعی نبوت کی سچائی میں کیا رشتہ ہے؟

اس کے لیے پھر عقل کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہے، کہ وہ دلیل کو ترتیب دے اور بتلائے کہ خارق عادت کا ظاہر کرنا کس طرح حقانیت و راستی کا یقینی ثبوت ہے۔

پھر وہ اسے بھی نہیں بتاتا کہ میرے ظاہر کرنے والے کے اوصاف و خصوصیات کیا ہیں؟ اور یہ بھی ثبوت اعجاز کا

ایک بڑا رکن ہے۔ اس لیے کہ ہم سابق میں تحریر کر چکے ہیں کہ اگر مدعی نبوت ایک ایسا شخص ہے جس کی سابقہ زندگی اور افعال و اعمال کی گندیدگی خود اس کے دعوے کے رد کرنے کے لیے کافی ہے تو اس صورت میں وہ لاکھ غیر معمولی کرتب دکھلائے کسی طرح خدا پر ذمہ داری عائد نہ ہو گی اور اُسے ان عجیب و غریب مظاہرات کو باطل کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

ان معجزات کے ساتھ یہ الگ سے اُس نبی کی سیرت، سابقہ و لاحقہ زندگی کے اعتبار سے دیکھنے کی ضرورت ہو گی کہ اُس کے افعال و اعمال و اقوال و تعلیمات کیسے ہیں اور وہ اس کو نبوت و رسالت کے دعوے کے لائق ثابت بھی کرتے ہیں؟ یقیناً وہ تمام معجزات ان تمام اعتبارات سے بالکل گنگ اور خارجی تحقیقات اور عقلی غور و فکر کے دست نگر و ممنون احسان ہوتے ہیں لیکن یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ وہ معجزہ ہے اور اعجاز کے جتنے ارکان و خصوصیات ہیں وہ سب اُسی میں موجود ہیں اور کہیں اُس سے علٰحدہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بحث ہمارے شیخ الحدیث اس دورِ آخر کے سب سے بڑے علامہ متکلم اور مجاہد ملی آیۃ اللہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ نے اپنی کتاب "آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن" میں تحریر کی ہے جسے ہم وہیں سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔

(پہلا امر) یہ ہے کہ قرآن مجید میں صاف صاف اپنے حامل حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دعوائے نبوت و رسالت کا اظہار موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آیاتِ ذیل۔

(۱) قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعًا (سورۂ اعراف)
کہو کہ اے گروہ مردم! میں خدا کا رسول ہوں تم سب کی جانب

(۲) ماضل صاحبکم وما غوٰی و ماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ (سورۂ نجم)
تمہارا ہدایت کرنے والا شخص نہ تو گمراہ ہے اور نہ سرگشتہ وہ اپنی خواہش دل سے کلام ہی نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کلام کرتا ہے۔

(۳) محمدٌ رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار۔ (سورۂ فتح)
محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت ہیں۔

(۴) ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین (سورۂ احزاب)
محمدؐ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن وہ خدا کے رسول اور فہرست انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔

(دوسرا امر) یہ کہ اُس نے اپنے غیر معمولی انداز اعجاز کو آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل بتلایا اور کہا کہ اگر تم کو ان کی سچائی اور حقانیت میں شک ہو تو اس کے مثل پیش کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو فاعلموا انہ انما انزل بعلم اللہ" تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

اس طرح اعجاز کے بعد استدلال عقلی کو اہل عقل کے متنبہ کرنے کے لیے ذکر کیا۔ اس پہلو کو تفصیل سے سابق میں تحریر کیا جا چکا ہے جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(تیسرا امر) یہ کہ اُس نے جناب رسالتمآبؐ کے اخلاق کی پاکیزگی اور کمال طہارت کو متعدد آیات میں ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آپ کی زندگی اخلاق حسنہ، سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ رہی ہے جس کی بنا پر آپ کے دعوے کی صحت میں کوئی عقلی خرابی نہیں پائی جاتی۔ ارشاد ہوا۔

انک لعلٰی خلق عظیم (سورہ قلم)
آپ بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں۔

ودّوا لوتدھن فیدھنون
ان لوگوں کو یہ آرزو ہے کہ آپ سے کسی مدرنگی کا ظہور ہو تو یہ بھی مدرنگی سے کام لیں۔

نیز آپ کے تعلیمات کی پاکیزگی کے متعلق ارشاد کیا۔

یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر (سورۂ اعراف)
وہ اُنھیں اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

اور خود اپنے مندرجہ تعلیمات پر اہل نظر کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع دیتے ہوئے ارشاد کیا۔

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ (سورۂ بنی اسرائیل)
یہ قرآن دعوت دیتا ہے ایسی باتوں کی طرف جو بالکل سیدھی سیدھی اور صحیح ہیں۔

اس طرح قرآن مجید نے تمام وہ پہلو جو ایک معجزہ کی صحت کے سلسلہ میں غور کے قابل ہیں سب خود ہی پیش کر دیے اور اہل نظر کی نظر کے سامنے رکھ دیے جس کے بعد غور کرنا نہ کرنا خود اشخاص کا ذاتی فعل ہے۔

قرآن مجید کی حیثیت اعجاز

وہ لوگ جو قرآن مجید کو معجزہ سمجھتے اور خداوندی کلام تسلیم کرتے ہیں اُن میں اس حیثیت سے تھوڑا اختلاف ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کس حیثیت سے معجزہ ہے؟

وہ اس میں مختلف اقوال پر منقسم ہو گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ حقیقت سے الگ قول میرے خیال میں اُن لوگوں کا ہے جو قرآن کو صرفہ و سلب قوای کے اعتبار سے معجزہ سمجھتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن بجائے خود تو عام فصحائے عرب کے کلام کے مثل کلام ہے لیکن یہ خدا کی قدرت ہے کہ اس کا جواب دینے پر کسی کو قدرت نہ ہو اور جب کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہے تو خدا اس کی قوت کو سلب کر دے اور موانع پیدا کر دے۔

یہ قول اگرچہ مطابق واقعہ ہونے کی صورت میں نتیجۂ اعجاز کے اعتبار سے کوئی خرابی نہیں دیتا اور بے شک اس صورت میں بھی وہ معجزہ قرار پاتا اور نبوت و رسالت کی دلیل ہوتا لیکن خود وہ خلاف واقعہ ہے۔

ذوق و وجدان، فن بلاغت اور احساس فصاحت، کلام ادباء کا تتبع اور انسانی فصاحت و بلاغت کے معیار کا موازنہ اس خیال کو بالکل غلط ثابت کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ہم خالی الذہن ہو کر بغیر کسی خیال معارضہ و مقابلہ کے بھی آیات قرآن پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو انسانی سطح سے بلند شان اور انسانی قدرت و اختیار کے حدود سے باہر کلام ہمارے سامنے آتا ہے جس سے ہمیں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ بیشک کلام ہی ایسا ہے جو انسانی طاقت و اختیار سے بالاتر ہے اور اس کی وجہ

سے خلق کی تمام طاقت اُس کے مقابلہ میں عاجز ہوتی ہے ۔

ایسا نہیں کہ ہے تو وہ معمولی انسانوں کا ایسا کلام لیکن خداوند عالم کی قدرتی کارستانی سے کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اس کا جواب تیار کرے ۔

اب اسے ہم اپنے اردو دان ناظرین کے طبقہ کے سامنے کیا پیش کریں اُن نمونوں کے ساتھ جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یقیناً انسان پر ایک حیرت انگیز اثر ڈالتے ہیں جو حقیقۃً حدِ اعجاز ہے اور واقعی بشری طاقتوں سے خارج ہے ان نمونوں کا پیش کرنا اس لیے یہاں بے سود ہے کہ عربی آیات کے معانی کو خالص اردو دان طبقہ سمجھ نہیں سکے گا اور ترجمہ میں وہ مقصد حاصل نہیں کیونکہ اصل زبان کے تمام خصوصیات کا وہ حامل ہی نہیں ہو سکتا ۔

بے شک یہ مقام جن حضرات کو تفصیل سے دیکھنا ہو وہ ہماری عربی تفسیر "الفرقان فی تفسیر القرآن" میں ملاحظہ فرمائیں جس کا مقدمہ طبع ہو چکا ہے ۔

یقیناً قرآن مجید نے ہر شعبہ میں وہ نقش قائم کیے ہیں جو سوا نقاش قدرت کے کسی کے دست و قلم سے نکل ہی نہیں سکتے ۔

اور اُن کو دیکھ کر اس خیال کی کمزوری بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ قرآن صرف لوگوں کی قوتیں سلب ہو جانے کی وجہ سے معجزہ ہوا ۔ نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ قرآن معجزہ ہے اور بذات خود معجزہ ہے ۔ اپنے خصوصیات ذاتی اور فصاحت و بلاغت وغیرہ کے ساتھ معجزہ ہے اور خود اس نے فصحاء کی گردنیں خم اور ان کی ہمتیں پست کی ہیں ۔ اور اُن سے اپنی بے مثالی کا کلمہ پڑھوایا ہے ۔

اسی کے قریب کمزوری کے اعتبار سے یہ قول ہے کہ قرآن بحیثیت اپنی فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں اور نہ باعتبار اپنی جامعیت معانی و الفاظ کے معجزہ ہے بلکہ اُس کے معجزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور کامل اثر و نفوذ رکھنے والا قانون ہے اور اُس میں حسب اقتضائے زمانہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ضروری احکام بوجہ اتم موجود ہیں ۔

یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ اس صورت میں قرآن مجید کے وہی آیات صحیح ہو سکتے ہیں جن میں قرآن مجید کے مجموعی طور پر مقابلہ کا سوال پیش کیا گیا ہے لیکن وہ آیات بالکل نظر انداز ہو جائیں گے جن میں دس سوروں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے یا صرف ایک سورہ کا جواب طلب کیا گیا ہے ۔

اس مطالبہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہات اعجاز میں کوئی جہت ایسی بھی ہے جو کل اور جزو دونوں میں مشترک ہے ۔

اس کے علاوہ مذکورہ معیار کی بنا پر یہ جہت اعجاز اُس وقت مکمل ہوتی اور مقابلہ کی دعوت اُس وقت صحیح ہو سکتی تھی جب پورا قانون یعنی قرآن مجید نازل ہو لیتا جس کا سلسلہ رسول کی زندگی کے آخری حصہ تک قائم رہا حالانکہ یہ مطالبات اور اعجاز قرآن کے دعاوی کا سلسلہ ابتدائے نزول قرآن و اول زمانہ تبلیغ نبوت سے شروع ہو گیا تھا ۔

پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ کسی قانون کا انسانی زندگی کے شعبوں کے لیے مناسب و مفید ہونا اور ضروری احکام کا بوجہ اتم موجود ہونا یہ ایسا امر نہیں ہے جس کا فیصلہ عام انسانی افراد کر سکیں ۔ جو شخص بھی کوئی قانون بناتا ہے اُس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ بالکل مصالح وقت کے مناسب ہے اور عام افراد بھی اُن کی نسبت کسی نتیجہ پر متفق نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے خیالات مصالح اجتماعیہ میں کسی نقطہ پر متحد ہوتے ہی نہیں ہیں ۔

معلوم ہوا کہ یہ خیال بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ یقیناً اعجاز قرآن کا پہلو قرآن کے مافوقِ قدرت انسانی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہے ۔

یہاں بھی میں اس کو تنگ نظری اور قصور ذہن سمجھتا ہوں کہ انسان قرآن کی اعجازی حیثیت کو فصاحت و بلاغت میں منحصر کرے ۔

بلکہ معجزہ وہ ہونا چاہیے جس کے لحاظ سے مخاطب طبقہ پر اتمام حجت ہو سکے یعنی وہ ایسی چیز ہو جسے وہ سمجھ سکیں کہ یہ حقیقۃً انسانی حدود اختیار سے بالاتر ہے یا نہیں ۔

اُس خارق عادت کو ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطبین کا تمام حلقہ اُس کے خارق عادت اور غیر معمولی درجہ پر فائز ہونے کا احساس کر سکے اور اس لیے ضرورت ہے کہ وہ اُسی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو جس میں اُس زمانہ کے لوگ واقفیت و اطلاع اور کمال مہارت و اقتدار رکھتے ہیں ۔

ایک ایسے شخص کے سامنے جو علم منطق سے بالکل ناواقف ہے اگر منطق کی نوعیت کا عظیم سے عظیم نمونہ پیش کیا جائے تو وہ اسے اپنی جہالت کے پردہ میں چھپا کر کہہ دیگا کہ میں تو اس شئے سے واقف ہی نہیں ۔ کیا جانوں کہ یہ کیا درجہ رکھتا ہے؟ اور اسی صورت سے علم طب سے نابلد شخص کے آگے کسی بڑے سے بڑے مرض کے علاج کا دعویٰ ۔ لیکن اگر اسی شعبہ میں کہ جس میں اُسے واقفیت اور کمال حاصل ہے کوئی غیر معمولی مظاہرہ پیش کیا جائے تو بے شک دیکھنے والا اپنے کمال مہارت و واقفیت کی بنا پر اُس کے متعلق غور کر سکے گا کہ یہ چیز انسانی حدود اختیار میں داخل ہے یا نہیں ۔

اسی لیے سنت الٰہیہ اس بات پر جاری ہوئی ہے کہ جس شے کا جس زمانہ میں پورا دور دورہ ہو اور اہل زمانہ اس میں کمال کا دعویٰ رکھتے ہوں اُسی نوعیت کا معجزہ اتمام حجت کی صورت سے اس زمانہ میں پیش کیا جائے ۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ساحروں کا زور تھا زمین مصر جادوگروں کے وجود سے معمور تھی ۔ آپ کو معجزہ ایسا عطا ہوا جس نے ساحروں کے سحر کو باطل کیا اور ان سے کلمہ پڑھوایا ۔

حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں علم طب کا دور دورہ تھا ۔ یونان کی حکمت شباب پر تھی اور وہاں کا فیض تمام ملک شام و فلسطین میں بھی پھیلا ہوا تھا ۔

اس لیے مسیح کو اس نوعیت کا معجزہ عطا ہوا ۔ وہ کور مادر زاد کوڑھی اپاہج کو شفا دیتے اور مردہ کو زندہ کر دیتے تھے ۔

یہ انسانی حدود کمال سے خارج بات تھی اس لیے واقفکار دنیا پر حجت تمام ہو گئی ۔

ہمارے رسول کریم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے ہیں تو ملک عرب میں شعر و سخن کا زور تھا، فصحا و بلغاء کے ڈنکے بج رہے تھے اور یہی چیز تھی جسے عرب انسانی کمالات کا طرۂ افتخار سمجھتے تھے اور اُس میں کمال و اقتدار کا دعوٰی کرتے تھے۔

اگر اُن کے سامنے فلسفہ و منطق کے عمیق مسائل پیش کیے جاتے اور علمی معجزات سامنے لائے جاتے تو وہ کہنے کا حق رکھتے تھے کہ ہم کو اس چیز سے کیا واسطہ؟ ہم کیا جانیں کہ یہ عام طاقت بشری سے خارج ہے یا عام انسانی حدود اختیار کے اندر؟ ہم اس کے ماہرین سے دریافت کریں تو سمجھ سکتے ہیں؟ یوں ہم اس کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے ہیں؟ اس طرح یقیناً حجت ان کے مقابلہ پر ناتمام سمجھی سکتی تھی۔

اس لیے قرآن پیش کیا گیا اور وہ بحیثیت فصاحت و بلاغت اعجاز کے درجہ پر قرار دیا گیا تاکہ وہ لوگ اسی حیثیت سے کہ جس میں انھیں کمال کا دعوٰی ہے۔ اس کے مرتبہ و منزلت، اور اس کی حیرت ناک عظمت پر غور کر سکیں اور سمجھ لیں کہ وہ عام انسانی سطح سے بلند کلام ہے۔

بے شک انھوں نے دیکھا، سمجھا اور غور کیا اور اُن میں سے نقاد اور صاحب نظر افراد کو کافی غور و خوض کے بعد حکم لگانا پڑا کہ "ماھذا کلام البشر" یہ کسی طرح انسانی کلام معلوم نہیں ہوتا ہے۔

اس طرح یقیناً قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت اس وقت کے پورے طبقہ پر حجت تھا جن سے شروع شروع قرآن سے واسطہ پڑا تھا اور ان کے لیے اُس کے معجزہ ہونے کے ساتھ ان کے واسطہ سے دوسرے افراد پر بھی اس کا معجزہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے ہم جو عربی زبان کے خصوصیات اور اس کے مدارج و مراتب سے اس درجہ واقف نہیں ہیں۔ جس درجہ وہ واقف تھے ہمارے لیے اُن کا اعتراف، اقرار اور عجز و بے بسی ثبوت اعجاز کی دلیل ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن چونکہ ہر زمانہ میں باقی رہنے والی نشانی اور رسولؐ کی نبوت کا دائم و برقرار رہنے والا ثبوت تھا اس لیے اُس کے اعجاز کا پہلو صرف فصاحت و بلاغت میں منحصر نہیں ہے میں اعجاز قرآن کے معیار کو اس سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسانی افراد کے دماغ مختلف درجوں پر تقسیم ہوتے ہیں۔

بعض بلند اور بعض پست۔ بعض ظاہر بین اور بعض حقیقت شناس۔ بالکل اسی کی مطابقت سے قرآن مجید میں مختلف پہلو پائے جاتے ہیں بعض ظاہری اور بعض باطنی بعض لفظی اور بعض معنوی جس کی بنا پر ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق جہت اعجاز کی تلاش کر کے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔

زمانۂ رسولؐ میں موجود رہنے والے فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا جوہر انسانیت سمجھنے والے تھے اُن کے لیے وہ بحیثیت فصاحت و بلاغت معجزہ تھا۔ اور دوسرے اشخاص کے لیے باختلاف مذاق باعتبار معارف و حقائق۔ باعتبار نکات و دقائق۔ باعتبار جامعیت و وسعت علوم۔ باعتبار متانت و بلند نظری اور اُس کے ساتھ باعتبار اپنے تعلیمات و ہدایات کے معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعجاز قرآن کے مختلف پہلو [۱]

(۱)

تاریخی حیثیت سے

حضرت رسولؐ کو ویسا فرض کر لو جیسا اُن کے دُشمن کہتے ہیں کہ اُنھوں نے توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات افواہی حیثیت سے عام اشخاص افراد سے سنے اور اُنھیں قرآن میں درج کر دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ کہ توریت و انجیل میں جس طرح واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اس کے ساتھ قرآن کے مندرجہ واقعات میں ایسے اضافے، اختلافات اور حواشی ہوتے جن میں واقعیت کے متانت و استحکام کا پتہ نہ ہوتا اور افواہی باتوں کی خرافت آمیز داستانوں کا اثر بہت نمایاں ہوتا۔

یعنی توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات میں اگر خلاف عقل خلاف فطرت، منافی مذہب باتیں نہ بھی تھیں تو اس میں پیدا ہو جاتیں اور اگر تھیں تو اسمیں بہت بڑھ جاتیں۔

لیکن جب ہم توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات اور پھر قرآن مجید میں اُنھی واقعات کے تذکرہ کو دیکھتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ بائبل کے واقعات میں اس درجہ دور از کار اور خرافت آمیز روایات کی بھرمار ہے کہ کسی طرح عقل و مذہب کے رو سے انھیں صحت کی سند کا دیا جانا ممکن نہیں ہے اور قرآن اُنھی واقعات کو تمام اُن خرافتوں اور دور از کار باتوں کو حذف کر کے ایسے صحیح اور موافق فطرت انداز سے پیش کرتا ہے جسے عقل اصلیت کی سند دینے پر مجبور ہے۔

ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش فصل ۳ میں حضرت آدم کے ممنوعہ درخت سے تناول فرمانے کا قصہ اور اس میں جو کچھ دور از کار باتیں ہیں جن سے خدا کی طرف غلط بیانی، فریب کاری کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اور فصل ۱۵ میں ابراہیم کا واقعہ کہ اُن کو خدا کے وعدہ میں شک ہوا شام میں زمین عطا کیے جانے کے متعلق اور فصل ۱۸-۱۹ میں ملائکہ کے آنے کا تذکرہ ابراہیم کے پاس اسحٰق کی ولادت کی خوشخبری لے کر اور کتاب خروج فصل ۳ میں خداوند عالم کا خطاب موسیٰ سے درخت کے ذریعہ سے اور اُس کا وہ ضمیمہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی تعلیم موسیٰ کو شروع ہی سے غلط بیانی کے سبق کے ساتھ اور فصل ۳۲ میں ہارون کا قصہ کہ انھوں نے گوسالہ تیار کرایا تھا جو خدائے بنی اسرائیل کی حیثیت سے قرار دیا جائے اور انھوں نے اُس کے لیے قربانی اور عبادت کے طریقے مقرر کیے تھے۔

[۱] ماخوذ از آلاء الرحمن مصنفہ علامہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ۔

یہ تمام واقعات ہیں جنھیں ایک نظر توریت میں مطالعہ کرو اور دیکھو کہ اُن میں کیا کیا باتیں ایسی ہیں جو کسی طرح عقل و مذہب کی روشنی میں صحیح تسلیم کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ جن سے جلال الٰہی اور طہارت ابنیار پر دھبّا آتا اور بہت سے اصول عقلیہ کو دھچکا لگتا ہے اور پھر انہی واقعات کو قرآن مجید میں نکال کر مطالعہ کرو۔

معلوم ہوگا کہ قرآن میں تمام وہ زوائد حذف ہیں جو مذکورۂ بالا حیثیت سے ناقابل قبول تھے اور اُس میں تمام واقعات ایسے انداز سے بیان ہوئے ہیں جو کسی طرح شان حضرت الٰہی اور شان ابنیاء و مرسلین کے خلاف نہیں ہیں۔

ملحقات توریت میں جو واقعات مذکور ہیں وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہیں۔ حضرت ایوب کی طرف انتہائی جزع و فزع اور خدا سے شکوہ بلکہ اعتراض کی نسبت۔ حضرت داؤد کی طرف زناکاری کی شرمناک نسبت۔ حضرت سلیمان کی طرف کفر و شرک کے رواج دینے کی نسبت وغیرہ وغیرہ۔ ایسے واقعات جو ایک لحظ کے لیے صحیح تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔

توریت و ملحقات میں تلاش کرنے پر اس سے زیادہ بہت باتیں موجود ملتی ہیں جیسے حضرت لوط کی شراب خواری اور نشہ شراب میں اپنی دونوں لڑکیوں کیساتھ زناکاری، حضرت یعقوب کی خدا کے ساتھ کشتی۔ حضرت یعقوب کی اپنی والد کے ساتھ فریب کاری، خدا کا مشورہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ کہ آخاب بادشاہ بنی اسرائیل کو گمراہ کیا جائے۔

اور اس کے علاوہ بہت باتیں جن سے پرانے عہدنامہ کے صفحات پورے طور سے مملو نظر آتے ہیں انجیل مقدس جو حضرت مسیح کی تاریخ زندگی ہے اُس میں بھی اختصار و کمی صفحات کے باوجود حضرت مسیح کی طرف ایسے واقعات کی نسبت موجود ہے جو کسی طرح اُن کی شان کے لائق نہیں ہے۔

جیسے شراب خواری، غلط بیانی، ماں اور بھائیوں کے ساتھ بداخلاقی، نامحرموں کے ساتھ اخلاق سوز بے باکی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ قرآن مجید کے زمانہ میں اور اس کے قبل ابنیار و مرسلین کے تاریخی معلومات کے متعلق یہود و نصاریٰ کے تعلیمات کے سوا کوئی سرچشمہ نہیں تھا اور توریت و انجیل ہی کے مندرجات تھے جو احبار یہود و قسیسین نصاریٰ کے نوک زبان تھے۔

رسول اسلام اگر ان تعلیمات کو یہود و نصاریٰ کے علمار سے حاصل کرتے تو کم از کم وہ تمام خرافات جو اُن کی کتابوں میں مذکور ہیں آپ کی کتاب میں بعینہ درج ہوتے یا اگر آپ اُن کو صرف افواہی حیثیت سے جو عام لوگوں کی زبان پر دائر تھے اُن کی بنا پر نقل کرتے جیسا کہ عام عیسائی مؤلفین ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو آپ کی امیّت اور آپ کی قوم کی عام جہالت کی بنا پر توریت و انجیل سے بہت زیادہ خرافات اور دور دراز کار باتیں اس میں شریک ہو جاتیں۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے اُن واقعات کو جو بائبل میں واقعیت کی شان کے بالکل خلاف تھے بالکل ذکر ہی نہیں کیا اور جن واقعات کو بائبل نے ذکر کیا ان کو اُن تمام خصوصیات و زوائد سے علیحدہ کر کے جو اُس واقعہ کو واقعیت کے حدود سے الگ پھینکنے کے ذمہ دار تھے تو اس سے ہماری عقل صاف اس نتیجہ تک پہونچتی ہے کہ درحقیقت واقعات کی مسخ شدہ صورت وہ تھی جو توریت و انجیل میں رائج ہو گئی تھی اور خدائے آسمانی نے جو بندگان خدا کی ہدایت کے لیے رسولوں کا بھیجنے والا اور اُن کی اصلاح کرنے والا ہے اپنے خاتم المرسلین رسول کو ان تمام صحیح واقعات کی اصلی صورت میں تعلیم دی تاکہ توریت و انجیل میں پڑی ہوئی خرابیوں کی ہمیشہ کے لیے اصلاح ہو جائے اور گمراہ کن خیالات کا جو جلال الٰہی و شان ابنیار کے منافی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں قلع و قمع اور آئندہ کے لیے سدباب ہو جائے۔

(۲)

استدلالی حیثیت سے

قرآن کے محل نزول پر غور کرو۔ عرب کی جہالت کو دیکھو! کفر و شرک کی ترقی ضلالت و گمراہی کی فراوانی، عقلوں کی کوتاہی نگاہوں کی ظاہر بینی۔ علوم و کمالات سے اجنبیت اور منطق و فلسفہ سے بالکل ناشناسی۔

اس سب کے بعد قرآن مجید کے معارف و حقائق کے آیات کی تلاوت کرو، خاص مسائل توحید اور عدل و نبوت اُس کے مضبوط استدلالات، محکم براہین اور لطیف اشارات کا مطالعہ کرو۔

قرآن کے آیات کے عمق کو دیکھو، باریک بین، دقیق فلسفی نگاہوں سے اُس کے معانی کی گہرائی پر غور کرو معلوم ہوگا کہ وہ کس پایہ کس درجہ کا کلام ہے اور کیا عقل و عادت، فطرت و طبیعت کے رو سے اُس ماحول، اُس ظرف میں پیدا ہونے والے کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے؟

اس کے ساتھ ذرا بائبل کے اُن استدلالوں پر نظر ڈالو جو مسیح کی طرف منسوب کیے گئے ہیں جن میں عجیب عجیب طریقوں سے مطلب ثابت کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر تعدد آلہہ اور شرک تک کی تعلیم کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس وقت حیرت کی انتہا نہیں رہے گی اس لیے کہ زمانۂ نزول قرآن میں ہر پہر کے علمی و کلامی حیثیت سے اگر کوئی درجہ ہو سکتا تھا تو وہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا تھا، اور اُن کے علمی و عقلی سرمایہ کی وسعت صرف اتنی ہی تھی جو توریت و انجیل کے موجودہ نسخوں سے ظاہر ہے۔ اُس کے بعد کوئی شک و شبہہ نہیں رہتا کہ قرآن یقیناً غیر معمولی طاقت کا کرشمہ تھا جو کسی انسان کی صرف انسانی قوت کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

(۳)

تشریعی حیثیت سے

یہ چیز وہ ہے جس کے متعلق میں لکھ چکا ہوں کہ عام انسانی افراد اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے لیکن بہت سے صحیح الذوق اور سلیم العقل افراد جنھوں نے دنیا کے قوانین و اصول انتظامی کا انتقادی نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان کا دماغ حقیقۃً قانونی ساخت کا واقع ہوا ہے کم از کم موازنہ کے ساتھ یہ ضرور سمجھ لے سکتے ہیں کہ دو قسم کی تعلیموں میں سے کون رُوح

انتظامی کے ساتھ زیادہ موافق اور مفاد اجتماعی کے مطابق ہے۔ نیز کون قانون کہاں تک عملی ہے اور فطرت کے مطابق ہے۔ نیز اس امر کا سمجھ لینا تو ہر شخص کے لیے آسان ہوگا کہ کس قانون میں جامعیت پائی جاتی ہے اور شخصی و نوعی انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے احکام موجود ہیں۔

بے شک قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں ایک شریعت موجود تھی شریعت موسویہ جو یہود و نصاریٰ کے لیے قولی و عملی دونوں حیثیتوں سے اور نصاریٰ کے لیے عملی نہ سہی تو قولی و اعتقادی حیثیتوں سے قابل قبول اور لائق تعظیم تھی اور حضرت عیسیٰ کا بھی ایک آئین ضرور تھا جو اگرچہ اس اعلان کی بنا پر کہ زمین و آسمان ٹل جائیں موسیٰ کی شریعت کا ایک شوشہ تبدیل نہیں ہو سکتا شریعت موسویہ کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں سمجھا جانا چاہیے لیکن پھر بھی عملی طور سے وہ بالکل شریعت موسویہ کے خلاف ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اس لیے اُسے شریعت عیسویہ تسلیم کرنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ایران میں زردشتی مذہب کے تعلیمات تھے اور زردشت کی ایک مستقل شریعت تھی جو ایک زندہ حیثیت رکھتی تھی اور ہزاروں آدمیوں کو اپنا پابند بنائے ہوئے تھی۔

بے شک مذہب اگر اپنی اساسی حیثیت سے صحیح ہے تو اُس کی شریعت کے اجزاء اصلی یقیناً وہی ہو سکتے ہیں جو خدائے واحد کے نازل کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعد کی تراش خراشوں نے اُن میں تبدیلیاں کر دی ہوں اور طرح طرح سے اُن کو مسخ کر دیا ہو۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ شریعت موسویہ ایک صحیح اصل پر مبنی تھی اور مذہب عیسوی بھی ایک صحیح بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔

زردشت کے متعلق بھی اگرچہ قرآن نے نبوت کی گواہی نہیں دی ہے لہذا ہم قطعی حیثیت سے اس نبوت کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے لیکن قرائن و منقولات کی بنا پر بہت سے لوگ اُن کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور ہم یقینی حیثیت سے اس کو غلط کہنے کی بھی کوئی بنیاد نہیں پاتے ہیں۔

اس صورت میں اگر ان شریعتوں میں کچھ ایسے احکام پائے جاتے ہوں جو قرآنی احکام کے ساتھ متحد ہوں یعنی ویسے ہی احکام قرآن میں بھی موجود ہوں جو وہاں موجود ہیں تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن میں اُن مشترکہ احکام سے بہت زیادہ خصوصی تعلیمات اور بہت سے ایسے شعبوں کے متعلق احکام و قوانین کیسے ہیں جن کا مذکورہ بالا شریعتوں میں پتہ بھی نہیں تھا۔ اور اُن شعبہ ہائے زندگی کے متعلق اشارہ بھی موجود نہ تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شریعت کو حقیقۃً اُسی خدا نے نازل کیا ہے جس نے اُن شریعتوں کو ان کے محدود زمانہ کے لحاظ سے محدود احکام پر مشتمل نازل کیا تھا، اُس نے اس شریعت کو زمانہ کی آخری عمر تک باقی رکھنے کے لیے تمام انسانی زندگی کے شعبوں کے متعلق احکام و تعلیمات پر مشتمل بنا کر نازل کیا ہے اور وہ کسی انسانی ساخت و پرداخت کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۴)

اَخلاقی حیثیت سے

بلاشبہ علم اور تربیت کا انسان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے اور جہالت اور علوم صحیحہ سے ناواقفیت بڑی سے بڑی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے ——— اور اخلاق کی جان جو کچھ بھی ہے وہ ملکات نفسیہ اور قوائے طبعیہ میں اعتدال کے نقطہ کی پابندی اور افراط سے کنارہ کشی۔

بڑے سے بڑے معلم کے تعلیمات اس وقت بے قیمت ہیں جب وہ یا تو تفریط کی وجہ سے اس حد تک گرے ہوں کہ اُن سے امن و انتظام اور شائستگی و تہذیب کا مقصد حاصل ہی نہ ہوتا ہو اور یا افراط کے لحاظ سے اس درجہ زیادہ ہوں کہ وہ انسانی فطرت کی رو سے کبھی ممنون عمل بن ہی نہ سکیں اور اُن کی پابندی ممکن ہی نہ ہو۔

توریت اور انجیل کے اخلاقی تعلیمات کی نوعیت انہی دونوں راستوں میں تقسیم ہے۔ اوّل الذکر افراط اور ثانی الذکر تفریط کے لحاظ سے نقطۂ اعتدال سے علیحدہ ہیں۔

بے شک ان میں حد وسط کا درجہ اگر حاصل ہے تو وہ قرآن مجید کو ہے قرآن کے تعلیمات افراط و تفریط دونوں باتوں سے علیحدہ بالکل اعتدالی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لیے ہر شخص کے لیے ممکن العمل اور تہذیب و شائستگی کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ یہ خصوصیت بھی قرآن مجید کی وہ ہے جو اس کو تمام کتب و ادیان میں ممتاز درجہ عطا کرتی ہے اور اس بناء پر جب عرب کی جہالت اور رسول عربی کے ماحول وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اُس کی الہامی و آسمانی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقیناً خداوند عالم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

موازنۂ بائبل و قرآن

ہم نے مذکورۂ بالا چند عناوین کے تحت میں ایک اجمالی خاکہ اس موازنہ کا قائم کر دیا ہے جو "بائبل اور قرآن" میں صحیح طریقہ سے کیا جا سکتا ہے اور ہمارے گذشتہ بیانات کے اشاروں سے ایک مبسوط کتاب "موازنہ بائبل و قرآن" کے موضوع پر مدون ہو جانا کوئی دشوار نہیں ہے۔

یہ عیسائی مبلغین کی انتہائی جرأت و دیدہ دلیری ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی تمام کمزوریوں کے باوجود اس کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ اُن کو قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کریں چنانچہ گذشتہ قریبی زمانہ میں لاہور سے ایک کتاب بھی شائع ہوئی "موازنہ بائبل و قرآن" جس میں اصول، فروع، معارف، اخلاق اور عبادات کے مختلف عنوانات قائم کر کے ایک کالم میں قرآن مجید کے آیات اور دوسرے میں انجیل کے عبارات درج کیے گئے، اور بخیال خود انجیل کا تفوق قرآن کے مقابلہ میں ثابت

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں نے اس تفسیر کے ذیل میں خاکہ پورا لکھ دیا ہے جس کی بنا پر ہر شعبہ میں قرآن کا موازنہ بائبل کے ساتھ صحیح طریق پر کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے زیادہ تفصیل دینا اس سلسلہ میں کتاب کی شان تصنیف کے خلاف ہے اور اُس کے تمہیدی مقدمات میں درج ہونے کے لائق نہیں ہے۔

قرآن کے تازہ ترین مُعجزات

طبیعیات و فلکیات میں دنیا برابر ترقی کرتی جاتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے دروازے حکمت و فلسفہ کے جو سابق زمانہ میں بند تھے وہ اب کھلتے چلے جا رہے ہیں اور سیکڑوں رموز جو اب تک راز سربستہ کی صورت سے چلے آرہے تھے وہ اب منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

بہت سے قدیم نظریئے تھے، جن کا بطلان اب بدیہی صورت اختیار کرچکا ہے اور بہت سی باتیں آلات رصدیہ اور خورد بین و دوربین ذرائع سے محسوسات میں داخل ہوگئی ہیں۔ اگرچہ جو نتیجے نکالے جا رہے ہیں وہ اکثر ذہنی و ظنی بھی ہوتے ہیں اور بسا اوقات اُن میں تخیل و قیاس کی بھی آمیزش ہے اور بہت سے رموز اب تک منکشف بھی نہیں ہوسکے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ منکشف ہوں اس لیے کہ ترقی کی انتہا نہیں ہوگئی ہے اور جتنا علم انسان کو حاصل ہوا ہے وہ بہت کم ہے اُس حقیقت کے مقابلہ میں جو عالم کائنات کے اندر مضمر ہے۔

اس لحاظ سے میں اس بات سے کبھی متفق نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ مذہبی آیات و روایات کو جدید تحقیقات پر منطبق ہی کیا جائے خواہ وہ جدید تحقیقات کوئی ثابت اور یقینی حیثیت نہ رکھتی ہو اور خواہ اس منطبق کرنے میں توڑ مروڑ اور ساخت و ساز کی ضرورت بھی درپیش ہو۔

ایسی سعی میرے خیال میں مفید اور صحیح نہیں سمجھی جاسکتی اس لیے کہ انسانی فلسفہ اور علم روز تبدیل ہونے والی اور متغیر چیز ہے اور مذہب ایک ثابت برقرار اور لازوال حقیقت اور یہ ظاہر ہے کہ ثابت، لازوال چیز متغیر اور قابل تبدیل شے کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

آج آپ نے فلسفہ کی موجودہ بنیادوں کو صحیح سمجھ کر مذہبی روایات کو اُس پر منطبق کیا، کل فلسفہ بدل گیا وہ نظریے غلط ثابت ہوگئے۔ آپ تو اپنے مذہب کے نصوص کو اُس فلسفہ کے قالب میں ڈھال چکے تھے اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کا مذہب غلط ثابت ہوا۔ یہ کس لیے ہوا؟ اپنے ہاتھوں سے۔ حالانکہ مذہب درحقیقت اُس غلط خیال کی حمایت سے خاموش تھا اور ہم نے اپنے خود ساختہ تاویلات سے اُس کو موجودہ لباس میں ڈھال دیا تھا۔

اس لیے واقعاً اگر مذہبی تصریحات کسی موجودہ تحقیقات فلسفی کے خلاف ہوں تو ہمیں اس تحقیقات کی صحت میں شک

کرنا چاہیے اور اُس کے صحیح انکشاف کو فلسفہ کے زیادہ بلند درجہ تک ترقی کرنے کے ساتھ مستقبل کے حوالہ کرنا چاہیے۔

پھر بھی اس میں شبہہ نہیں ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن میں فلسفہ صحیح نقطۂ ترقی تک پہنچ گیا ہے اور واقعی حقیقت کا انکشاف کرلیا ہے اُن میں سے بہت باتوں کا پتہ قرآن اور احادیث کے الفاظ میں بے جا اور دور از کار تاویلات کے بغیر نہایت صاف اور واضح طریقہ سے موجود ہے اور یہ قرآن مجید کا بڑا اعجاز ہے کہ وہ چیزیں جو سیکڑوں برس تک دنیا سے پردۂ خفا میں رہیں اور کسی کی نگاہ اُن تک نہیں پہونچی تھی اور ہزاروں قسم کے جدید آلات رصدیہ اور مختلف قسم کی دوربینوں سے اُن کا پتہ چلایا گیا ہے نبی امیؐ کے لائے ہوئے قرآن میں تیرہ سو برس قبل مذکور تھیں۔

بہت سی آیتیں قرآن کی ایسی ہیں کہ اُن کو جب ہیئت کے قدیمی مسلمات کی بنا پر جانچا گیا تو کسی طرح اُن کے معنی ظاہری طور سے سمجھ میں نہ آئے مفسرین جو انہی علوم پر ایمان لائے تھے اُنھوں نے ان آیات میں تاویلات سے کام لیا اور ان کے معنی کو حقیقت سے ہٹا دیا لیکن اب جس وقت کہ ہیئت نے پلٹا کھایا ہے اور علم کے دور میں انقلاب ہوا ہے تو وہ آیات اپنے ظاہری الفاظ کے ساتھ اسی حقیقت کا پتہ دے رہی ہیں جس کا اب انکشاف ہوسکا ہے اور اس کے پہلے نہیں تھا۔

یہ ایک مبسوط اور طویل الذکر عنوان ہے جس کے تشریح و بسط کے لیے مستقل کتاب درکار ہے۔

فیلسوف العصر علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی دام ظلہ نے جو عراق کے ایک بڑے محقق، متتبع اور جامع علوم و فنون بزرگ ہیں۔ ایک کتاب "الھیئۃ والاسلام" تحریر فرمائی تھی جو عراق میں شائع ہوئی اور اُس کا ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب اعلی اللہ مقامہ نے "البدر التمام" کے نام سے کیا جو دفتر "البرہان" لودھیانہ سے شائع ہوا۔

اس میں اگرچہ بہت سے تاویلات پہلی قسم میں داخل ہیں جن کی نوعیت سے میں اختلاف کا اظہار کرچکا ہوں لیکن بہت سے نمونے دوسری قسم کے بھی موجود ہیں اور بہت سے مسائل ہیں جو واقعی قرآن و احادیث کے تصریحات سے پورے طور پر ثابت ہیں جن میں کسی تاویل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم و محقق شیخ طنطاوی جوہری کی کتاب "القرآن والعلوم العصریۃ" اور شیخ عبدالحلیم علی ہدیۃ الازہری کی کتاب "القرآن والعلوم العصریہ اور معجزات القرآن العشرین" بھی اس سلسلہ میں اچھی کتابیں ہیں۔ عم معظم مولانا سید احمد صاحب قبلہ علامۂ ہندی کی کتاب "فلسفۂ الاسلام" بھی اس قسم کے بہت ذخیرہ پر مشتمل ہے اور امید تھی کہ یہ کتاب اگر مکمل شائع ہوتی تو انتہائی مفید اور پراز معلومات ثابت ہوتی۔

قرآن کے امتیازی خصوصیات

بحیثیت استناد و اعتبار

ہم نے اپنی کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" میں بہت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ جتنی کتابیں

اس وقت الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اُن کے متعلق اگر خود اُن کے ماننے والوں کے محررات کی روشنی میں نظر کی جائے تو اُن کی تاریخ زندگی ایسے حوادث و انقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بنا پر کسی طرح وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے کسی حصہ یا کسی جزو کا وجود بھی دنیا میں باقی ہے اور جسے اب اس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اُس میں کوئی آدھا چوتھائی جملہ بھی اُس حقیقی وحی سے عیناً مطابق ہے جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔ ہم نے "توریت کی سرگذشت" لکھی اور اس میں ثابت کیا کہ اُس کی تاریخ عجب روح فرسا مصائب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک اس کی زندگی کو فنا کر دینے کی ضامن ہے۔

(پہلے) یہ کہ اس کے حامل اور امانت دار جو بنی اسرائیل تھے وہ بہت مرتبہ بالکل مذہب موسوی سے پلٹ گئے اور بت پرستی کرنے لگے، اُنھوں نے بیت المقدس کی بنیادوں کو ہلا دیا اور اس کی دیواروں کو گرا دیا، اُن میں نجاستوں کا اتنا ڈھیر لگایا کہ برسوں صاف کرنے کی ضرورت پڑی۔

ہم نے بائبل کے حوالوں سے ان تمام انقلابات کی مکمل تاریخ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ بھلا ایک قوم جس نے مذہبی حیثیت سے اتنے پلٹے کھائے ہوں اور اتنی مرتبہ ارتداد کو اختیار کر کے کفر و شرک اور بت پرستی کے راستہ پر لگی ہو اُس کے متعلق کہاں یہ اطمینان ہو سکتا ہے کہ اُس نے کتاب الٰہی اور توریت حقیقی کو اس کی اصلی حالت پر رہنے دیا ہوگا یا اُس کی حفاظت میں کوئی اہتمام کیا ہوگا بلکہ اُس کی کفر پروری اور باطل پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اُس میں اپنی خواہش کے مطابق طرح طرح کے تصرفات کر کے اُس کو اپنے مذاق کے موافق بنائے اور پھر جب کہ ہم کو موجودہ توریت کے اندر جابجا شرک و تعدد آلہہ کے عقیدہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ توریت میں اکثر جگہ الہ یعنی "خدا" کی لفظ کے بجائے الٰہہ یعنی "خدایان" کی لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مذہبی افتاد طبع کا اثر توریت پر پڑے بغیر نہیں رہا تھا اور اُن کے شرک و صنم پرستی کے مسلسل رجحانات نے توریت کے اندر رنگ آمیزیاں ضرور کی تھیں۔

(دوسرے) یہ کہ توریت کا اصلی نسخہ جو موسیٰ نے خود لکھ کر اولاد لاوی کے سپرد کیا تھا اُس کے متعلق ہدایت یہ تھی کہ وہ تابوت عہد رب کے پہلو میں بیت المقدس کے اندر رکھا رہے لیکن اس کے بعد تابوت عہد رب میں جو انقلابات ہوئے اُن میں اس نسخہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم نے ان انقلابات کا پتہ بائبل کے پورے حوالوں کے ساتھ درج کیا تھا اور پھر ہم نے لکھا تھا کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نسخہ تابوت کے پاس بیت المقدس کی محراب کے اندر موجود تھا تو کیا وہ اُن ہولناک تباہیوں میں باقی رہ سکتا ہے جو بیت المقدس کی عمارت میں رونما ہوئے جن میں کئی مرتبہ بیت المقدس کے تمام خزانے اور وہاں کی ہر چیز بلا استثنا لوٹ لی گئی تھی اور ایک مرتبہ بیت المقدس کو نجاست سے اس طرح پاٹ دیا گیا تھا کہ آٹھ دن اس کی صفائی میں صرف ہوئے۔ ہدایت کے اصول پر ان واقعات کو دیکھنے سے یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ توریت کا اصلی نسخہ باقی نہ تھا اور وہ انقلابات و حوادث کی نذر ہو گیا تھا۔

(تیسرے) یہ کہ توریت کے اصلی نسخہ کے سوا کسی دوسرے نسخہ کا وجود بھی ابتداءً نہیں پایا نہیں جاتا تھا اور اس کی اشاعت بالکل محدود تھی بلکہ بالکل نہ تھی، اس لحاظ سے اگر اصلی نسخہ مفقود ہو گیا تھا تو اُس کا قائم مقام ملنا بھی ممکن نہ تھا۔

اور اس لیے اُس کے بجائے کوئی دوسری کتاب ایجاد کر لی جاتی یا اسی میں کمی زیادتی کر کے تراش خراش کی جاتی تو عام طور پر اُس کی شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اُس وقت کہ جب یوشیا بادشاہ کے زمانہ میں حلقیا کاہن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مجھے سفر الشریعۃ (توریت) دستیاب ہوا اور وہ سفر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُسے ایسا عجیب سمجھا گیا کہ بادشاہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور کاہنوں کو بلا کر ہدایت کی گئی کہ وہ خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں اس لیے کہ ان ہدایات پر جو اس دستیاب شدہ سفر میں مندرج ہیں آج تک ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے عمل نہیں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے توریت کا کوئی نسخہ موسائیوں کے ہاتھ میں موجود نہ تھا۔ پھر جب کہ توریت کا نسخہ اُن کے پاس تھا ہی نہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ حلقیہ نے جو کتاب توریت کہہ کر دی وہ حقیقۃً توریت ہی تھی۔

نیز اُس موقع پر جب سبھی بابل سے نجات پا کر آئے ہیں۔ تمام جماعت نے عزرا کاتب سے خواہش کی کہ وہ سفر توریت لا کر انھیں پڑھ کر سنائے۔ عزرا نے صبح سے دوپہر تک وہ کتاب سنائی، اس کے مضامین کو سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دوسرے دن تمام بڑے بڑے پادریوں نے عزرا کے پاس جمع ہو کر کہا کہ وہ اُن کو توریت کے معانی سمجھائے۔ اس میں بہت سے احکام ایسے تھے جن پر بالکل اب تک عمل نہیں ہوا تھا اور اب اُن پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔

اس سے بھی ثابت ہے کہ توریت کا وجود عزرا سے مخصوص تھا اور کاہنوں کے پاس تک اس کا پتہ نہیں تھا پھر جب توریت کا وجود اتنی محدود حیثیت رکھتا تھا تو اس کا اصلی حالت پر باقی رہنا صرف اسی ایک شخص کے ذاتی رحم و کرم کا پابند ہو اور کوئی ذریعہ اس کی حفاظت کا نہیں ہے۔

(چوتھے) یہ کہ خود کتاب مقدس میں متعدد جگہ اس کی تصریح موجود ہے کہ توریت میں تحریف ہوئی ہے اور اس درجہ کہ وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہو گئی ہے اور اس تحریف نے احکام شرعیہ کو بھی اُن کی اصلی حالت پر باقی نہیں رہنے دیا ہے اس کے پورے حوالے ہم نے اصل کتاب میں درج کیے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود یہ کہاں یقین کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ توریت یا اُس کا کوئی جزو بالکل وہی ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ اور پھر جب کہ اس میں آخر میں موسیٰ کی وفات کا قصہ اور بنی اسرائیل کی ان پر گریہ و زاری کا تذکرہ اور یہ کہ موسیٰ کے بعد پھر کوئی ویسا نبی بنی اسرائیل کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ تمام واقعات بھی مذکور ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ موسیٰ کی وفات کے بہت عرصہ کے بعد تصنیف ہوئی ہے۔

انجیل اور اُس کی موجودہ حیثیت کے متعلق میں نے تحریر کیا کہ انجیل کے متعلق بھی گوناگون وجوہ پر نظر کرنے سے اس امر کا کوئی اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ اناجیل میں وحی الٰہی کا کوئی ذرا سا بھی حصہ ہے۔

(پہلے) یہ کہ عیسیٰ کو جو انجیل ملی تھی وہ تو ایک ہی تھی۔ اس میں ایک سے زیادہ کی تعداد کا پتہ نہیں تھا لیکن وہ کتابیں جو اس نام سے تصنیف ہو گئیں ان کی تعداد ستّر اور اس سے زیادہ تک پہونچ گئی اور پھر مسیحی تاریخ کے چار سو سال

گذرنے کے بعد ان چار انجیلوں پر اتفاق ہوا جو اس وقت موجود ہیں آخر اسوقت میں ہم کیونکر سمجھیں کہ سچی انجیل انہی چار میں منحصر ہے اور پھر جب کہ ان چاروں انجیلوں میں آپس میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔

ان میں سے کس پر ایمان لانا ضروری سمجھا جائے اور کس کو معتبر؟ پھر اس کے کیا معنی کہ یہ چاروں صحیح ہیں اور چاروں الہامی حیثیت رکھتی ہیں۔

(دوسرے) یہ کہ مسیحی مذہب کی نشو و نما ناصرہ میں چند ایسے گیروں گے گرفتہ میں ہوئی تھی جنہیں علم و مذہب سے کوئی بہرہ نہ تھا اور نہ یہودیوں کے غلبہ کی وجہ سے اُن کو آزادی حاصل تھی۔ مسیح کے واقعات و حالات خود مسیح کے زمانہ میں قلم بند نہیں ہوئے اور نہ مسیح ہی کو کبھی خیال آیا کہ نہ اُن واقعات کو قلم بند کرالیں نہ وہ انجیل جو عیسٰی پر نازل ہوئی تھی اس کی نقل کسی نے محفوظ کی اور نہ اُس کو پورے طور پر حفظ اور ازبر یاد کیا مسیح کے اٹھائے جانے کے بعد جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا اس لیے مذہبی بنیادوں کے مضبوط کرنے کی فکر نہ ہو سکی۔

چند فقرے انجیل کے بعض اشخاص کو کہیں کہیں پر سے یاد تھے اُن میں بھی امتداد زمانہ نے تغیر و تبدل پیدا کر دیا جس کے بعد ہر ایک شخص نے ایک انجیل تیار کرنا شروع کر دی جس کی صحت کی بنیاد صرف اُس شخص کے قول پر تھی جس نے اُس کو بنایا ہے۔

(تیسرے) موجودہ اناجیل میں سب سے زیادہ معتبر انجیل متی سمجھی جا سکتی ہے اس لیے کہ وہ متی شاگرد حضرت مسیح کی لکھی ہوئی اور تمام انجیلوں سے پہلے تصنیف ہوئی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس انجیل کا اصلی نسخہ جو عبرانی زبان میں تھا اَب دنیا میں باقی نہیں ہے وہ شروع ہی میں مفقود ہو گیا تھا اس کے مفقود ہونے کے بعد یہ اُس کا ترجمہ نکلا ہے جو یونانی زبان میں ہے اور جو اب تمام دُوسری زبانوں کے تراجم کی اصل ہے لیکن اس ترجمہ کے مترجم کا کوئی پتہ نہیں ہے کہ وہ کون اور کس مذہب و ملت کا شخص تھا اور اس کا مقصد اس ترجمہ سے کیا تھا۔

انجیل متی کے علاوہ جو انجیلیں ہیں اُن کے مصنفین نے حضرت عیسٰی کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ان کی شخصیت بھی کوئی معین حیثیت نہیں رکھتی لوقا کے متعلق اب تک تحقیق نہیں ہوا کہ وہ تھا کون شخص یوحنا کی انجیل کے متعلق اکثر علمائے مسیحین کا یہ خیال ہے کہ وہ مدرسۂ اسکندریہ کے ایک طالب علم کا نتیجہ قلم ہے۔

(چوتھے) موجودہ اناجیل سے خود یہ ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی عیسٰی پر نازل شدہ کتاب انجیل نہیں ہے۔ وہ ایک تاریخ زندگی ہے جس کو مختلف اشخاص نے اپنی اپنی یادداشت اور نقطۂ نظر کے مطابق تحریر کیا ہے۔ اُن میں اول یا آخر میں صراحت کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے کہ یہ واقعات ہم کو معتبر راویوں سے معلوم ہوئے یا ان کو عیسٰی کے ایک شاگرد نے اپنے آنکھ سے دیکھا اور اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔ اس صورت حال کے بعد کون عقلمند ہوگا جو ان اناجیل کو الہامی ماننے پر تیار ہوگا۔

"وید مقدس کی اصلیت" کے بارے میں ہم نے بہت بسط و تشریح کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ ان ویدوں کی اصلیت اتنے پردوں میں مخفی ہے جن کا اٹھانا کسی طرح اُن کے عقیدت مندوں سے ممکن نہیں ہے۔

(پہلے) یہ کہ "وید کس پر نازل ہوئے"؟ یہی امر بہت مبہم ہے اور مسلمہ طور سے طے نہیں پایا ہے ہم نے اس سلسلہ میں

تمام وہ اختلافات تحریر کر دیے ہیں جو اس بارے میں پائے جاتے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ بھلا ایسی کتاب کا کیا وزن ہو سکتا ہے جس کے متعلق خود اس کے ماننے والے اب تک طے نہ کر سکے ہوں کہ وہ نازل کس پر ہوئی تھی؟

(دوسرے) یہ کہ وید خدائی کلام ہے یا مخلوق کا ساختہ! یہ بھی اب تک ہندوؤں اور آریوں میں مسلمہ حیثیت سے طے نہیں پایا ہے؟ اس کے شواہد ہم نے تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔

(تیسرے) یہ کہ وہ افراد جن کی طرف ان ویدوں کے تصنیف کی نسبت ہے بہت اچھے صاحب اخلاق و اوصاف لوگ نہیں تھے بلکہ اُن کی نسبت اس کے خلاف اوصاف کا تذکرہ ہوا ہے جس سے ان کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے

(چوتھے) یہ کہ وید جس صورت سے ابتدا میں ظاہر ہوا تھا وہ اُس صورت پر باقی بھی نہیں رہا اور اُس میں حسب دل خواہ تصرفات ہوتے رہے۔

(پانچویں) وید کسی غیر محدود زمانہ کے تعلیمات پر مشتمل تھا؟ ایسا بھی نہیں بلکہ اکثر ہندوؤں کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وید کے تعلیمات اب بالکل معطل بے کار اور بے اثر ہیں۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے کہ وید حقیقۃً خدا کا کلام اور موجودہ زمانہ میں واجب العمل اور لازم الاتباع ہے۔

مذکورہ بالا تمام کتب کے برخلاف جب ہم اسلامی کتاب "قرآن کریم" پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے اور اس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ملتی ہے جو اُس کے استناد و اعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت

امت اسلامیہ کہ جو قرآن مجید کی امانت دار اور اس کی حفاظت و نگہداشت کی براہ راست ضامن سمجھی جا سکتی ہے وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اُس کے صحیح تعلیمات سے کتنی ہی دور ہو گئی ہو اور اُس کی بنا پر اہل معنی اس پر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس نے ظاہر بظاہر قرآن کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا ہو اور اسلام کے اصول اساسی کو چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیا کے وجود میں قدم رکھا ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرہ دستار بنائے رہے۔

ساڑھے تیرہ سو صدی میں تاریخ کسی ایسے وقت کا پتہ نہیں دے سکتی جس میں مسلمانوں نے کھلم کھلا قرآن مجید سے روگردانی اور اسلام سے کنارہ کشی کی ہو۔

دُوسری خصوصیت

قرآن مجید کے متعلق ابتدا ہی سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ اُس کا نسخہ کسی خاص شخص یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور سے مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ اُسے لکھیں نقل کریں اور ازبر یاد کریں۔

تیسری خصوصیت

قرآن اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن بس اسی کو سمجھتا ہے جو مخصوص الفاظ پر مشتمل ہے اُن کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ نماز میں اُس کا پڑھنا لازم اور دُوسرے اوقات میں اس کی تلاوت اجر و ثواب کی باعث قرار دی گئی ہے۔

تراجم کو قرآنی احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ قرآن سمجھے جا سکتے ہیں۔

یہ بات توریت وانجیل میں نہیں ہے۔ انجیل متی کا تو اصلی زبان والا نسخہ ہی دنیا میں موجود نہیں اور دوسرے اناجیل وکتب عہدین اگرچہ بظاہر اصلی زبانوں میں موجود ہیں لیکن خود اُن کے ماننے والے ان کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لیے ہر سال ہزاروں زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوتے ہیں اور عیسائی مبلغین ہر شخص کو جو عیسائی جماعت میں داخل ہو اسی زبان کی بائبل دیتے ہیں جو اس شخص سے تعلق رکھتی ہے لیکن اصلی نسخہ کو توریت اور انجیل کے عام طور پر مسیحی افراد پڑھنا تو در کنار صورت تک نہیں دیکھتے۔

چوتھی خصوصیت

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالتمآبؐ بوقت ورود وحی قلم بند کرا لیا کرتے تھے اور پھر ان متفرق آیات کو بعد حضرت کی وفات کے کتابی صورت میں جمع کیا ایسے اشخاص نے جو خود حضرت کے صحابہ میں داخل اور حضرت سے براہ راست آیات قرآن کی سماعت کرنے والے تھے اور اس طرح وہ کمزوری جو اناجیل میں اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے لکھنے والوں میں سے بیشتر نے عیسٰی کی صورت بھی نہ دیکھی تھی قرآن میں پائی نہیں جاتی۔

پانچویں خصوصیت

قرآن مجید کی ابتدا، انتہا، اسلوب اور طریقۂ بیان سب اس کے کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا منادی ہے۔

وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی نہیں ہے جس میں ولادت سے لے کر وفات تک کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہو اور نہ اس میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو رسول کی وفات یا اس کے بعد کے حالات سے تعلق رکھتے ہوں اور نہ اس میں غیر خدا کی زبان سے اس قسم کے فقرات ہیں کہ اس کو میں نے مستند راویوں کے کلام سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ یا یہ وہ واقعات ہیں جنھیں کسی صحابی نے چشم دید مشاہدہ کی بنا پر نقل کیا ہے جیسا کہ عیسائیوں کی انجیل میں پایا جاتا ہے بلکہ اس میں ہر جملہ اور ہر فقرہ اس خصوصیت کا مظہر ہے کہ وہ خدا کی جانب سے نازل شدہ ہے اور اس میں ہر موقع پر ماضی وحال کے واقعات میں توازن کو ملحوظ رکھ کر اپنے زمانہ نزول کی تعیین میں واہمہ پردازیوں کا سدباب کیا ہے۔

چھٹی خصوصیت

قرآن کی اصلیت وحقیقت کے متعلق مسلمانوں میں باوجود آپس کے ہزارہا اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے قرآن مجید کو خداوند عالم کا نازل کردہ تسلیم کرتے ہیں اور اسمیں کسی انسان کی ساخت وپرداخت کا دخل نہیں سمجھتے ہیں۔

ساتویں خصوصیت

قرآن کے متعلق اس کے ماننے والے اس نقطہ پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری دور تک رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کے تعلیمات کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں وہ بقاؑ ودوام کے مالک ہیں اور ہر دور زمانہ کے لیے مساوی طور پر فائدہ مند اور صلاح وفلاح کے ضامن ہیں۔

آٹھویں خصوصیت

قرآن جب سے مدون صورت پر مسلمانوں میں منتشر ہوا اس کے ہر ہر لفظ اور جملہ کی جانچ پڑتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان اس کی کتابت، تفسیر، تشریح اور قرأت کی طرف متوجہ ہے

انھوں نے اس کے ذرا ذرا سے خصوصیات حتی کہ اعراب وطریق ادا وغیرہ کے متعلق ذرہ بینی سے کام لیا اور اس طرح قرآن مجید میں کسی غیر معلوم تصرف یا تحریف کا امکان باقی نہیں رہا جو اس کے استناد واعتبار کو صدمہ پہونچانے کا باعث ہو۔

نویں خصوصیت

یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے اجزاء کے صحت واعتبار کے لحاظ سے خود ہی اپنا معیار ہے اس لیے کہ عام ارباب قلم کی علمی وادبی شاہکاریں جو کسی پہلو سے امتیاز کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اُن میں قلم کا رنگ ڈھنگ اہل نظر کو ایک خاص پیمانہ کا عادی بنا کر اُن کی قوت ادراک کو امتیاز کا جوہر دے دیا کرتا ہے جس کی بناء پر ایک نادیدہ عبارت بھی اُن کے سامنے پیش ہو تو وہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ اُس کتاب یا مضمون کا جزو ہے یا نہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو اپنے مخصوص طرز ادا اور اسلوب بیان میں اس امتیاز کو لے کر دنیا کے سامنے آیا تھا جس نے عالم انسانیت کے جزو وکل کو اپنے معارضہ کی دعوت دے کر اُن سے عجز کا اعتراف کرا لیا اور جس کے سامنے تمام قوائے عمل اور انسانی ذرائع ووسائل نے اپنی شکست کا اقرار کر کے اس کی کامل فتح یابی کی تصدیق کر دی۔ اس کا مخصوص طرز بیان اور طریقۂ ادا صرف آیات کے فصل ووصل اور ان کے اختتامی فواصل میں منحصر نہیں ہے جس کا تتبع ایک انشاء نگار کے لیے دشوار نہ ہو۔ ورنہ علی محمد باب کی کتاب البیان اور حسین علی بہاء کی ایقان اور کتاب اقدس اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی حمامۃ البشریٰ وخطبہ عید الاضحیٰ میں اس جوہر کی کمی نہیں ہے بلکہ وہ اس کے الفاظ کی نشست اور جملوں کے جوڑ پیوند اور عبارت کی ساخت اور الفاظ ومعانی کے مخصوص توازن میں اس حیرت انگیز پیرایہ کا نام ہے جس نے غیروں کو جادو اور اپنوں کو معجزہ کہنے پر مجبور کیا جس کا نتیجہ ہے کہ جب فصیح سے فصیح عبارت میں قرآن مجید کا ایک جملہ آ جاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب۔

اس موقع پر بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ جامع نہج البلاغہ علامہ سید رضی طاب ثراہ کا کلام نقل کروں جو ممدوح نے اپنی کتاب تفسیر "حقائق التاویل ودقائق التنزیل" میں تحریر فرمایا ہے۔ اس بحث میں کہ قرآن میں حروف زائدہ کا وجود نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

انی لاقول ابدا انه لوکان کلام یلحق بغباره او یجری فی مضماره بعد کلام رسول اللهؐ لکان ذلك کلام امیر المومنین علی علیه السلام اذ کان منفردا بطریقة من الفصاحة لا تزاحمه علیها المناکب ولا یلحق بعقوه فیها الکادح المجاهد ومن اراد ان یعلم برهان ما اشرنا الیه من ذلك فلینعم النظر فی کتابنا الذی الفناه وسمناه بنهج البلاغة وجعلناه	میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کوئی کلام ہوتا جو قرآن کے گرد قدم کو پاتا یا اس کے میدان میں چل سکتا تو وہ رسالتمآبؐ کے کلام کے بعد پھر کلام ہو سکتا تھا امیر المومنین حضرت علیؑ کا اس لیے کہ حضرت فصاحت کے ایک ایسے طریقہ کے ساتھ مخصوص تھے جس میں دوسرے لوگوں کے کاندھے آپ سے ٹکراتے نہیں اور بڑے سے بڑے ان تھک کوشش کرنے والے اس تک پہونچ نہیں سکتے اور جو شخص ثبوت ڈھونڈھتا ہو ہمارے اس کلام کا وہ غور کی نگاہ ڈالے ہماری اُس

يشتمل على مختار جميع الواقع الينا من كلام امير المومنين ع فى جميع الانحاء والاغراض والاجناس والانواع من خطب وكتب ومواعظ وحكم وبوبناه ابوابا ثلثة تشتمل على هٰذه الاقسام مميزة مفصّلة وقد عظم الانتفاع به وكثر الطالبون له لعظيم قدر ما ضمنه من عجائب الفصاحة وبدايعها وشرايف الكلم ونفائسها وجواهر الفقر وفرائدها وكلامهٗ مع ما ذكرنا من علو طبقته وخلو طريقته وانفراد طريقه فانه اذا حول ليلحق غاية من ادنىٰ غايات القراٰن وجدنا كصا متقاعسا ومقهقرا راجعا وواقفا بليدا وواقعا بعيدا على انه الكلام الذى وصفناه بسبق المجارين والعلو على المسامين فما ظنك بدون ذلك من كلام الفصحاء وبلاغات البلغاء الذى يكون بالقياس اليه هباء منثورا وسرابا غرورا وهٰذا الذى ذكرنا ايضا من معجزات القراٰن اذا تأمله المتامل وفكّر فيه المفكر اذا كان الكلام المتناهى الفصاحة العالى الذروة البعيد المرمىٰ والغاية اذا قيس اليه وقرن به شال فى ميزانه وقصر عن رهانه وصار بالاضافة اليه قالصا بعد السبوغ وقاصرا بعد البلوغ ليصدق فيه قول اصدق القائلين سبحانه اذ يقول وانه لكتاب

کتاب پر جسے ہم نے جمع کیا ہے اور "نہج البلاغہ" نام رکھا ہے اور اُس میں ہم نے امیر المومنین ع کے کلام سے جو ہم تک پہنچ سکا ہے خطب، کتب، مواعظ و حکم مختلف ابواب اور شعبوں کے متعلق انتخابات درج کیے ہیں اور اُسے مندرجہ بالا شعبوں کی تعداد کے مطابق تین بابوں پر منقسم قرار دیا ہے ۔ یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوی ہے اور عام طور سے لوگ اُس کے طالب ہوئے ہیں اس لیے کہ اس میں فصاحت کے عجیب انوکھے اور بے مثال رموز و اسرار اور بہترین الفاظ و فقرات کے جواہر ریزے ودیعت ہیں لیکن باوجود ان خصوصیات کے جو حضرت کے کلام کو حاصل ہیں جب اُسے لایا جائے قرآن کے سامنے کہ اس کے کسی معمُولی نقطۂ فصاحت کا مقابلہ کر سکے تو ہم دیکھتے ہیں اس کلام کو کہ وہ قدم پیچھے ہٹاتا اور الٹے پاؤں واپس ہوتا اور اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے ٹھہر جاتا اور دور ہی پر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے حالانکہ یہ وہ کلام ہے جس کے متعلق ہم نے بیان کیا کہ تمام فصحاء و بلغاء کے کلمات میں بلند ترین درجہ رکھتا اور سب سے آگے ہے تو پھر اب کیا خیال کیا جا سکتا ہے دوسرے فصحاء کے کلام کے متعلق جو اس کی نسبت اڑتے ہوئے ہوا کے ذروں اور نظر فریب سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور یہ جو ہم نے بیان کیا اگر انسان غور کرے تو قرآن مجید کے اعجاز کا نتیجہ ہے اس لیے کہ انتہا درجہ کا فصیح کلام جس کا کنگرۂ کمال بلند حیثیت رکھتا ہو جب قرآن کے ساتھ ملا کر دیکھا

عزيز لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد ۔

جاتا ہے تو اُس کا پلہ ہلکا ہو جاتا ہے اور وہ قرآن کے لحاظ سے باوجود وسیع الذیل ہونے کے کوتاہ دامن اور باوجود کامیاب ہونے کے ناکامیاب معلوم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ سچ ثابت ہو خداوند عالم کا قول کہ یہ مظفر و منصور کتاب ہے جس کے پاس باطل کا گذر نہیں ہو سکتا نہ سامنے سے نہ پس پشت سے' یہ اتاری ہوی ہے خدا کی جو بڑی حکمت والا اور مستحق حمد و ستائش ہے"۔

اس بنیاد پر جو ہم نے بیان کی ہے کسی ایک کلام کے متعلق جس کے جزو قرآن ہونے کی روایت بیان کی جائے یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ حقیقۃً وہ قرآن کا جزو ہے یا نہیں اور اسی لحاظ سے ہم نے یہ کہا ہے کہ قرآن خود اپنا معیار ہے اگر درایت کوئی چیز ہے اور روایت کا درایت پر منطبق ہونا عقلی لحاظ سے ضروری ہے تو کسی راوی کا قول کہ فلاں سورہ یا آیہ قرآن کا جزو تھا اسوقت تک قابل اعتماد نہیں جب تک وہ خود اپنے جزو قرآن ہونے کی گواہی نہ دے رہا ہو اور اس طرح خواہ بعض اہلسنت کا روایتی سورۂ حفد و خلع ہو یا بعض شیعوں کا سورۂ ولایت کسی صورت پر جزو قرآن تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے اس لیے کہ جب ہم اس کو مسلمہ آیات قرآنی کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہی نسبت معلوم ہوتی ہے جو سنگریزوں کو گوہر شاہوار سے ۔ اس طرح اکثر اُن آیات کی حقیقت کھل جاتی ہے جن کے متعلق رطب و یابس جمع کرنے والے محدثین نے یہ لکھدیا ہے کہ وہ جزو قرآن مجید تھے اور نسخ تلاوت یا تحریف کی حیثیت سے حذف ہو گئے ہیں ۔

یہ خصوصیت قرآن مجید کی ایسی ہے جو اس کے علاوہ دُوسری آسمانی کتابوں میں پائی نہیں جاتی ۔ اس لیے کہ اُن کتابوں میں کوئی یقینی مقدار تعیین کے ساتھ ایسی بتائی ہی نہیں جا سکتی جو یقیناً خدا کا کلام ہو جس کو ہم شک و شبہ کی صورتوں کا معیار قرار دیں ۔

لیکن قرآن مجید میں اتنی مقدار کہ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے وہ باتفاق کل اور روایت و درایت دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے اور وہ مشکوک و مشتبہ صورتوں کے لیے معیار بننے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ اس کے علاوہ دُوسری کتابوں میں لفظ و معنی اور انداز بیان کے اعتبار سے کوئی ایسی ندرت بھی نہیں ہے جو کسی دُوسرے کلام میں پائی نہ جا سکے لیکن قرآن مجید اپنے ذاتی خصوصیات کی بنا پر بے شک اپنا معیار بننے کے قابل ہے اور اسی طرح وہ بے اصل توہمات کا قلع و قمع اور بے بات کی بات بنانے والوں کی زبان بندی کرنے کے لیے خود بہت کافی ہے ۔

چھٹا تبصرہ

"جمع قرآن"

قرآن مجید تدریجی حیثیت سے تقریباً بیس برس کے عرصہ میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ مختلف حالات اور واقعات کی مناسبت سے آیات اور کبھی مستقل سورے آپ پر اترتے اور آپ ان کی تبلیغ فرما دیتے تھے۔

درحقیقت اس صورت سے نازل ہونا اعجاز کے پہلو کو زیادہ نمایاں اور روشن بنانے کا باعث تھا۔ ایک پوری مکمل کتاب جس میں مختلف ابواب و فصول، مختلف رنگ کے مضامین اور مختلف علوم و فنون کے شعبے ہوں اُس کا جواب دینا زیادہ مشکل اور اس کے جواب میں اجتماعی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سپر انداختہ ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ تھوڑا تھوڑا کلام ایک ایک سطر یا اس سے زیادہ پیش ہوتا رہے اور ہر جز کے متعلق جواب دینے کا مطالبہ مساوی حیثیت سے قائم ہو۔ یقیناً اس صورت میں عام انسانی کلام کے حدود کو دیکھتے ہوئے جواب تیار کرنے کا موقع زیادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر ان کو ہر جز کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے اور تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا موقع بھی حاصل ہوتا رہتا تھا۔ ایک جاہل اور اُمّی قوم کو یہ موقع اُس وقت حاصل نہ ہوتا جب وہ مجموعی طور پر کتاب کی صورت سے نازل ہوتا۔ اس کے علاوہ مصالح تبلیغ اور اسباب تشریع کے لحاظ سے بھی اس تدریجی حیثیت کا قائم رہنا بہت اہم اور ضروری تھا اس لیے کہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے تشریع کی مصلحت ابتدائی زمانہ نبوت میں نہیں تھی اور پھر کچھ زمانہ گذرنے کے بعد اُن کی مصلحت پیدا ہوئی جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ "تذکرہ حفاظ شیعہ" میں لکھا ہے اسلام آیا تھا اُمّی گروہ میں جو زیادہ تر کتابت و قرأت سے عاری تھے اور کسی چیز کو لکھنے اور اس کو لکھ کر پڑھنے کے عادی نہیں تھے اس لیے ذوق حفظ اُن میں ترقی پر تھا۔ شعرا کے سو سو دو دو سو شعر کے قصیدے ازبر حفظ کر لیتے تھے اور بڑے بڑے مقررین کی تقریریں زبانی سنا دیتے تھے۔

قرآن کو تواتر کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ مذہبی تعلیمات کا سرچشمہ تھا۔ مسلمانوں کو احکام مذہبی اور حقائق اسلامی سے واقف کرنے کے لیے بھی اُن میں قرآن مجید کے شائع ہونے کی ضرورت تھی۔

اُن کی زبان عربی ہی تھی اور قرآن اُنہی کے روزمرہ اور محاورات کے مطابق نازل ہوا تھا اس لیے وہ اگر صرف قرآن کو حفظ ہی کر لیتے تب بھی اُس کے ظواہر الفاظ اور مندرجہ احکام سے واقف ہو جاتے۔ لہٰذا اُن کو احکام سے باخبر کرنے کی صورت ہی یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں قرآن کو حفظ کریں اور اس وجہ سے رسالتمآبؐ کی جانب سے قرآن کی تعلیم کے لیے لوگ روانہ کیے جاتے تھے اور مختلف اشخاص متفرق حیثیت سے جتنا ممکن ہوتا تھا قرآن مجید کے آیات کو یاد کرتے تھے۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی شے کا لوگوں کو محفوظ ہونا مضبوطی و استحکام میں کسی طرح اس کے کتابی صورت

میں شائع ہونے کے برابر نہیں ہے۔

کتاب اگر ایک دفعہ لکھ لی گئی اور اُس کا پورے طور سے مقابلہ کر کے تصحیح کا کام انجام دے دیا گیا تو وہ اب ہمیشہ کے لیے صحیح ہے جب تک خاص طور سے کوئی اُسکو مسخ نہ کرنا چاہے وہ غلط نہ ہو جائے گی لیکن حفظ ہر روز خطرہ کا مرکز ہے فرض کیا جائے کہ ایک دفعہ کسی حافظ نے بڑی جانفشانی و اہتمام کے ساتھ کسی بڑے حافظ سے قرآن یاد کر کے اُس کو سنا بھی دیا اور شروع سے آخر تک کہیں غلطی نہ ہوئی اور اُس نے تصدیق بھی کر دی لیکن طبع انسانی ہر وقت معرض تغیرات و انقلابات ہے۔ تھوڑے ہی دن کے فاصلہ میں بہت جگہ واؤ کی جگہ فؔ اور فؔ کی جگہ واؤ۔ مقدم کا موخر اور موخر کا مقدم ہو گیا۔ اب انسان نے جو اپنے حفظ کے رو سے پڑھا اگر اس کو تردد اور شبہہ پیدا ہو گیا کہ یہاں پر واؤ ہے یا فؔ تو خیر۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے اُستاد سے جا کر تجدید کرے لیکن اگر غلطی نے حفظ کی صورت اختیار کر لی اور توجہ بھی نہ ہوئی کہ یہاں کچھ کا کچھ ہو گیا تو وہ اسی غلطی پر قائم رہ گیا۔ اُسے تو یہ بھروسا ہے کہ میرا حفظ معیار امتحان میں کامل ثابت ہو چکا۔ اُستاد کی طرف سے سند حاصل کر چکا ہے۔ یہاں اُس میں کتنے انقلابات و تغیرات ہو گئے ہیں جن کی اُسے خبر بھی نہیں۔ یہ صورتیں انسان کے محفوظات میں اکثر پیدا ہوتی ہیں جن کی ہر شخص تصدیق کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام متمدن قومیں جو زیور علم و ادب سے آراستہ ہو گئیں وہ کتابت و تحریر کی پابند ہیں۔ کتاب بلاشبہ معلومات کے لیے ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط جائے پناہ ہے جس کی ضرورت علم و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ محسوس ہوئی ہے رسالتمآبؐ اگرچہ ایک اُمّی قوم میں مبعوث ہوئے تھے، آپ نے ان پڑھ جماعت کے اندر نشو و نما پائی تھی اور آپ بھی اپنی انسانی فطرت کی بنا پر جس حد تک شان رسالت کے خلاف نہ ہو اُن کے اخلاق و اوصاف سے متصف اور ان کے شریک و حصہ دار تھے لیکن روحانی تعلیم اور خداوندی وحی کے فیض و برکت سے آپ حکیم کامل اور عظیم فلسفی کا درجہ رکھتے تھے اور آپ اُس حکیمانہ رمز سے پورے طور پر مطلع تھے جو آپ کے ساختہ و پرداختہ شاگرد اور روحانی فرزند امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ نے آپ کے بعد فرمایا تھا۔ کہ قیدوا العلم بالکتابة "علمی فوائد کو کتاب کے ذریعہ سے مقید و محفوظ کرو" اسی کا نتیجہ تھا کہ رسالتمآبؐ نے صرف اُس عادت کے مطابق جو عام ابنائے زمانہ کی تھی۔ قرآن مجید کے متعلق زبانی محفوظ ہونے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اہتمام فرمایا کہ جو کچھ نازل ہو وہ فوراً قید تحریر میں لے آیا جائے اور اسی لیے ایک جماعت کاتبان وحی کی مقرر فرمائی جو ہر آیت کو نزول کے بعد ہی حضرت کے ارشاد کے مطابق فوراً لکھ لیا کرتے تھے جس چیز پر بھی کہ وقتی حیثیت سے ممکن ہو پتھر یا چمڑے کے ٹکڑے یا درخت خرما کی چھال یا کوئی اور چیز جو اُس وقت موجود ہو۔

یہ قرآن مجید کے تمام آیات کا ایک مکمل نسخہ تھا جو متفرق اور غیر مرتب صورت پر موجود تھا اس کے لیے ضرورت تھی کہ وہ یکجا ترتیب کے ساتھ کتابی صورت میں مدون کر دیا جائے۔

اُس کا اس ترتیب کے ساتھ کہ جس طرح وہ نازل ہوا تھا مرتب کرنا عام صحابہ کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے کہ وہ مکتوبی حیثیت سے موجود تھا تو اجزاء، اوراق، اور کاغذ کے صفحات پر نہیں تھا کہ صرف اس کی ترک ملا لی جائے اور بس۔ بلکہ وہ آیتیں تھیں متفرق اور پراگندہ چھوٹے چھوٹے چمڑے کے حصوں پر پتھر کے ٹکڑوں پر اور درخت خرما کی چھالوں پر وہ سب کسی انسان

کے سامنے رکھے جائیں تو کون بتلائے کہ کیوں کر انھیں اصل سلسلہ کے مطابق مرتب کیا جائے اس کے لیے ضرورت ہے کہ تمام آیات، اُن کی ترتیب، تاریخ و شان نزول بالکل پیش نظر اور محفوظ ہو اور اُس کے مطابق قرآن کو جمع کیا جائے۔

پھر صحابہ کرام تو ہر وقت رسولؐ کی خدمت میں موجود نہیں رہتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے حضرات مدینۂ منورہ کی جانب ہجرت کے بعد اسلام لائے تھے اور قرآن اس کے پہلے سے نازل ہو رہا تھا ان میں سے بہت تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے۔ ان کو اتنی بھی مہلت نہ تھی کہ وہ قرآن مجید پورا یاد کر لیتے۔ چہ جائیکہ اس کے آیات کی پوری ترتیب اور شان نزول۔

بے شک اس کے لیے ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس کو خاص طور سے رسولؐ کی جانب سے علم قرآن حاصل ہوا ہو جو آیات کی ترتیب اور شان و کیفیت نزول سے پورے طور پر مطلع ہو اور کہتا رہتا ہو کہ میں جانتا ہوں کون آیت سفر میں نازل ہوئی، کون حضر میں، کون دن کو کون رات کو اور کون زمین ہموار میں، کون پہاڑ کی بلندی پر۔

بے شک ایسی ذات حضرت علی بن ابی طالبؑ کی تھی۔ رسولؐ کی ودیعتیں اور رسالت کی خاص امانتیں سب انہی کے سپرد تھیں اور قرآن مجید کا کتوبی مجموعہ بھی جیسا کہ بالاشکل میں تھا وہ بھی آپ ہی کی طرف منتقل ہوا۔ آپ کے متعلق رسالتمآبؐ نے بارہا تصریح فرمادی تھی کہ "علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ"۔ حضرتؐ نے اُن کو قرآن کے ساتھ ایک ساتھ ذکر فرما کر انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهل بیتی کے الفاظ میں یہ بھی پتہ دے دیا تھا کہ قرآن کے متعلق اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو اُس کے حل کرنے والے یہی بزرگوار ہیں۔

رسولؐ کا انتقال ہو گیا۔ دنیا والوں کے دلوں پر دنیا کی فکر کا غلبہ ہو گیا اور اُس کے لیے کمیٹیاں۔ کانفرنسیں۔ جلسے اور شورے ہونے لگے اور سلطنت کے حصول کے لیے فکر و عمل کی تمام طاقتیں صرف ہونے لگیں رسولؐ کے گھرانے والے اپنے انتہائی رنج و غم کے عالم میں اور اُس قیامت کے دور میں جو اُن کے سر پر رسولؐ کی وفات نے ڈھا دی تھی ان تمام افعال و حرکات کانفرنسوں اور جلسوں کے انعقاد اور جاری شدہ کارروائیوں سے بالکل بے تعلق تھے انھیں اس کا موقع بھی نہ تھا کہ وہ ان امور کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اور دوسرے افراد اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کی محویت میں اُن سے بے تعلق تھے اور انھیں اس کی مہلت نہ تھی کہ اُن کی طرف متوجہ ہو سکیں اس گوشہ گیری، کس پرسی اور غم و رنج کی فراوانی کے عالم میں سب سے پہلی فکر جو حفاظت مذہب کے اصل ذمہ دار اور شریعت و دین پیغمبر کے سب سے بڑے حامی و محافظ حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ کو پیدا ہوئی وہ قرآن مجید کے کتابی صورت میں یک جا کر دینے کی تھی۔

حضرت نے اپنے اوپر حتمی طور سے یہ پابندی عائد کر لی کہ آپ اپنی عبا اپنے دوش پر نہ ڈالیں گے جب تک قرآن مجید کو ترتیب کے ساتھ مجتمع نہ فرمالیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت نے قرآن کو اُس کی ترتیب نزول کے مطابق مجتمع فرما دیا۔

یہ سب سے پہلا مصحف تھا جو اسلام میں کتابی صورت سے مدون ہوا۔ حق و حقیقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان اسی مصحف کو اپنا کعبہ مقصد اور قبلہ مراد سمجھتے، اسی کو اصل قرار دیتے، اس کی نقلیں لیتے۔ پڑھتے پڑھاتے اور حفظ کرتے اور اُسی کی اشاعت کی کوشش کرتے۔

لیکن خدا بھلا کرے سیاسی مصالح کا جن کی بنا پر علیؑ کی شخصیت کو بھلا دے میں ڈالنا ضروری تھا، وہ شخصیت کہ اگر کہیں اس کے کمالات دنیا میں پھیلیں اور رونما ہوں تو دوسرے نقش مدھم ہو جائیں اور نظر اعتبار سے گر کر فنا کے درجہ پر پہونچ جائیں، وہ مصالح اس کے مقتضی نہیں تھے کہ علیؑ کے بڑے سے بڑے کام کو بڑا سمجھ کر اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا۔ پھر بالخصوص ایسا اہم کارنامہ یعنی قرآن کا معاملہ جس پر دین و مذہب کی بنیاد ہے جس کا سہرا اگر آپ کے سر بندھ جاتا تو تمام مسلمان آپ کے دست نگر اور ممنون احسان ہو جاتے اور آپ کا مذہبی اقتدار تمام مسلمانوں پر قائم ہو جاتا۔

اس وجہ سے سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کے جمع کیے ہوئے مصحف کی طرف توجہ نہ کی جائے اور وہ زینت طاق نسیان بنا دیا جائے۔ علیؑ نے جمع قرآن میں اپنی مصروفیت کا اظہار کر دیا سب کو معلوم ہوا کہ آپ یہ کام انجام دے رہے ہیں اور آپ نے پھر انجام بھی دے دیا۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس پر کوئی توجہ نہیں ہوئی اور اُسے لے کر غور سے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی حضرت نے یہ دیکھا تو خاموش ہو گئے اور اپنے جمع کردہ مصحف کو سلک مروارید کی طرح اپنے خزانۂ خاص میں محفوظ کیا۔ اس طرف سیاسی تحریک شباب پر تھی۔ سیاسی پیچیدگیوں کا ہجوم تھا۔ اطراف و جوانب کے قبیلوں نے بغاوت کی تھی۔ اور حکومت کے تمام اجزاء اُن بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف تھے اس لیے ڈیڑھ ایک برس اس کی طرف کوئی توجہ بھی نہ کی گئی کہ قرآن کے مجتمع ہونے کی ضرورت ہے۔ بے شک جب لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں حاملان قرآن کے قتل ہونے کے سبب قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالتمآبؐ کے آخری زمانہ کے صحابہ میں سے ایک فرد تھے۔

اُنھوں نے بڑی جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ مختلف صحابۂ کرام کے متفرق اجزاء سے جو پتھر، چمڑے لیف خرما وغیرہ پر تھے اور نیز اُن سے دریافت کر کے اُن کے محفوظات کی مدد سے قرآن مجید جمع کیا، اس میں یقیناً کوئی فرو گذاشت اور کمی نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ترتیب نزول کے مطابق نہیں تھا۔

اس سے بے شک ایک خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ناسخ و منسوخ کی معرفت دشوار ہو گئی اور بعض آیات کی تاویل و تفسیر مشکل ہو گئی جو خود سیاق کلام سے مستفاد ہو سکتی تھی لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جو قرآن مجید کی حفاظت اور اس افادی حیثیت پر کوئی اثر ڈالتی اور رخنہ انداز ہوتی۔

امیر المومنینؑ کو جو مفاد اسلامی کے محافظ اور حقیقی ذمہ دار تھے یہ امر نامناسب معلوم ہوا کہ آپ اپنے جمع کردہ قرآن مجید کو اب ظاہر کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں کیونکہ اس صورت میں یقیناً قرآن مجید کے ایسے اہم مسئلہ میں مسلمانوں کے اندر دو فرقے پیدا ہو جاتے یعنی مسلمانوں کا قرآن بھی ایک نہ رہ جاتا اور دو ہو جاتے۔

آپ کو مفاد اسلامی کی حفاظت اسی میں نظر آئی کہ آپ جمع قرآن کے سلسلہ میں اُن لوگوں کی قرارداد کو منظور کر لیں اور جس مجموعۂ قرآن پر اُن لوگوں کا اتفاق ہو گیا تھا اُسی سے آپ بھی اتفاق فرمالیں اور اُس کا امضا فرمادیں۔

اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اُس قرآن کی حفاظت پر جو بین الدفتین موجود ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ

باقی نہیں رہا۔

اگر اس قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کوئی ایسی خرابی کمی یا زیادتی کی ہوتی جو اس کی حقانیت پر اثر ڈالتی تو یقیناً حضرت علیؑ پر یہ لازم تھا کہ وہ اس حقیقت کو آشکارا کرتے، اپنے پاس والے قرآن کو پوری کوشش کے ساتھ ظاہر فرما دیتے اور اس میں ایک دم کی بھی تاخیر جائز نہ سمجھتے اس لیے کہ تقیہ بھی ایسی بات میں جائز نہیں ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اصل دین و بنیاد مذہب ہو اور جس پر تمام شریعت کی بنیاد قائم ہو۔

امیرالمومنینؑ کا صرف سکوت ہی کرنا اُس قرآن کے مقابلہ میں جو عام طور سے مسلمانوں میں شائع ہو رہا تھا اُس کی حقانیت کی ایک حقیقی و واقعی دلیل ہے۔

اور پھر حضرت کے کلمات کے مطالعہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اسی قرآن کے اتباع کی دعوت دی اور اسے معاش اور معاد کے تمام معاملات میں حجت خدا بتلایا ہے۔ نہج البلاغہ میں جو آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

اللہ اللہ ایھا الناس فیما استحفظکم من کتابہ واستودعکم من حقوقہ فان اللہ سبحانہ لم یخلقکم عبثا ولم یترککم سدی ولم یدعکم فی جھالۃ ولا عمی قد سمّی آثارکم وعلم اعمالکم وکتب آجالکم وانزل علیکم الکتاب تبیانا لکل شیئ وعمّر فیکم نبیّہ ازمانا حتی اکمل لہ ولکم فیما انزل من کتابہ دینہ الذی رضی لنفسہ۔

خدا کا خوف کرو اے مردم کتاب خدا کے بارے میں جس کی نگہداری کا وہ تم سے طالب ہوا ہے اور اس کے حقوق کا تمہیں امانتدار بنایا ہے۔ خدا نے تم کو عبث نہیں پیدا کیا اور نہ مہمل و بے کار چھوڑا اور نہ جہالت و کورچشمی میں تم کو چھوڑ رکھا اس نے تمہارے حالات کو نامزد کر دیا اور تمہارے اعمال پر نشان کھینچ دیے اور تمہاری عمروں کو لکھ لیا اور تم پر کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کے بیان پر مشتمل ہے اور اس نے تمہارے درمیان اپنے نبی کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہاں تک کہ اُس نے ان کے لیے اور تمہارے لیے اس کتاب میں جو نازل کی ہے اپنے اس دین کو مکمل کر دیا جسے اُس نے اپنے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے۔

دوسرے خطبہ کی عبارت :-

تعلّموا القرآن فانہ احسن الحدیث وتفقھوا فیہ فانہ ربیع القلوب واستشفوا بنورہ فانہ شفاء للصدور واحسنوا تلاوتہ فانہ انفع القصص

قرآن کی تعلیم حاصل کرو اس لیے کہ وہ بہترین کلام ہے اور اُس کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کرو اس لیے کہ وہ کشت دل کے لیے بہار ہے اور اس کی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو اس لیے کہ وہ سینوں کے لیے شفا ہے اور اس کی تلاوت کرو کیونکہ وہ بہترین واقعات کا تذکرہ ہے۔

تیسرے موقع پر تحکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

انا لم نحکّم الرّجال و انما حکمنا القرآن وھذا القرآن انما ھو خطّ مسطور بین الدّفتین لا ینطق بلسان ولا بدّلہ من ترجمان وانّما ینطق عنہ الرّجال ولمّا دعانا القوم الی ان نحکّم بیننا القرآن لم نکن الفریق المتولی علی کتاب اللہ تعالیٰ۔

ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ قرآن وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت سے موجود ہے وہ زبان سے تو بولتا نہیں۔ اُس کے لیے ترجمان کی ضرورت ہے، انسان وہ ہوتے ہیں جو اُس کی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں بنے کہ جو قرآن سے روگردانی کرنے والی ہو۔

چوتھے مقام پر ایک کلام کے ضمن میں۔

انما حکّم الحکمان لیحییا ما احیی القرآن ویمیتا ما امات القرآن واحیاؤہ الاجتماع علیہ واماتتہ الافتراق عنہ فان جرّنا القرآن الیھم اتبعناھم وان جرّھم الینا اتبعونا۔

دونوں حکم اس لیے مقرر ہوئے تھے کہ وہ زندہ کریں اُس بات کو جسے قرآن زندہ کرے اور مردہ کریں اُس بات کو جسے قرآن مردہ کرتا ہے۔ قرآن کی بات کو زندہ کرنے کے معنی اُس پر متفق ہونا ہے اور اُس کو مردہ کرنا اس کو چھوڑ کر الگ ہو جانا ہے تو اگر قرآن ہم کو کھینچے ہمارے مخالفین کے مطالبہ کی طرف تو ہم گردن جھکالیں اور اگر انہیں کھینچے ہماری طرف تو وہ ہمارے تابع فرمان ہو جائیں۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

کتاب اللہ بین اظھرکم ناطق لا یعیی لسانہ وبیت لا تھدم ارکانہ وعزّ لا تھزم اعوانہ۔

خدا کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے۔ یہ وہ بات کرنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں اور وہ سرمایۂ عزت ہے جس کی حمایتی شکست کھانے والے نہیں ہیں۔

ایک اور موقع پر ہے۔

انہ سیأتی علیکم من بعدی زمان لیس فیہ شیئ اخفی من الحق ولا اظھر من الباطل ولا اکثر من الکذب علی اللہ ورسولہ

یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی۔ اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی۔ جب اس کو حق تلاوت ادا کرتے ہوئے پڑھا جاوے

ولیس عند اهل ذلك الزّمان سلعة
ابور من الکتاب اذا تلی حق تلاوته
ولا انفق منه اذا حرّف عن مواضعه
ولا فی البلاد شیئ انکر من المعروف
ولا اعرف من المنکر فقد نبذ الکتاب
حملته وتناساه حفظته فالکتاب
واهله یومئذ طریدان منفیّان
وصاحبان مصطحبان فی طریق واحد
لا یؤویهما مؤو فالکتاب واهله فی
ذلك الزمان فی الناس ولیسا فیهم
ومعهم لان الضلالة لا توافق
الهدیٰ وان اجتمعا فاجتمع القوم
علی الفرقة و افترقوا عن الجماعة
کانهم ایمّة الکتاب و لیس الکتاب
امامهم فلم یبق عندهم منه
الا اسمه ولا یعرفون الا خطّه
وزبره۔

یعنی اس کے صحیح معنی کے ساتھ اس کے آیات کو پیش کیا جائے اور اسی قرآن سے زیادہ کوئی شئے رائج نہ ہوگی جب کہ اس کو اس کے مقررہ مقامات سے ہٹا دیا جائے (یعنی اس کے معانی میں تراش خراش کر کے اصلی مقاصد سے دور کر دیا جائے) کوئی شئی عالم میں معروف سے زیادہ منکر اور منکر سے زیادہ معروف نہ ہوگی، قرآن کو اس کے حاملین نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اس کے حفظ کے دعوے دار افراد نے اس کو بھلا دیا ہوگا۔
اُس دن قرآن اور حقیقی اہل قرآن شہر بدر اور جلا وطن ہوں گے وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم نفس اور ہمدم ہوں گے کہ ان دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ملتا ہوگا۔ قرآن اور اہل قرآن اس وقت لوگوں کے درمیان ہوں گے لیکن گویا وہ اُن کے اندر اور اُن کے ساتھ نہیں ہیں اس لیے کہ ضلالت ہدایت کے موافق نہیں ہو سکتی اگرچہ ایک جگہ پر ہو وہ لوگ افتراق پر مجتمع اور نقطۂ اجتماع سے متفرق ہوں گے گویا وہ خود قرآن کے رہنما ہیں (کہ جدھر چاہیں اس کو پھیر لیں) قرآن ان کا رہنما نہیں ہے۔ ان کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اس کے خط و حروف کو پہچانتے ہونگے"

ایسے ہی اور بھی بہت سے مقامات ہیں جن کو کافی تبصرہ کے ساتھ ہم نے اپنے رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" میں درج کیا ہے اور جو عبارتیں یہاں بطور مثال پیش کی گئی ہیں ان کے متعلق بھی وہاں کافی تشریح کر دی گئی ہے۔

امیر المومنینؑ کے بعد دوسرے آئمہ معصومینؑ بھی برابر اسی طریقہ پر قائم رہے اور باوجود اختلاف ازمنہ و حالات کے اور بہت سے ایسے واقعات کے جن میں تقیہ کا پردہ بہت ہلکا ہو گیا تھا اور زمانہ بیان حقیقت کا پورے طور سے مقتضی تھا انھوں نے برابر اسی قرآن کی تبلیغ و تعلیم کی اور اسی کو خلق خدا کے لیے حجت اور واجب العمل بتلایا، حدیثوں کے صحت و اعتبار کا اُسے معیار قرار دیا اور یہ کہا کہ جو حدیث کتاب خدا کے خلاف ہو وہ ساختہ و پرداختہ اور بالکل باطل ہے یہ حدیثیں اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ اُن سے کتب احادیث و اخبار چھلک رہے ہیں اور "تحریف قرآن کی حقیقت" کے آخری حصہ میں ہم نے ان احادیث کے کافی حوالے درج کر دیے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیعہ برابر ائمہ اہلبیت کے اتباع کا دم بھرتے رہے ہیں۔ اُن کا مذہب ان کے عقائد اُن کے مسائل و احکام سب ائمہ اہلبیت کے اقوال و ارشادات پر مبنی قرار پائے ہیں جس کا بعض منصف مزاج ان کے مخالفوں

نے اعتراف بھی کیا ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام تو قرآن مجید کو حجت و سند بتلائیں۔ اس سے احتجاج و استناد کریں اس سے تمسک کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائیں بلکہ اس کو احادیث کی صحت کا معیار قرار دیں اور شیعہ بحیثیت مذہب اس کے برخلاف قرآن کی صحت میں شک کریں، اس کے اعتبار میں قدح کریں اور اس میں زیادتی یا کمی کے قائل ہوں جس سے اس کی سند مشکوک ہو جائے اور وہ قطعی حیثیت سے کلام الٰہی باقی نہ رہے۔
ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اکابر علمائے شیعہ جن کے اقوال و تحقیقات کے محور پر تشیع کے آسمان نے گردش کی ہے اُن کے اقوال و تصریحات اس کے خلاف ہیں۔ انھوں نے تصریح کی ہے کہ ہم قرآن مجید میں کسی زیادتی یا کمی کے قائل نہیں ہیں۔ جس سے اس کی صحت و اعتبار میں کوئی شبہ واقع ہو سکے۔
یہ قرآن مجید کے ساتھ دوستی نہیں ہے کہ بہت سے دعویداران اسلام صرف اپنے اسلام کو ممتاز درجہ دینے کے لیے شیعوں کی طرف بحیثیت مجموعی اس عقیدہ کی نسبت دیتے اور اس پر ضد کرتے رہیں کہ وہ قرآن میں زیادتی اور کمی کے قائل ہیں اور اس کو معتبر نہیں سمجھتے۔
یہ وہ چیز ہے جو غیر مسلمین کی نظر میں قرآن مجید کی اہمیت کو کم کرنے کا سبب ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب تم یعنی مسلمانوں میں کا ایک بڑا فرقہ خود قرآن مجید کی صحت میں شک رکھتا ہے تو تم اس کو ہمارے سامنے بحیثیت کلام الٰہی پیش کرنے کا حق رکھتے ہو۔
اس کی ذمہ داری انھی ناعاقبت اندیش مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جو مناظرہ کے میدان میں صرف اپنی بات کو بالا رکھنے اور عوام کے خیالات کو اپنے مخالف فریق سے برگشتہ کرنے کے لیے اس فریق کی طرف ایسے اقوال کی نسبت دیتے ہیں جس سے وہ بالکل بری ہے اور اُس سے انکار کا اظہار کرتا ہے۔
ہم نے بارہا اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید اسی دونوں دفتیوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کسی قسم کا شبہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلام آلٰہی، رسول کا اعجاز، اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لیے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔
پھر اب دور از کار بحثوں سے فائدہ کیا اور اس اصرار کی ضرورت کرنسی کہ نہیں، تمھارا ایمان قرآن پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔
ہمارا ایمان ہے یا نہیں۔ یہ ہمارے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے لیکن یاد رکھئے کہ آپ کے اس قول سے غیر مسلم فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس سے اسلام ضعیف ہوتا ہے۔ اب آپ اپنے اسلام کی خبر لیجیے جو کفر کا مددگار ثابت ہو رہا ہے۔
ہیں نے اپنی مستقل کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" اسی الزام کے دفیعہ میں لکھی اور اس میں مستند علمار کے تصریحات درج کیے جن سے قرآن مجید کے متعلق فرقہ شیعہ کا نقطۂ نظر صاف طریقہ سے بے نقاب ہوتا ہے۔
ہیں نے اس رسالہ میں اُن تمام علمار کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے قرآن مجید میں کسی قسم کے بھی نقص و زیادتی

واقع ہونے کا انکار کیا ہے اور پھر مَیں نے اُن روایات پر نظر ڈالی ہے جن سے تحریف قرآن کے پتہ چلنے کا خیال کیا جاتا ہے۔ اور میں نے اُن روایات کے متعلق جرح کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر روایات تحریف معنوی کی دلیل ہیں اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جو جزء بطور تفسیر و تشریح تھا وہ حذف ہوا ہے اور اصل قرآن میں سے کچھ ساقط نہیں کیا گیا ہے

یہ عجیب بات ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت بلکہ شاید دُوسری مرتبہ کے بھی طباعت کے بعد عراق کے مشہور علمی مجاہد، متکلم بزرگوار آیۃ اللہ الشیخ محمد جواد البلاغی طاب ثراہ کی تفسیر "آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن" چھپ کر ہندوستان آئی اور اُس میں مَیں نے دیکھا کہ تحریف کے باب میں بالکل وہی مسلک اختیار کیا گیا ہے جو میں نے اپنے رسالہ میں اختیار کیا تھا یہاں تک کہ اُس مسلک کے ثبوت میں جو دلائل و شواہد پیش کیے گئے وہ بھی تقریباً وہی تھے کہ جو مَیں نے اپنے رسالہ میں درج کیے تھے

میں اپنے اس مقدمہ میں چاہتا ہوں کہ اس بحث کے متعلق ممدوح کے افادات عالیہ کو زینت وہ قرطاس بناؤں تاکہ ایک طرف اس کتاب میں یہ بحث تشنہ نہ رہ جاے۔ دُوسری طرف ایک ایسے محقق کے کلمات سے عام افراد کو مستفید ہونے کا موقع ملے۔ تیسری طرف جو کچھ میں نے اپنے رسالہ میں لکھا تھا اُس کی پُوری پُوری تائید ہو جائے اور معلوم ہو جاے کہ وہ صرف میرے ذاتی خیالات نہیں ہیں بلکہ اکابر محققین اس خیال میں مجھ سے متفق اور میرے ہم آواز ہیں۔

ملاحظہ ہو "آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن" ج ا مطبوعہ مطبع "العرفان" صیدا ص ۲۵ - ۲۹

قول الامامية بعدم النقيصة فی القرآن

لا يخفیٰ ان شيخ المحدّثين والمعروف بالاعتناء بما يروی وهو الصّدوق طاب ثراه قالَ فی كتاب الاعتقاد اعتقادنا ان القرآن الذی انزل الله علیٰ نبيّهٖ هو ما بين الدفتين وليس باكثر من ذلك ومن نسب الينا انّا نقول انه اكثر من ذلك فهو كاذب انتهیٰ وحمل الروايات الواردة فی النقصان علیٰ وجوه اخر- وفی اواخر فصل الخطاب عن كتاب المقالات للشيخ المفيد قدس سره انه قالَ جماعة من اهل الامامة انه (ای القرآن) لم ينقص من كلمة ولا من اٰية ولا من سورة ولكن حذف ما كان مثبتا فی مُصحف

(فرقۂ امامیہ کا قول۔ کہ۔ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی)

واضح ہو کہ طبقۂ محدثین کے استادِ کل، جن کی موشگافی احادیث کے نقل کرنے میں شہرۂ آفاق ہے یعنی جناب صدوق رہ وہ کتاب الاعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں" ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جسے خداوند عالم نے اپنے نبی پر نازل فرمایا وہ یہی ہے کہ جو دونوں دفتیوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں تھا اور جو شخص ہماری طرف نسبت دے کہ ہم اصلی قرآن کو اس سے زیادہ مانتے ہیں وہ بالکل جھوٹا ہے، موصوف نے ان تمام روایات کو جو کمی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں دُوسرے معانی پر محمول کیا ہے۔ فصل الخطاب کے آخری حصہ میں شیخ مفید رہ کی کتاب مقالات سے یہ عبارت درج کی ہے کہ فرقۂ امامیہ میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک کلمہ ایک آیت اور

امير المومنينؑ من تاويله وتفسير معانيه علیٰ حقيقة تنزيله وعن السيّد المرتضیٰ قدس سرّه قوله بعدم النقيصه وان من خالف فی ذلك من الامامية والحشوية لا يعتدّ بخلافهم فانّ الخلاف فی ذلك مضاف الیٰ قوم من اصحاب الحديث نقلوا اخبارا ضعيفة ظنّوا صحتها- وفی اول التبيان للشيخ الطوسی قده امّا الكلام فی زيادته ونقصه فممّا لا يليق به ايضا لان الزيادة فيه مجمع علیٰ بطلانها والنقصان فالظاهر ايضا من مذهب المسلمين خلافه وهو الاليق بالصحيح من مذهبنا وهو الّذی نصره المرتضیٰ وهو الظاهر فی الروايات غيرانه رويت روايات كثيرة من جهة الخاصة والعامة بنقصان كثير من اٰی القرآن ونقل شيئ منه من موضع الیٰ موضع طريقها الاحاد التی لا توجب علما ولا عملاً والاولیٰ الاعراض عنها انتهی وتبعه علیٰ ذلك فی مجمع البيان وفی كشف الغطاء فی كتاب القرآن المبحث الثامن فی نقصه لا ريب انه محفوظ من النقصان بحفظ الملك الدّيّان كما دلّ عليه صريح القرآن واجماع العُلماء

ایک حرف کی بھی کمی نہیں ہوئی ہے بے شک جناب امیرؑ کے جمع کردہ قرآن میں جو تاویل اور تفسیر اس کے معانی کی اس کے اصلی شان نزول کے موافق ہوئی تھی۔ وہ کم کر دی گئی ہے اور جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کا بھی قول ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور معدودے چند افراد جو فرقۂ امامیہ اور حشویہ میں کے اس کے خلاف قائل ہوگئے ہیں وہ توجہ کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ اس کے خلاف جو قول ہے وہ اخباریوں میں سے کچھ افراد کی طرف منسوب ہے، جنھوں نے کچھ ضعیف روایتوں کو صحیح سمجھ کر یہ قول اختیار کر لیا ہے۔ شیخ طوسی رہ کی کتاب تفسیر تبیان کے شروع میں ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی یا کمی کا سوال اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں ہے اس لیے کہ زیادتی کے نہ ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی اس کے متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ واقع نہیں ہوئی اور خصوصیت سے ہمارے مذہب میں بھی صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت جناب سید مرتضیٰ اعلیٰ اللہ مقامہ نے کی ہے اور احادیث سے بھی وہی ظاہر ہے۔ بے شک شیعہ اور سنی طرق سے بہت سی روایتیں ایسی وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی آیتیں قرآن کی کم ہوگئیں اور بعض اپنی جگہ سے ہٹ کر دُوسری جگہ پہنچ گئیں لیکن یہ روایتیں بطریق آحاد منقول ہیں جن پر نہ علم کی بنیاد ہو سکتی ہیں نہ عمل کی اور بہتر یہ ہے کہ ان روایات سے کنارہ کشی ہی اختیار کی جائے"۔ تفسیر مجمع البیان میں بھی بالکل اسی سے اتفاق کیا ہے اور کشف الغطاء کتاب قرآن میں ہے کہ "آٹھواں

فی کل زمان ولا عبرة بالنّادر و ما ورد من اخبار النقص تمنع البديهة من العمل بظاهرها اِلیٰ ان قال فلا بد من تاويلها باحد وجوه وعن الشيخ البهائی وايضا اختلفوا فی وقوع الزيادة والنقصان فيه والصّحيح ان القراٰن العظيم محفوظ عن ذلك زيادة كان او نقصانا ويدلّ عليه قوله تعالیٰ " وانّا له لحافظون " وما اشتهر بين الناس من اسقاط اسم امير المؤمنينؑ منه فی بعض المواضع مثل قوله تعالیٰ يا ايّها الرّسول بلّغ ما انزل اليك فی علیّ وغير ذلك فهو غير معتبر عند العلمآء وعن المقدس البغدادی فی شرح الوافية وانما الكلام فی النقيصه والمعروف بين اصحابنا حتی حكی عليه الاجماع عدم النقيصة ايضا وعنه ايضا عن الشيخ علی بن عبد العالی انه صنّف فی نفی النقيصة رسالة مستقلة وذكر كلام الصدوق المتقدم ثم اعترض بما يدلّ علی النقيصه من الاحاديث واجاب بان الحديث اذا جآء علیٰ خلاف الدّليل من الكتاب والسنة المتواترة والاجماع ولم يمكن تاويله ولا حمله

مبحث نقص قرآن کے بارے میں یقیناً قرآن مجید نقص کے عیب سے محفوظ ہے خدا کی غیبی حفاظت کے ساتھ جس پر صریحی قرآن کی آیت دلالت کر رہی ہے اور ہر زمانہ کے علماء کا اجماع بھی اسی کے موافق ہے اور شاذونادر بعض لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے۔ اور جو روایات ایسی ہیں کہ اُن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے ضرورت مذہب اُن کے ظاہر پر عمل سے مانع ہے لہٰذا کسی نہ کسی طرح ان کی تاویل کرنا چاہیے۔ شیخ بہائیؒ کا قول ہے کہ زیادتی اور نقصان کے متعلق اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور قول خداوند عالم کہ "ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" اس کی دلیل ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ امیر المومنینؑ کا نام تھا۔ وہ حذف ہوگیا جیسے یاایّھا الرّسُول بلّغ ما انزل الیك فی علیّ وغیرہ یہ بالکل غیر معتبر ہے" اور سید محسن بغدادی نے شرح وافیہ میں لکھا ہے کہ ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے اور جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ کمی واقع نہیں ہوئی۔ اور محقق ثانی) علی ابن عبد العالی کرکی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے پھر انھوں نے صدوق کا کلام ذکر کیا ہے اور بطور اعتراض ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے۔ جواب دیا ہے کہ حدیث جب قرآن اور احادیث متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اور اس کی تاویل ممکن نہ ہو تو اُسے ساقط کرنا چاہیے۔

ان تمام علماء کے برخلاف ہمارے ہم عصر محدّث

علی بعض الوجوه وجب طرحه. هٰذا وانّ المحدّث المعاصر جهد فی كتاب فصل الخطاب فی جمع الرّوايات الّتی استدلّ بها علی النقيصة وكثّر اعداد مسانيدها باعداد المراسيل عن الائمة عليهم السلام فی الكتب كمراسيل العياشی وفرات وغيرها مع ان المتتبع المحقق يجزم بان هٰذه المراسيل ماخوذة من تلك المسانيد وفی جملة ما اورده من الرّوايات ما لا يتيسر احتمال صدقها ومنها ما هو مختلف باختلاف يؤل به الی التّنافی والتعارض وهذا المختصر لا يسع بيان النّوعين الاٰخرين هذا مع ان القسم الوافر من الرّوايات ترجع اسانيده الیٰ بضعة انفار قد وصف علماء الرّجال كلا منهم امّا بانه ضعيف الحديث فاسد المذهب مجفو الرّواية واما بانه مضطرب الحديث والمذهب يعرف حديثه وينكر ويروی عن الضعفآء واما بانه كذّاب متّهم لا استحلّ ان اروی من تفسيره حديثا واحدا وانه معروف بالوقف واشدّ النّاس عداوة للرّضاء واما بانه كان غاليا كذّابا واما بانه ضعيف لا يلتفت اليه ولا يعوّل عليه ومن الكذّابين

(فاضل نوری) نے فصل الخطاب میں کوشش کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا ہے جن سے وہ قرآن میں کمی واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں اور ان روایات کے اسناد میں کثرت پیدا کی ہے اُن روایتوں سے کہ جو مرسل طریقہ پر (یعنی بغیر ذکر سند کے) تفسیر عیاشی و فرات ابن ابراہیم وغیرہ میں مذکور ہیں حالانکہ جو شخص جستجو کرے اور ذوق تحقیق رکھتا ہو وہ یقین کرے گا کہ یہ مرسل روایتیں انہی چند مسند روایتوں سے ماخوذ ہیں۔ اور پھر جو روایتیں اس سلسلہ میں ذکر ہوئی ہیں اُن میں سے بعض تو ایسی ہیں جو کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض آپس میں اتنا اختلاف رکھتی ہیں کہ خود ہی متعارض ہو جاتی ہیں اس مختصر کتاب میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ ان آخری دونوں قسموں کو توضیح کے ساتھ لکھا جائے۔ اس کے علاوہ اکثر مسند روایتیں جو ہیں ان کی سندیں چند اشخاص تک منتہی ہوتی ہیں جن میں سے کسی کے متعلق علمائے رجال لکھتے ہیں کہ وہ لا مذہب شخص ہے، اس کی حدیثیں کمزور اور روایتیں متروک ہیں، کسی کے متعلق یہ کہ اُس کے احادیث اور مذہب دونوں مشکوک ہیں، اس کی حدیث کبھی قابل قبول ہوتی ہے اور کبھی ناقابل قبول اور وہ کمزور راویوں سے احادیث کو نقل کرتا ہے اور کسی کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ غلط بیان اور ناقابل اعتماد ہے میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی تفسیر سے ایک

واما بانه فاسد الرواية يرمى بالغلوّ ومن الواضح انّ امثال هٰؤلاء لا تجدي كثرتهم شيئا ولو تسامحنا بالاعتناء برواياتهم فى مثل هٰذا المقام الكبير لوجب من دلالة الرّوايات المتعددة ان ننزلها على انّ مضامينها تفسير للاٰيات اوتاويل اوبيان لما يعلم يقينا شمول عموماتها له لانه اظهر الافراد واحقها بحكم العام اوما كان مرادا بخصوصه وبالنصّ عليه فى ضمن العموم عند التنزيل اوما كان هوالمورد للنزول اوما كان هوالمراد من اللفظ المبهم وعلى احد الوجوه الثلثة الاخر يحمل ما ورد فيها انه تنزيل وانه نزل به جبريل كما يشهد به نفس الجمع بين الرّوايات لما يحمل التحريف فيها على تحريف المعنىٰ ويشهد لذلك مكاتبة ابى جعفر عليه السّلام لسعد الخيرُ كما فى روضة الكافى ففيها وكان من نبذهم الكتاب ان اقاموا حروفه وحرّفوا حدوده وكما يحمل ما فيها من انه كان فى مصحف اميرالمومنين ؑ اوابن مسعود وينزل على انّه كان فيه بعنوان التفسير والتاويل وممّا يشهد لذلك قول امير المؤمنينؑ

روایت بھی نقل کروں اور یہ کہ وہ واقفی ہونے میں مشہور ہے اور امام رضاؑ سے سخت عداوت رکھتا تھا اور کبھی یہ کہ وہ غالی اور سخت دروغ گو تھا اور کبھی یہ کہ وہ کمزور تھا اور نظر اٹھا کے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہے اور اُس پر بھروسا نہیں تھا اور وہ انتہائی غلط بیان راویوں میں سے ہے اور کبھی یہ کہ اُس کی روایتیں بالکل خراب ہوتی ہیں۔ اُس کی غلو کی طرف نسبت دی گئی ہے ظاہر ہے کہ ایسے راویوں کی تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اور اگر ہم چشم پوشی کرکے اتنے بڑے اہم موقع پر ان لوگوں کی روایتوں کو قبول بھی کریں تو دُوسری متعدد روایتوں کی بنا پر ہم کو ان روایات کے معنی میں یہ کہنا چاہیے کہ جو فقرات ان میں حذف شدہ بتلائے گئے ہیں وہ تفسیر کی حیثیت رکھتے تھے یا تاویل تھے یا بیان تھے اُس فرد کا جو یقیناً اس عموم کے تحت میں داخل ہے اپنے اظہر افراد اور مستحق ترین فرد ہونے کی جہت سے حکم عام کے ساتھ یا اُس فرد کا جو عموم کے ضمن میں تنزیل قرآن کے وقت خصوصیت سے ملحوظ تھی یا اصل جس کے بارے میں آیت نازل ہوی تھی یا جو مبہم الفاظ (مائے موصولہ وغیرہ) سے مراد اصلی تھے۔ انہی آخری تین پہلوؤں پر محمول ہونا چاہیے اُن روایات کو جن میں لکھا ہے کہ یہ تنزیل ہے اور اس کو جبرئیل لے کر آئے تھے اور اس معنی کی دلیل خود ان روایات میں جمع کا عمل میں لانا ہے اور تحریف سے مراد

للزّنديق ولقد جئتهم بالكتاب كملامشتملا على التنزيل والتاويل وممّا اشرنا اليه من الرّوايات ان المحدث المعاصر اورد فى روايات سورة المعارج اربع روايات ذكرت ان كلمة (بولاية علي) مثبتة فى مصحف فاطمةؑ وهكذا هى فى مصحف فاطمةؑ ولايخفى ان مصحفها عليها السّلام انماهو كتاب تحديث باسرار العلم كما يعرف ذٰلك من عدة روايات فى اصول الكافى فى باب الصّحيفه والمصحف والجامعة وفيها قول الصّادقؑ ما فيه من قرانكم حرف واحد وما ازعم ان فيه قرانًا كما فى الصحيح والحسن ومنها مافى الكافى فى باب ان الائمة عليهم السّلام شهدآء على النّاس فى صحيحة بريد عن ابى جعفرؑ وروايته عن ابى عبداللّٰهؑ من قولهما فى قوله تعالىٰ وجعلناكم امّة وسطًا نحن الامة الوسطى وهى شرحه عن امير المومنين عليه السّلام ونحن الذين قال اللّٰه وجعلناكم امّة وسطا اذن فما روى مرسلا فى تفسيرى النعمانى وسعد من انّ الاٰية ايمّة وسطا لا بدّ من حمله على التفسير وان التحريف

تحریف معنوی ہے جس کی شاہد امام محمد باقرؑ کی وہ تحریر ہے جو آپ نے سعد خیر کو تحریر فرمای ہے اور جو کافی کی کتاب روضہ میں مذکور ہے اس میں لکھا ہے کہ اُن لوگوں کی طرف سے کتاب خدا کا پس پشت ڈال دینا یہ تھا کہ انھوں نے اس کے مکتوبی الفاظ کو تو قائم رکھا اور اُس کی جو مقررہ حدیں تھیں اُن میں تحریف یعنی تبدیلی کر دی۔ اسی طرح وہ روایات جن میں یہ ہے کہ مصحف جناب امیرؑ یا مصحف ابن مسعود میں اس طرح لکھا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ بطور تفسیر و تاویل تحریر تھا اس کی شہادت دینے کے لیے موجود ہے جناب امیرؑ کا قول جو آپ نے زندیق سے فرمایا ہے' میں اُن کے پاس لایا پوری کتاب جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھی "

اُن روایات میں سے جن کی نسبت ہم نے اشارۃً تحریر کیا یہ ہے کہ فاضل معاصر (محدث نوری) نے چار روایتیں درج کی ہیں۔ جن میں یہ ہے کہ " بولایۃ علی" کا فقرہ مصحف حضرت فاطمہؑ میں تحریر تھا کسی میں ہے کہ وہ مصحف فاطمہؑ میں یونہی تھا اور واضح ہونا چاہیے کہ جناب فاطمہؑ کا مصحف قرآن نہیں تھا بلکہ وہ ایک کتاب تھی جس میں علمی رموز و اسرار کا تذکرہ تھا' جیسا کہ اصول کافی کی متعدد روایتوں سے جو صحیفہ اور مصحف اور جامعہ کے باب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے انھی میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول ہے کہ اس میں تمھارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے، کہیں یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اس میں قرآن ہے جیساکہ صحیح و حسن حدیثوں

انما هو للمعنی ومنها کما رواه فی الکافی فی باب ان الائمة هم الهداة عن الفضیل سألت ابا عبد الله عن قول الله تعالٰے و لکل قوم هاد فقال کل امام هو هاد للقرن الذی هو فیهم و روایة برید عن ابی جعفر فی قوله تعالیٰ انما انت منذر و لکل قوم هاد فقال رسول الله المنذر و لکل زمان منا هاد یهدیهم الیٰ ما جاء به النبیؐ والهداة من بعده علیؑ ثم الاوصیاء واحدا بعد واحد و نحوها روایة ابی بصیر عن ابی عبد الله وروایة عبد الرحیم القصیر عن ابی جعفر علیه السلام ان رسول الله المنذر وعلیؑ الهادی وبمضمونها جاءت روایات الجمهور مسندة عن طریق ابی هریرة وابی برزة وابن عباس و طریق امیر المؤمنینؑ وصححه الحاکم فی مستدرکه - واذا احطت خبرا بهذا فهل یروق لك التجاء فصل الخطاب فی تلفیقه و تکثیره الی النقل عن بعض التفاسیر المتأخرة وعن الداماد فی حاشیة القبسات من قوله ان الاحادیث من طرقنا وطرقهم متظافرة بانه کان التنزیل انما انت منذر

میں وارد ہوا ہے اس کے علاوہ کافی میں اس باب میں کہ آئمہ معصومین لوگوں کے گواہ ہیں صحیح حدیث برید کی امام محمد باقرؑ سے اور دوسری روایت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں حضرات نے اس آیت کے بارے میں کہ جعلناکم امۃ وسطا فرمایا "امت وسطیٰ ہم ہیں" امیر المومنین سے اس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ "ہم نے تم کو امت وسطیٰ قرار دیا"۔ اب جو مرسل طور پر تفسیر نعمانی اور سعد میں وارد ہے کہ آیت میں ائمۃ وسطا ہے" اس کو تفسیر ہی پر محمول کرنا چاہیے اور یہ کہ معنی امۃ وسطاً کے ائمۃ وسطا تھے جس کو لوگوں نے بدل دیا۔ نیز کافی میں اس باب میں کہ آئمہ معصومین ہادی و راہنما ہیں۔ فضیل کی روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے کہ لکل قوم ھاد" ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے؟ حضرت نے فرمایا" ہر امام رہنما ہے اُس طبقہ کا جس میں وہ ہے" اور برید کی روایت ہے امام محمد باقرؑ سے اِسی آیت کی تفسیر میں کہ رسالتمآبؐ منذر (عذاب الٰہی سے خوف دلانے والے) ہیں اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک راہنما ہے جو رسالتمآبؐ کے احکام کی طرف ہدایت کرتا ہے اور وہ راہنما جو رسالتمآبؐ کے بعد ہوئے ہیں وُہ جناب امیرؑ ہیں اور اُن کے بعد کے اوصیاء یکے بعد دیگرے اور اسی کے مثل ہے روایت ابو بصیر کی امام جعفر صادق سے اور روایت عبد الرحیم قصیر کی امام محمد باقرؑ سے ان سب میں یہی ہے کہ

لعباد و علیؑ لکل قوم هاد انتهیٰ هٰذا الشعر الذی ینشده المداحون ولا یرضی العارف باللغة العربیة ان ینسب الیه نظمه ولا اظنك تجد من طرقنا وطرق اهل السنة غیر ما سمعته اوّلا وهو غیر ما نقله فاعتبرو منها روایة الکافی عن ابی حمزة عن ابی جعفر علیه السلام قال قوله عزّ وجل ربنا ما کنّا مشرکین یعنون بولایة علیؑ وهٰذا صریح فی کونه تفسیرا فهی حاکمة ببیانها علیٰ ضعیفتی ابی بصیر فی ظهورهما بان لفظ بولایة علیؑ محذوف من الآیة وتیسری البیان من روایة ابی حمزة الیٰ امثال ذلك ومنها روایة عمر بن حنظلة عن ابی عبد الله فی قوله تعالیٰ فی سورة البقرة متاعا الی الحول غیر اخراج مخرجات - ولا اظن الا انك تقول ان الحاق الامام لکلمة مخرجات انما هو تفسیر للمراد من کلمة اخراج لا بیان للنقیصة من القرآن الکریم ولکن فصل الخطاب اورده بعنوان البیان للنقیصه فاعتبرو منها صحیحة محمد بن مسلم عن ابی عبد اللهؑ کما فی الکافی فی اوّل باب منع الزکوٰة وفیها ثم قالؑ هو قول الله عزّ وجل سیطوّقون ما بخلوا به من

رسالتمآبؐ منذر ہیں اور علی بن ابیطالبؑ ہادی اور اس مضمون کی روایتیں اہل سنت کے یہاں بھی ہیں ابوہریرہ اور ابو برزہ اور ابن عباس اور نیز خود امیر المومنینؑ کے اسناد سے اور حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو صحیح السند قرار دیا ہے ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی شخص پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ فصل الخطاب کی اس کاوش کو جو انھوں نے بعض متاخرین کی تفسیروں سے اور میر باقر داماد کے حاشیہ قبسات سے، بعض روایتوں کے درج کرنے میں اختیار کی ہے اور لکھا ہے کہ روایات شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے کثرت کے ساتھ ہیں کہ اصل آیت یوں تھی کہ انما انت منذر لعباد و علی لکل قوم هاد" تم بس بندوں کے ڈرانے والے ہو اور علی ہر قوم کے لیے رہنما ہے" یہ شعر ہے کہ جس کو قصیدہ خوان پڑھا کرتے ہیں - اور کوئی شخص جو عربی زبان سے واقف ہو وہ اس کو گوارا نہ کرے گا کہ اس کی طرف اس شعر کے نظم کرنے کی نسبت دی جائے - اور طرق شیعہ و اہلسنت کا جو حوالہ دیا گیا تو بے شک و شبہ ان طرق میں سوائے اس کے جو ہم نے سابقاً درج کیا اور کچھ نہیں ہے اور وہ اس کے خلاف ہے جو محدث نوری نقل کر رہے ہیں - قیاس کن زگلستان من بہار مرا -

نیز کافی کی روایت ہے ابوحمزہ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ کفار کا قول ربنا ما کنا مشرکین اس سے مراد ولایت علی ابن ابی طالبؑ کا انکار تھا۔ یہ الفاظ صراحۃً بتلا رہے ہیں کہ یہ تفسیر کی

يوم القيامة يعنى ما بخلوا به من الزكوٰة فالرّواية كالصريحة بان لفظ من الزّكوٰة انّما هو تفسير من الامام لا من القراٰن فهى حاكمة ببيانها على مرسلة ابن ابى عمير عمّن ذكره عن ابى عبد اللهؑ فى قول الله عزّ وجل سيطوّقون ما بخلوا به من الزكوٰة يوم القيامة وصارفة لها عن كونها بيانا للنقيصة ومنها صحيحة ابى بصير عن ابى عبد اللهؑ كما فى الكافى فى باب نصّ الله ورسوله على الائمة واحدا بعد واحد وفيها فقلت له ان النّاس يقولون فما له لم يسمّ عليّا واهل بيته فى كتاب الله قال فقولوا لهم انّ رسول الله نزلت عليه الصلوٰة ولم يسم الله لهم ثلٰثا ولا اربعا حتى كان رسول اللهؐ هو الذى فسّر لهم ذلك وكذا قالؑ فى الزكوٰة والحج ومقتضى الرّواية تصديق الامامؑ لقول الناس انّ الله لم يسمّ عليّا فى القراٰن وان التسمية كانت من تفسير رسول الله فى حديث من كنت مولاه و حديث الثقلين ويشهد لذلك ما رواه فى الكافى ايضا فى هٰذا الباب بعد ذلك بيسير فى صحيحة

حیثیت سے ہے، اس صراحت کے سبب سے توضیح ہو جاے گی ابو بصیر کی اُن دونوں ضعیف روایتوں کی جن سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ بولایۃ علی کی لفظ قرآن میں داخل تھی اور وہ حذف کر دی گئی ہے۔ عمر بن حنظلہ کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے سورہ بقرہ کی اس آیت میں کہ متاعا الی الحول غیر اخراج آپ نے فرمایا مخرجات۔ عبارت کو دیکھتے ہوے شبہ بھی نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ یہ مخرجات کا فقرہ بطور تفسیر بیان ہوا ہے۔ یعنی اخراج کی لفظ سے مخرجات مراد ہے۔ نہ یہ کہ یہ لفظ یہاں پر تھی اور وہ قرآن مجید سے کم کر دی گئی ہے لیکن کتاب فصل الخطاب میں اس کو بطور بیان نقصان درج کیا ہے۔ نیز ان روایات میں سے محمد بن مسلم کی صحیح السند روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے جو کتاب کافی میں باب منع الزکوٰۃ کے شروع میں درج ہے اس میں ہے کہ حضرت نے فرمایا یہی مراد ہے اس ارشاد حضرت احدیت سے کہ ان لوگوں کو طوق پہنائے جائیں گے۔ اُس شے کے جس کے ساتھ اُنھوں نے بخل کیا ہے یعنی جو اُنھوں نے بخل کیا ہے مال زکوٰۃ میں سے، یہ روایت بالکل صراحت کے ساتھ اس امر کو بتلاتی ہے، کہ من الزکوٰہ کی لفظ بطور تفسیر ہے جو امام نے بیان فرمائی ہے نہ یہ کہ وہ جزو قرآن ہے۔ اس روایت کی یہ صراحت شرح قرار پاے گی ابن ابی عمیر والی مرسل روایت کی جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ قول باری تعالی ہے سیطوقون ما بخلوا به من الزکوٰۃ یوم القیامۃ اور اس روایت کے معنی

الفضلاء عن ابى جعفر عليه السّلام ورواية ابى الجارود عنه ايضا ورواية ابى الدّيلم عن ابى عبد اللهؑ انهما تلوا فى مقام الاحتجاج وعدم التقية قوله تعالىٰ يٰايّها الرّسول بلّغ ما انزل اليك من ربّك وان لم تفعل فما بلغت رسالته ولم يذكرا فى تلاوة الاٰية كلمة "فى علىؑ" وهٰذا يدل علىٰ ان ما روى فى ذكر اسم علىؑ فى هٰذا المقام بل وفى غيره انما هو تفسير وبيان للمراد فى وحى القراٰن بكون التفسير والبيان جاء به جبرائيل من عند الله بعنوان الوحى المطلق لا القراٰن وما ينطق عن الهوىٰ ان هو الّا وحى يوحىٰ ومنها رواية الفضيل عن ابى الحسن الماضىؑ فى باب النكت من التنزيل فى الولاية من الكافى قال قلت هٰذا الّذى كنتم به تكذبون قال يعنى امير المؤمنينؑ قلت تنزيل قالؑ نعم فانهؑ ذكر امير المؤمنينؑ بقوله يعنى بعنوان التفسير وبيان المراد والمشار اليه فى قوله تعالىٰ هٰذا فقوله فى الجواب نعم دليل علىٰ ان ما كان مرادا بعينه فى وحى القراٰن يسمونه عليهم السّلام تنزيلا فتكون هٰذه الرّواية وامثالها

بھی وہی ہوں گے کہ ما بخلوا بہ سے مراد من الزکوۃ ہے نہ یہ کہ وہ قرآن کا جزو ہے اور کم کر دیا گیا ہے نیز انہی روایات میں سے صحیحہ ابو بصیر ہے امام جعفر صادقؑ سے جیسا کہ کافی میں باب "نص علی الائمہؑ" میں مذکور ہے اُس روایت میں ہے کہ ابو بصیر نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا نام قرآن میں ذکر کیوں نہ کر دیا۔ حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو کہ رسالتمآبؐ پر قرآن میں یہ نازل ہوا کہ نماز واجب ہے لیکن خدا نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ مغرب کی تین رکعت ہے اور عشاء کی چار رکعت یہاں تک کہ رسالتمآب وہ تھے جنھوں نے لوگوں کے سامنے اس کی تفسیر کر کے بتلایا اور اسی طرح زکوٰۃ و حج کے بارے میں قرآن میں اجمال سے کام لیا اور رسولؐ نے تفصیل بتلائی اس روایت سے ظاہر ہے کہ امام نے لوگوں کے اس قول کو صحیح قرار دیا کہ قرآن مجید میں امیر المومنینؑ کا نام صراحتہً مذکور نہیں ہے۔ اور نام جو بتلایا گیا ہے وہ رسالتمآبؐ کی طرف سے بطور تفسیر حدیث من کنت مولاہ اور حدیث ثقلین وغیرہ میں ثابت ہوا ہے۔ اس کی گواہ وہ روایت بھی ہے جو کافی میں اس کے تھوڑی دور بعد صحیحۂ فضلا میں وارد ہے۔ امام محمد باقرؑ سے اور ابو الجارود کی روایت حضرت سے اور ابو الدیلم کی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے کہ ان دونوں بزرگوں نے مقام استدلال میں اپنے اصحاب کے سامنے جب کہ تقیہ کا موقع بھی نہ تھا یاایّھا الرّسول بلغ ما انزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته کی تلاوت فرمائی

قاطعة لتشبثات فصل الخطاب بما حشده من الروايات التی عرفت حالها اجمالا والی ما ذکرناه وغیره بیشیر ما نقلناه من کلمات العلماء الاعلام قدست اسرارهم فان قیل ان هٰذه الروایة ضعیفة وکذا جملة من الروایات المتقدمة قلنا ان جل ما حشده فصل الخطاب من الروایات هو مثل هٰذه الروایة واشد منها ضعفا کما اشرنا الیه فی وصف رواتها علی ان ما ذکرناه من الصحاح فیه کفایة لاولی الالباب۔

اور اس میں "فی علیؑ" کے فقرہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو اس مقام پر یا اور دُوسرے مقامات پر فی علی کے لفظ کا اضافہ ہے وہ بطور تفسیر و بیان ہے جسے جبرئیل بطور وحی خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ لیکن جزو قرآن نہیں ہے اور اس طرح کی وحی تو ہر کلام رسالتمآبؐ کے موافق تھی اس لیے کہ (قرآن میں موجود ہے) آپ اپنی خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے جو کچھ آپ کا کلام ہوتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے نیز ان روایات میں سے فضیل کی روایت ہے امام رضاؑ سے کافی کے باب النکت من التنزیل فی الولایة میں کہ راوی نے عرض کی یہ آیت ھٰذا الذی کنتم بہ تکذبون حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنینؑ راوی نے عرض کی یہ تنزیل ہے۔ فرمایا ہاں" اس روایت میں حضرت نے امیر المومنینؑ کا نام یعنی کی لفظ کے ساتھ ذکر کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جزو قرآن نہیں ہے بلکہ بیان مراد اور ہذا کی لفظ کے اصلی مشار الیہ کے طور پر ہے اب سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے؟ اور حضرت کا فرمانا کہ "ہاں" اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنزیل سے مراد جزو قرآن ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ جو چیز قرآن کی کسی آیت میں خصوصیت کے ساتھ مراد ہو اُس کو وہ حضرات تنزیل کی لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ یہ روایت اور اس کی ایسی دُوسری روایتیں تمام اُن دلائل کو ختم کر دیتی ہیں جن سے فصل الخطاب کے اوراق پُر کیے گئے ہیں اور ان روایات کی حقیقت بھی اس کے پہلے کھولی جا چکی ہے اور انہی مطالب کی طرف جو ہم نے بیان کیے علمائے اعلام کے کلمات میں جو ہم نے نقل کیے تھے اشارہ موجود ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ روایت ضعیف السند ہے اور اسی طرح بعض اس کے قبل کی روایات۔ تو ہم جواب میں کہیں گے کہ اکثر روایتیں جنھیں فصل الخطاب نے نقل کیا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے زیادہ ضعیف السند ہیں جیسا کہ اشارۃً ہم نے اُس کے روایات کے ضعف کا پتہ دیا۔ اس کے علاوہ ہم نے جو صحیح السند روایتیں پیش کی ہیں وہی کیا کم ہیں اور وہ اثبات مطلب کے لیے کافی ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحبان عقل و تمیز ہوں"۔

یہ گرانقدر عبارت باوجود طویل ہونے کے ہم نے تمام و کمال اس لیے نقل کر دی کہ اس میں علاوہ اُن مطالب کے جو ہم نے اپنے رسالہ میں لکھے تھے بہت سے ایسے معلومات موجود ہیں جن تک ہماری نظر اس رسالہ میں نہیں پہونچی تھی اور اس لیے اس کا پورا ہی نقل کرنا بحث کو پورے طور پر مکمل کرنے کے لیے انتہائی ضروری و لازم تھا۔

اب اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم بہت سے اُن پہلوؤں کے متعلق اپنا صحیح نقطۂ نظر پیش کر دینا چاہتے ہیں جن کا تعلق قرآن مجید کے متن الفاظ و کلمات کے ساتھ ہے اور جس کے صاف ہو جانے کی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بہت شدید ضرورت ہے اِس لیے کہ معانی و مطالب کے نکالنے میں اس سے زمین آسمان کا تفرقہ ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کے آیات، کلمات و الفاظ میں کمی و زیادتی کی بحث تو پورے طور سے واضح ہو چکی اور ہم نے صاف طور پر اظہار کر دیا کہ ہم اس قسم کی تحریف کے قائل نہیں ہیں۔ اِس لیے سلسلہ تفسیر میں جو کچھ بھی معانی و مطالب اخذ کیے جائیں گے وہ آیات کے انھی الفاظ سے کہ جو ما بین الدفتین موجود ہیں اور کسی ایسی روایت سے مدد نہ لی جائے گی جس میں کسی لفظ کا قرآن کے اندر موجودہ الفاظ کے علاوہ بطور اضافہ یا تبدیلی موجود ہونا مذکور ہو۔ بے شک وہ روایتیں اگر ایسی ہوں۔ کہ ان میں وہ الفاظ بطور تفسیر و تشریح مذکور ہوے ہیں جس کے نظائر سابقہ عبارت میں نذر ناظرین ہوے تو ایسے روایات کی طرف اُن کے اسناد کی جانچ کے ساتھ بطور تفسیر توجہ کی جا سکے گی۔

آیتوں کے الفاظ کی بجائے خود ترتیب یعنی تقدیم و تاخیر بھی یقیناً بجاے خود متواتر حیثیت رکھتی ہے اور اسی لیے ہر آیت مستقل طور سے حجت واجب العمل اور لازم الاتباع ہے۔ اگر کہیں ہر آیت کی لفظوں میں الٹ پھیر اور تقدیم و تاخیر ہو گئی ہوتی تو پھر تو پورا کلام مشکوک ہوتا اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا اس لیے کہ الفاظ کی ترتیب کے بدلنے سے زمین کا آسمان ہو جاتا اور معنی میں انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے تغیر و تبدل کا کسی صورت سے قرآن مجید کے آیات میں امکان نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات قرآن سے استدلال میں نظم الفاظ و ترتیب کلمات سے بھی نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں اور معانی کے اخذ میں الفاظ کی ترتیب کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے جو تفسیر قرآن میں ایک بہت اہم جُز کی حیثیت رکھتا ہے۔

بے شک یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر ہر آیت سے مراد وہ پورا سلسلۂ کلام نہیں ہے جس پر گول گول نشان آیتوں کے بنے ہوے ہیں کیونکہ یہ گول نشانات زمانۂ رسالتمآبؐ میں نہ تھے نہ زمانۂ خلفاے سابقین میں بلکہ یہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانہ میں دیے گئے ہیں جن کے قطعی و معتبر ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُن نشانوں کے درمیان ایسے متعدد اجزا ہوں جن میں سے ہر ایک مستقل آیت کی حیثیت رکھتا ہو لیکن نشان لگانے میں اُن سب کو دو نشانوں کے درمیان کر دیا گیا ہو جیسے آیت تطہیر متواتر احادیث اور روایات مفسرین و مورخین و محدثین کی بنا پر جن میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں مستقل آیت ہے اور خاص موقع پر نازل ہوی ہے لیکن موجودہ نظم قرآنی میں اُسے ایک اور بڑی آیت کا جز بنا دیا گیا ہے لہٰذا آیات کی تعیین میں سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

کہیں پر تو خود معانی قطعی صورت سے پتہ دیں گے کہ آیت پوری ہوی یا نہیں۔ کہیں پر متواتر روایات و اخبار سے معلوم ہوگا کہ اصل آیت کہاں سے کہاں تک ہے۔ لیکن اکثر قرآن مجید کے آیات ایسے ہی ہیں کہ ان کی صورت و شکل سے پتہ چل جاتا ہے کہ مستقل آیت کہاں سے کہاں تک ہے اس سلسلہ میں وہ علامات جو قاریوں کی طرف سے قرار

دیے گئے ہیں (ط۔ ج۔ م وغیرہ) یہ کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتے۔ نہ تفسیر و تشریح قرآن میں ان علامات سے کوئی استدلال کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے آیات یقیناً شان نزول کے مطابق مرتب نہیں ہوئے ہیں بلکہ اکثر سوروں میں کچھ آیات مکی اور کچھ مدنی۔ بعض مقام پر مدنی آیات مکی سے مقدم اور کہیں مخلوط ہو گئے ہیں اس لیے نظم آیات سے مستقل طور پر تفسیر قرآن اور معانی و مطالب کی تشریح میں کوئی مدد لینا صحیح نہ ہوگی۔

بے شک اگر کچھ آیات ایسے ہوں جن کے متعلق احادیث و روایات سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوا ہو کہ وہ بوقت واحد ایک ساتھ نازل ہوے ہیں اور ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہیں۔ جیسے اکثر چھوٹے سورے جو متعدد آیات پر مشتمل ہیں اور یکجا نازل ہوے ہیں تو یہ متعدد آیات حقیقۃً اس اعتبار سے ایک آیت کے حکم میں ہوں گے اور اُن کے نظم و ترتیب سے اگر کوئی نتیجہ نکلتا ہو تو وہ معتبر سمجھا جاے گا۔

سور قصار جو آخری پارہ میں مندرج ہیں وہ ایسے ہی ہیں کہ اُن کے اجزاء بالکل معینہ حیثیت رکھتے ہیں اور اُن میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اُن میں سے ہر ایک کی آیتیں اسی ایک سورہ سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ بعض سورے ایسے ہیں جن کی ساخت مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے سورہ کی آیتیں اُن میں مخلوط ہو گئی ہوں جیسے سورۂ رحمن۔ سورۂ مدثر وغیرہ لیکن ان کے علاوہ جو بڑے سورے ہیں اُن کے آیات کے متعلق بالکل قطعی حیثیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسی صورت سے نازل بھی ہوی تھیں جس طرح اب موجود ہیں اس لیے ان کی ترتیب سے کوئی تفسیری نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔

بے شک دوسرے احکام سوروں کے جیسے نماز میں ان کی تلاوت کرنا، ان کی تلاوت سے مخصوص ثواب کا قصد کرنا اجیر بننے یا نذر کرنے کی صورت میں کسی سورہ کا پڑھنا واجب ہونا یہ تمام امور وہ ہیں جو بوجہ امضائے ائمہ معصومین اسی نظم قرآنی پر جو ہمارے سامنے موجود ہے مرتب ہیں اور بحیثیت حکم شرعی اس میں کوئی خلل نہیں ہے۔

بے شک سوروں کی ترتیب اس کے توقیفی ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی بناء پر صحابہ کرام کے مصاحف ترتیب سور میں باہم انتہائی اختلاف رکھتے تھے لہٰذا قرآن مجید کی تلاوت میں یہ کسی طرح ضروری نہیں ہے کہ اسی ترتیب کے ساتھ سوروں کی تلاوت کی جاے جس طرح وہ قرآن مجید میں مندرج ہیں لہٰذا اگر کوئی شخص تلاوت قرآن کی نذر کرے یا باجرت تلاوت قرآن کرنے کا ذمہ دار ہو تو اس کو سوروں کے پڑھنے میں ترتیب کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر تمام سورے قرآن مجید کے پڑھ لے تو اُسے مجموع قرآن کی تلاوت کا ثواب حاصل ہو جاے گا۔ اور اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاے گا اگرچہ ترتیب ملحوظ نہ رکھی ہو۔

پاروں کی تقسیم تیس اجزا کی طرف، اس کی بھی کوئی اصلیت ہمارے خیال میں شرعی و مذہبی حیثیت سے نہیں ہے اور نہ اس پر کسی حکم شرعی کی بنیاد ہے۔

بے شک اگر اجیر ہو ایک پارہ کی تلاوت کا یا نذر کرے تو چونکہ الفاظ معنی متعارف پر محمول ہوتے ہیں اس صورت

اسی تقسیم کے لحاظ سے جو موجود ہے ایک پارہ پڑھنا ضروری ہوگا۔

یہی صورت رکوعات کی ہے کہ اصل شرع میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن بصورت اجرت یا نذر بے شک اس کا پابند ہونا لازمی ہے۔

جمع قرآن کے سلسلہ میں جہاں تک تاریخی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ علاوہ اس قرآن مجید کے جو امیر المومنینؑ نے جمع فرمایا تھا اور وہ آیات و سور دونوں کے لحاظ سے بالکل ترتیب نزول کے مطابق تھا موجودہ مصحف کی جمع آوری میں سب سے پہلی کوشش خلیفہ اول ابوبکر کی ہے جو آپ نے حضرت عمر کے مشورہ سے زید بن ثابت کے ذریعہ سے انجام دی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید کے آیات جداگانہ سوروں میں یکجا حیثیت سے مجتمع ہو جائیں لیکن ان سوروں میں کوئی خاص ترتیب جس سے وہ تمام ایک مرتب کتاب کی شکل میں مدوّن ہو جائیں نہیں تھی یہ کام حضرت عثمان نے انجام دیا ہے اور آپ نے علاوہ اس کے کہ دوبارہ زید بن ثابت کے ذریعہ سے آیات قرآن کو سوروں کے تحت میں جمع کرا کے اُس کا مقابلہ حضرت ابوبکر والے صحیفوں کے ساتھ کرایا پھر ان تمام سوروں کو ترتیب دے کر ایک مصحف کی شکل میں مدوّن کر دیا۔ اس لحاظ سے قرآن مجید کے بطور کتاب مصحف کی صورت میں بصورت حاضرہ مدوّن ہونے کا سہرا جو کچھ ہے وہ حضرت عثمان کے سر ہے۔ اسی لیے حضرت ابوبکر کے جمع کردہ مجموعہ پر مصحف کا اطلاق کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُس زمانہ میں "صحف" کی لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وحدانی شکل میں نہیں بلکہ متفرق صحیفوں کی صورت میں تھے۔ کچھ مصحف بے شک دوسرے صحابہ کے بھی موجود تھے جیسے حضرت ابی بن کعب کا مصحف۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا مصحف لیکن وہ سوروں کی ترتیب میں بالکل اس مصحف سے مختلف تھے۔ اسی طرح اکثر صحابہ کے پاس مختلف سورے اور آیتیں متفرق صحیفوں کی صورت میں بھی موجود تھیں۔ حضرت عثمان نے اپنے جمع کردہ مصحف کو عام طور سے شائع کرنے کے لیے شاہانہ سطوت و جبروت کو کام میں لے کر تمام وہ مصحف اور صحیفے جلوا دئے جو دوسرے صحابہ کے پاس موجود تھے۔

یہ ایک خاص بنائے مخاصمت تھی جو حضرت عثمان کے ساتھ دوسرے اکابر صحابہ کو پیدا ہوی اور جس کے نتیجے افسوس ناک صورتوں سے ظاہر ہوے۔

ہم اس بحث کا یہاں پر فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضرت عثمان کا یہ طرز عمل حق بجانب تھا یا نہیں؟ ہمیں تو صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن مجید کو جو بعض اکابر علماء "بیاض عثمانی" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد کس چیز پر ہے۔ یہ اسی ترتیب و تالیف کی بناء پر ہے جو قرآنی سوروں کے مدوّن کرنے کے سلسلہ میں عمل میں آئی ہے۔ یقیناً اس میں بہت کچھ نظر کی گنجائش ہے کہ آپ نے جس طرح قرآن کی ترتیب قرار دی ہے یہ کس حد تک صحیح ہے اور کتنے فوائد ہیں کہ جو اس سے نظر انداز ہو گئے ہیں لیکن اس کا اثر قرآن مجید کے آیات کے استناد و اعتبار پر کچھ نہیں پڑتا۔ کلام بہر حال کلام الٰہی ہے اور معجزۂ رسولؐ ہے اُس کا بصورت موجودہ جمع کرنے والا کوئی بھی ہو۔

اس لیے کہ دوسرے افراد نے جو حقیقۃً ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے اس مجموعہ کو تسلیم کر لیا اور اُس کو مستند و معتبر سمجھا۔ اس کے بعد اُس کے اعتبار و استناد میں کوئی شبہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

ساتواں تبصرہ

قرّاء سبعہ اور سبعۃ احرف

قرآن مجید جب سے یک جا ہو کر مکتوبی صورت سے عالم اسلامی میں منتشر ہوا اُس کے حروف و الفاظ خصوصیات لفظی اور رسم الخط کی انتہائی حفاظت کی گئی اور اس کے الفاظ کی صورت و ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہ سمجھی گئی جس کی بنا پر اُس کو وہ تواتر کا درجہ حاصل ہوا جو دنیا کی کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

اس پابندی و حفظ خصوصیات میں انتہائی اہتمام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض املا کی غلطیاں جو پہلے کاتب سے اتفاقاً ہو گئی تھیں جیسے لا اذبحنہ کا درمیانی الف اور اسی طرح لا اوضعوا میں وہ اب تک قائم رکھی گئیں اور کاتبان قرآن اس الف کو ترک نہیں کرتے۔

میں اتنی پابندی کو بلا ضرورت کہوں یا اس پر ہنسوں (جیسا کہ میں نے "تحریف قرآن کی حقیقت" میں اس سے کافی لطف لیا ہے) لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انضباط و اعتبار کی حیثیت کو اس طرز عمل سے کافی تقویت پہنچ گئی ہے۔

یورپ میں اس وقت ایسا کیا جاتا ہے کہ قلمی قدیم کتابوں کا بالکل فوٹو اتار کر شائع کر دیا جاتا ہے یا اگر اس کو نقل کراتے ہیں تو یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو لفظ جس طرح لکھی ہو اس کو اسی صورت سے نقل کیا جائے اس میں اگر کہیں کتابت اور املائی غلطی بھی ہوتی ہے تو اُس کو باقی رکھتے ہیں اور حاشیہ پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ بظاہر اس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے۔

اس طرح حفاظت اور اہتمام پر روشنی پڑتی ہے جس سے کتاب کے اعتبار کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ قرآن مجید جو دنیائے اسلام میں شائع و ذایع ہے یہ بالکل ہر حیثیت سے اُسی کے ساتھ متحد ہے جسے حضرت عثمان نے جمع کرا کے مختلف بلاد میں روانہ کیا تھا اور جب کہ ائمہ معصومین علیہم السّلام نے اُس قرآن کا امضا کیا یعنی اُس کو سند قرار دیا کہ جو حضرت عثمان نے منتشر کرایا تھا تو اُس سے موجود، قرآن مجید اپنے تمام خصوصیات لفظی کے ساتھ مستند اور معتبر قرار پایا جس پر عمل پیرا ہونے میں کوئی دغدغہ نہیں ہے۔

لیکن جس طرح موجودہ زمانہ میں قاری ہوتے ہیں کہ جو قرآن مجید کے پڑھنے میں صرف طریقۂ تلفظ اور ادائے حروف کے سلسلہ میں ایسی ایسی طبع آزمائیاں کرتے ہیں کہ لفظ کی آواز میں کچھ کا کچھ انقلاب ہو جاتا ہے اور سننے میں بہت بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح صدر اسلام میں بھی قاریان قرآن بہت سے تھے اور ہر ایک کا طریقۂ قرارت و ادائے حروف مختلف تھا مثلاً "ملک" کی لفظ کسی نے میم کو ذرا بڑھا کر کہدی "مالک" ہو گیا۔ کسی نے میم کو ذرا ملا کر کہا۔ لام کی حرکت پر کچھ بلندی کی طرف مائل کرتے ہوئے زور دے دیا "ملاک" ہو گیا۔ اس سے بہت سی قرائتیں پیدا ہو گئیں اور ہر ایک قاری کے جو شاگرد تھے وہ استاد کی پیروی میں اسی طریقۂ خاص کے پابند ہو گئے۔

ان قاریوں کی قراءتیں نہ رسول یا امام سے ماخوذ تھیں اور نہ انھیں مذہبی حیثیت سے کوئی سند حاصل تھی نہ ان کی تعداد کچھ محدود تھی۔ بلکہ یہ کثیر التعداد اشخاص تھے اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے تھے جو اپنے ذوق طبعی کی مناسبت سے ادائے الفاظ میں جدتیں کرتے تھے اور اُسے مستقل قرأت کا درجہ دے دیتے تھے لیکن بالکل اسی طرح جیسے مفتار کی کثیر التعداد جماعت میں سے جب بادشاہ کی نظر توجہ اور عام خلقت کے میلان طبع نے چار آدمیوں کو خاص طور سے پسند کر لیا تو وہ چاروں بزرگ ائمہ اربعہ بن کر اس طرح مستند قرار پا گئے کہ اُن کے سوا اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور انہی چاروں اماموں کے فتاوے عرش الٰہی سے نازل شدہ قرار پا گئے اسی طرح ان تمام قاریان قرآن میں سے توجہ خاص نے سات آدمیوں کو منتخب کر کے انھیں "قراو سبعہ" کے نام سے تمام امت کا مرجع و ملاذ قرار دیا کہ انہی سات آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی قرأت کے مطابق پڑھنا جائز اور ان کے علاوہ دوسری قرأتوں سے ناجائز ہے۔

ان ساتوں قراءتوں پر اتفاق حاصل ہو جانے کا نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے واسطے مذہبی حیثیت سے بھی سند تلاش کی جانے لگی اور "جوئیدہ یابندہ" سند ملی اور خوب ملی۔ رسالتمآبؐ کی ایک حدیث دستیاب ہوی کہ منزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف "قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے" سات حرف یعنی چہ؟ اسے مان لیا گیا کہ اس کے معنی ہیں سات قراءتیں" پھر سات قراءتیں کون سی ہو سکتی ہیں تو سمجھ لیا گیا کہ یہ وہی قرار سبعہ والی ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اول اور آخر تک میں تدریجی حیثیت سے پیدا ہوتی رہی ہیں اور اپنے ذاتی اجتہادوں سے اُنھوں نے اپنی قراءتیں مقرر کی ہیں اس سے نتیجہ یہ نکال لیا گیا کہ یہی وہ سات قراءتیں ہیں جن پر قرآن مجید نازل ہوا اور یہ کہ پھر ان سات قراءتوں کی پابندی لازم کس طرح نہ ہو گی جب کہ خدائے آسمانی نے انہی ساتوں کو اپنے کلام کے لیے مخصوص طور سے نازل فرمایا ہے اور اتارا ہے۔

اس کے علاوہ ان قراءتوں کے تواتر کا دعویٰ کیا گیا اور یہ کہ وہ قطعی حیثیت سے رسالتمآبؐ کی زبان سے صادر ہوی اور آپ سے سینہ بسینہ ان قرار سبعہ کے واسطہ سے ہم تک پہونچی ہیں۔

لیکن جس وقت ہم حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قراءتیں جناب رسالتمآبؐ سے متواتر حیثیت سے منقول ہونا تو درکنار خود ان قرار سبعہ سے بھی متواتر حیثیت پر نقل نہیں ہوی ہیں۔

تواتر کے معنی کیا ہیں؟ ہر طبقہ میں اتنے راویوں کی زبانی نقل ہونا جن کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط بیانی کا شبہ باقی نہ رہے مگر یہاں جیساکہ علامۂ بلاغی طاب ثراہ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی ہے یہ حالت ہے کہ قراء سبعہ میں ایک شخص عاصم کے دو شاگرد ہیں حفص اور شعبہ انہی کے ذریعہ سے عاصم کی قرارت کا دنیا کو علم حاصل ہوا ہے اور خود ان دونوں میں عاصم کی قرارت کے متعلق کبھی اختلاف بھی ہوتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔

اسی طرح نافع کے دو شاگرد قالون اور ورش۔ ابن کثیر[۳] سے روایت کے سلسلہ میں قنبل اور بزی ابوعمرو بن العلاء[۴] کے شاگرد صرف ایک یزیدی اور اُن کے دو شاگرد ابوعمرو اور ابوشعیب۔

ابن عامر سے سلسلۂ روایت میں ذکوان اور ہشام۔ حمزہ کے ایک شاگرد سلیم اور اُن کے دو راوی خلف اور خلاد۔ کسائی کے بھی دو راوی ابوعمر اور ابوالحارث۔

پھر یہ سلسلہ جب قراء سبعہ تک منتہی ہوا تو قراء سبعہ میں سے ہر شخص تو ایک ہی ہے پھر تواتر کہاں باقی رہا۔

اس کے آگے جاکر قراء سبعہ کے اساتذہ بھی ہم کو معلوم ہوے ہیں وہ بھی گنتی ہی کے اشخاص ہیں جن سے تواتر کا وجود نہیں ہوسکتا۔

ان قراء سبعہ میں اکثر کا سلسلۂ روایت کسی ایک نقطہ پر متحد بھی ہوتا ہے مثلاً امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام تک ان میں سے اکثر کا طریق روایت منتہی ہے لیکن ایک طرف ان کے باہمی اختلافات دُوسری طرف یہ کہ ان کے مقابلہ میں اکثر قرارت اہلبیت کا تذکرہ علیحدہ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کچھ خاص باتیں ہوں گی جو ان لوگوں کو مشترک طریقہ سے امیرالمومنینؑ سے پہونچی ہوں گی لیکن ان باتوں کے علاوہ ان لوگوں نے خود بھی اپنی طبع آزمائی یا دوسرے استادوں کی تعلیم سے کچھ طریقے ایجاد کیے جن کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض مثلاً حمزہ کے متعلق یہ جو کتابوں میں لکھا ہے کہ انھوں کے امام جعفر صادقؑ سے قرارت کا فن حاصل کیا تھا اس کی بھی نوعیت یہی ہوگی۔ یعنی کچھ امام جعفر صادقؑ سے استفادہ کیا ہوگا لیکن ان کی پوری قرارت حضرت کی طرف نسبت رکھتی ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

پھر ہمارے نقطۂ نظر کے لحاظ سے تو ان قراء[۱] شعبہ میں سے اکثر کی عدالت، وثاقت یا شیعیت بھی ثابت نہیں ہے اور وہ خود نیز اُن سے اخذ قرائت کرنے والے اُن کے شاگرد بالکل مجہول الحال اشخاص ہیں جن کے اقوال و روایات پر اعتماد ممکن نہیں ہے۔

ایسی صورت میں ہمارے علماء میں سے بھی بعض حضرات نے جو قراء سبعہ کے مسئلہ کو اہمیت دی ہے اور قرارت سبعہ کو متواتر و لازم العمل قرار دیا ہے وہ حقیقت حال سے ناواقفیت اور نظر کی چوک کے سوا کچھ نہیں ہے۔

نزل القرآن علی سبعۃ احرف کی حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ مبہم مضطرب اور تاریک ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اس کے معانی درج کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ اختلف فی معنی سبعۃ احرف علی اربعین قولاً" ان سات حرفوں کے معنی سمجھنے میں چالیس قول ہوے ہیں" ان میں سے

پینتیس[۳۵] قول ابن حبان کی کتاب سے درج بھی کیے ہیں آخر میں خود حافظ سیوطی نے لکھا ہے۔

وقد ظن کثیر من العوام ان المراد بھا القراءات السبعۃ وھو جھل قبیح "بہت سے عوام (جہال) نے یہ گمان کیا ہے کہ اس سے مراد ساتوں قراتیں ہیں لیکن یہ بہت شرمناک جاہلانہ بات ہے"۔

دوسرے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان سات حرفوں سے مراد سات باب ہیں کہ جن کے متعلق قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو مستدرک حاکم کی روایت ابن مسعود سے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا نزل القرآن من سبعۃ ابواب علی سبعۃ احرف زاجراً و آمراً و حلالاً و حراماً و محکماً و متشابھاً و امثالاً۔

"قرآن مجید سات بابوں میں سے سات قسموں پر نازل ہوا ہے۔ منع۔ حکم۔ حلال۔ حرام۔ محکم۔ متشابہ۔ امثال۔

اور ابن جریر کی روایت میں ابوقلابہ کی زبانی جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے۔ انزل القرآن علی سبعۃ احرف آمر و زاجر و ترغیب و ترھیب و جدل و قصص و مثل۔

"قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ امر۔ نہی۔ ترغیب۔ تہدید۔ مجادلہ۔ قصص و امثال"۔

یہ روایتیں سبعہ احرف کی تفسیر میں ایسی ہیں جن کا مضمون بالکل اصول مسلمہ مذہب اور عقل سلیم کے مطابق ہے اس کے مقابل والی روایتوں میں سبعہ احرف کے ایسے معنی ذکر کیے گئے ہیں جو کسی طرح قرآن مجید کی شان و عظمت کے موافق نہیں ہیں۔

ملاحظہ ہو امام احمد بن حنبل کی روایت جس میں یہ ہے کہ حضرت رسولؐ نے تقاضا کر کے جبرئیل سے قرآن مجید کے الفاظ میں رد و بدل کی اجازت حاصل کی یہاں تک کہ وہ سات حرفوں تک پہونچے جبرئیل نے کہا کلھا شاف کاف مالم تختم آیۃ عذاب برحمۃ وآیۃ رحمۃ بعذاب۔

"یہ جتنے طریقے ہیں سب ہی کافی اور شافی ہیں جب تک اتنا تغیر نہ کر دیا جائے کہ آیت عذاب آیت رحمت اور آیت رحمت آیت عذاب سے تبدیل ہو جائے"۔

دوسری حدیث میں اُن جائز تغیرات کی مثال بھی دی گئی کہ جیسے تعال کی جگہ۔ اقبل۔ ھلم۔ اذھب۔ اسرع۔ اعجل وغیرہ۔

ابوداؤد کی حدیث میں ہے لیس منھا الا شاف کاف ان قلت سمیعا علیما عزیزاً حکیما مالم تختم آیۃ عذاب برحمۃ او آیۃ رحمۃ بعذاب۔

"یہ سب طریقے کافی اور شافی ہیں مثلاً سمیعاً علیما کی جگہ عزیزاً حکیما کہہ یا تو کوئی مضائقہ نہیں جب تک آیت عذاب کی رحمت سے اور آیت رحمت کی عذاب سے بدل نہ جائے"۔

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ان ھذا القرآن نزل علی سبعۃ احرف فاقرأوا ولا حرج ولکن لا تجمعوا ذکر رحمۃ بعذاب ولا ذکر عذاب بمغفرۃ۔

"یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہٰذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بے شک رحمت اور عذاب کی آیتوں میں ادل بدل نہ کرو۔

امام احمد کی ایک روایت حضرت عمر سے ہے القرآن کله صواب مالم تجعل مغفرة عذابا اوعذابا مغفرة۔

قرآن ہر طرح ٹھیک ہی ہے جب تک کہ مغفرت کو عذاب اور عذاب کو مغفرت نہ بنا دو"۔

ان روایات کے لحاظ سے قرآن کی شان اعجاز تو بالکل رخصت ہو جاتی ہے اور نہ اس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی خیال مدنظر رہ جاتا ہے۔ بس صرف معانی کی اتنی تبدیلی نہ ہو کہ بالکل کچھ کا کچھ ہو جائے اور چاہے جتنے الٹے پلٹے ہوں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ روایتیں بالکل اصول مذہب کے خلاف ہیں اور قابل توجہ نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو اسلام کے حقیقی محافظ تھے انہوں نے اس غلطی کے پردہ کو چاک کر دیا ہے اور صاف فرما دیا کہ ان القرآن واحد نزل من عند واحد" قرآن بس ایک ہے اور ایک ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے"۔ (حدیث امام محمد باقرؑ بروایت کافی کلینیؒ)

دوسری روایت صحیح میں فضیل بن یسار کی زبانی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے جب فضیل نے عرض کیا ان الناس یقولون ان القرآن نزل علی سبعه احرف" لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔

حضرت نے فرمایا کذبوا ولکنه نزل علیٰ حرف واحد من عند الواحد" یہ لوگ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ ایک حرف پر نازل ہوا ہے ایک ذات (خداوند عالم) کے پاس سے"۔

ان احادیث سے سبعۃ احرف والی روایت کی حقیقت بالکل کھل گئی اور بہر صورت قراء سبعہ کی قراءتوں سے تو اس روایت کو کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ان قراءتوں پر اعتماد و اعتبار کی کوئی صورت نہیں ہے۔

قرآن کی موجودہ مکتوبی صورت جو مسلمانوں کے درمیان شائع و ذائع ہے تواتر کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے اس کا امضا ہوا ہے لہٰذا یہی مستند ہے۔ نماز اور دوسرے موقعوں پر اس کی تلاوت صحیح ہے اور اس کے علاوہ دوسرے قاریوں کی قرأت کے ساتھ نہ تو اس کا تلاوت کرنا صحیح ہے اور نہ اس پر عمل کرنا اور نہ اس سے استدلال کرنا اور کسی موقع پر سند میں پیش کرنا درست ہے۔

بے شک ائمہ معصومین علیہم السلام سے باسناد صحیحہ کسی خاص آیت کے موقع پر اگر کسی خاص قرارت کا ثبوت ہو جائے تو اس کا اتباع لازم ہوگا کیونکہ پتہ چلے گا کہ اس آیت میں قرارت متداولہ کا امضا نہیں ہوا ہے اور یہ ہمارے گذشتہ بیانات سے ظاہر ہو چکا ہے۔ کہ قرآن مجید کی موجودہ متداول صورت کتنی ہی تواتر کی حد پر پہونچی ہو لیکن اُس کا استناد اور قطعی اعتبار امضائے معصومین کی بنا پر ہے اور بغیر اُس کے نہیں۔ لہٰذا اگر کسی خاص آیت میں خود ان حضرات سے قرارت اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو وہ معتبر ہوگا۔ اور قابل عمل جیسے آیۂ وضو میں وامسحوا برؤسکم و ارجلکم الی الکعبین۔ قرارت متداولہ میں ارجلکم لام کے فتحہ کے ساتھ ہے لیکن قرارت معتبر اس میں

ارجلکم کسرِ لام کے ساتھ ہے جو سیاق قرآن کے ساتھ بھی بالکل متحد ہے اس میں تلاوت کے موقع پر ارجلکم بکسر لام کہنا درست ہوگا اور حکم شرعی کے استفادہ میں بھی اس سے استناد درست ہوگا۔

اسی طرح سورۂ صافات میں سلام علی الیاسین لفظ و معنی کسی اعتبار سے مطابق ذوق نہیں ہے قرأت اہلبیت پر سلام علیٰ آل یٰسین درست ہے، اور اکثر علمائے اہلسنت نے اس کے مطابق روایات درج کی ہیں

آٹھواں تبصرہ

تمسک بالقرآن کی اہمیت

اور

اُس کے قیود و شرائط

قرآن مجید یقیناً خلق خدا کے لیے ہدایت بن کر آیا تھا اور دنیا کو صحیح راستہ دکھلانے کا ذریعہ جس کا پہلے ہی پارہ میں اعلان موجود ہے کہ الم ذلك الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین" یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہہ نہیں۔ یہ رہنما ہے پرہیزگاروں کے لیے" دوسرے مقامات پر کہیں اس کو "ضیا" (روشنی) کہیں "ذکر" یاد آوری کا ذریعہ) کہیں "تبصرہ" (آنکھیں کھولنے والا)۔ "شفاء لما فی الصدور" (سینوں کے باطنی امراض شک و شبہہ کفر و نفاق وغیرہ کا علاج) کہیں "فرقان" (حق و باطل میں جدائی ڈالنے والا) کہیں "بیان" (حقیقتوں کا واضح کرنے والا) وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے جس سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً وہ عام خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کے لیے اتارا گیا ہے اور دنیا کو اس کے مندرجہ مضامین پر غور کرنے، اس سے نتیجہ نکالنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے۔ وہ صرف بطور اوراد و ادعیہ کے زبانوں سے تلاوت کر لینے اور بطور تعویذ و نقش کے گلے میں ڈال لینے اور بطور ایک محترم و مقدس چیز کے سر آنکھوں پر رکھ لینے بوسہ دے لینے کے لیے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس کے مطالب و حقائق کا درس لیا جائے اور اُس میں غور و خوض کیا جائے نیز اس سے اپنی عملی زندگی کے لیے سبق حاصل کیے جائیں۔

یہی چیز وہ ہے جس کے معنی "تمسک بالقرآن" کے ہیں لوگوں نے تمسک بالقرآن کے معنی نہ معلوم کیا سمجھ لیے لیکن تمسک کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ اپنی عملی زندگی میں اُس کے ہدایات کی پابندی کی جائے اور کوئی قول و

عمل اس کے خلاف اختیار نہ کیا جائے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید ایک خاموش رہنما ہے نیز اس میں اکثر مضامین بطور اجمال و اختصار بیان ہوئے ہیں۔

لہٰذا اس کے ساتھ تمسک کے لیے ناطق بات کرنے والے معلم اور ہادی کی ضرورت ہے، جو اس کے تعلیمات کو اپنے قول و عمل سے دنیا کے ذہن نشین کرے اُس کے مجملات کو بیان کرے اور اس کے مبہمات کی توضیح و تفصیل کرے۔

یہ معلم و ہادی اپنے زمانہ میں رسول عربی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اسی بنا پر خود قرآن مجید میں حضرت کے اقوال و افعال پر مہر تصدیق ثبت کی و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ان کے اقوال کے مطابق منشائے الٰہی ہونے کی سند اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ نیز قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اُن کے افعال کے قابل اتباع ہونے کی دستاویز ہیں۔ یہ دو چیزیں قول و عمل وہ ہیں جنھیں سنت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے کتاب کے ساتھ سنت کے واجب العمل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

بہت لوگ جنھوں نے تعلیمات اسلامی کو حقیقت کی روشنی میں نہیں دیکھا اُنھوں نے قرآن مجید کے ہدایات کو اپنے لیے کافی قرار دے کر "سنت" کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

یہ فرقہ آج کل "اہل قرآن" کے نام سے موجود ہے وہ اپنے تمام افعال، عبادات اور احکام شرعیہ کی بنیاد قرآن مجید پر رکھنے کے مدعی ہیں اور اس طرح وہ عجیب و غریب شریعت تیار ہوئی ہے جس کو اصلی شریعت اسلام سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔

یہ خیال کہ قرآن مجید کافی ہے اور اس کے ساتھ رسولؐ کی ہدایت کی ضرورت نہیں اس فقرہ سے کہ "حسبنا کتاب اللہ" اُس موقع پر ہے کہ جب رسولؐ کا وقت آخر تھا اور عالم احتضار تھا بعض صحابہ کی زبان سے مبہم اور مختصر طور پر ظاہر ہو گیا تھا اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اس عقیدہ کی داغ بیل اُس وقت پڑی تھی یا بیج اس کا اُس وقت ڈالا گیا تھا لیکن اس وقت یہ بالکل ہنگامی و وقتی تھا اور اُس میں شاخ و برگ پیدا نہ ہوئے تھے نہ عملی طور سے اُس کی پابندی کی جا سکی ورنہ رسولؐ کی بیٹی کو میراث سے محروم کرنے میں قرآن مجید کے بالکل برخلاف اپنی مردیہ حدیث کی مدد لینا نہ پڑتی۔

بہر حال حق شخصیتوں اور اُن کے اقوال کا پابند تو ہو نہیں سکتا۔ ہم کو خود قرآن کی ہدایات کے دیکھنے کی ضرورت ہے، اور قرآن نے صاف طور سے قول و عمل رسولؐ کو مستند اور قابل عمل بتلایا ہے لہٰذا اگر معتبر و مستند قابل وثوق ذریعہ سے ہم کو قول و عمل رسولؐ کا پتہ چلے تو اس پر عمل نہ کرنے کے کیا معنی؟ یہ تو خود قرآن سے بغاوت ہو گی جس کے بعد خود قرآن کنارہ کشی کرے گا اور "اہل قرآن" ہونے کا دعوٰی باطل ہو جائے گا اور قول رسولؐ کی بنا پر رسولؐ کے بعد قرآن اور عترت

کا ساتھ ہے۔ حضرت کی مستند معتبر بلکہ متواتر حدیث ہے۔ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی وانھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض یوم القیامۃ۔

"میں تم میں (اے مسلمانو) دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک خدا کی کتاب اور ایک میری عترت میرے خاص اہلبیت۔ اگر تم ان دونوں کے ساتھ تمسک کرو تو میرے بعد ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ دنیا کا دور آخر نہ ہو اور حوض کوثر پر میرا سامنا ہو۔"

یہ حدیث کوئی قابل بحث۔ محتاج تحقیق۔ مشکوک و مشتبہ غیر معلوم حدیث نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کی متفق علیہ متواتر اور قطعی حدیث ہے جسے صحابۂ کرام کی جماعت میں تیس[30] بزرگوں سے زیادہ نے روایت کیا ہے اور جسے تمام حفاظ حدیث اور اصحاب جوامع و مسانید نے ہر دور و زمانہ میں اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ تمسک بالعترۃ کا حکم ہے اور تمسک کے معنی سوائے اقوال و افعال پر عمل پیرا ہونے کے اور کچھ نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رسالتمآب کے زمانہ میں قرآن مجید کے ساتھ ذات رسولؐ کو بطور تفسیر و توضیح و تفصیل پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور بغیر اُس کے تمسک بالقرآن صحیح طریقہ سے نہیں ہو سکتا تھا اسی طرح بعد رسولؐ عترت رسولؐ اور اہلبیت طاہرین کے اقوال کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور بغیر اس کے کبھی تمسک بالقرآن پورے طور سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

نواں تبصرہ

تفسیر و اصول تفسیر

تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل و تاویل میں فرق محکم و متشابہ میں امتیاز۔ تفسیر قرآن کے شرائط

قرآن فہمی اور تفسیر کلام پاک کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا تفرقہ ہے ایک جماعت قرآن مجید کے بارے میں اتنی مرعوب ہوئی ہے کہ وہ عقل انسانی کو اس کے معانی کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہی سمجھتی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے والے خاص اشخاص تھے جو اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ ہم صرف اُن حضرات

کے اقوال وارشادات پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ قرآن سے براہ راست ہم کسی حکم شرعی یا اعتقادی مسئلہ کا نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ اخباری جماعت ہے جس نے ادلۂ احکام سے کتاب الٰہی کو بالکل خارج ہی کر دیا ہے اور اپنے عمل کا دارومدار صرف اخبار و احادیث پر رکھا ہے۔

دوسری جماعت وہ ہے جس کا ابھی گذشتہ تبصرہ میں تذکرہ ہوا ہے کہ اس نے قرآن کو اپنے ہر درد کا مداوا قرار دے کر احادیث و اخبار سے بالکل کنارہ کشی ہی کر لی ہے اور اس لیے اپنا نام "اہل قرآن" رکھا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک (بخیال خود) "روشن خیال" گروہ وہ ہے جو ہر بات کا ثبوت قرآن مجید سے مانگتا ہے اور جو کچھ قرآن مجید سے سمجھ میں نہ آئے اس کے ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔

بعض واعظین ایسے ہیں جو منبروں پر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ ہم ہر مسئلہ کو قرآن مجید سے ثابت کریں گے اور اس سلسلہ میں آیات قرآن کی توجیہ و تفسیر میں ایسے طبعزاد معانی کا اختراع کرتے ہیں جو آیات قرآن سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔

مذکورۂ بالا خیالات کو دیکھنے کے بعد جب ہم ہادیان دین کے ارشادات پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کی نوعیت بظاہر مختلف نظر آتی ہے۔

ایک طرف تو اکثر مقامات پر قرآن مجید سے استفادۂ احکام کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اکثر احکام شرعیہ میں بطور استدلال آیات قرآن کو اس پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے کہ خود وہ آیت اس حکم کے بتانے کے واسطے کافی تھی اور راویوں کو خود اسی آیت سے حکم شرعی سمجھ لینا چاہیے تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا عام اہل علم و فضل کے لیے ناممکن نہیں ہے۔

دُوسری طرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ انما یعرف القرآن من خوطب بہ "قرآن کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کے حقیقی مخاطب ہیں"۔ اس کے ساتھ تفسیر بالرّائے کو عظیم گناہ بتلاتے ہوئے ارشاد کیا من فسّر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النّار جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا آتش جہنم میں بنا لے" یہ بھی ارشاد کیا کہ من فسّر القرآن برأیہ فان اصاب فقد اخطاء "جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس نے اگر ٹھیک بھی کہا ہو تب بھی غلطی کی"۔ اس طرح قرآن مجید میں عقل آرائیوں کا سدباب کر دیا۔

ضرورت ہے کہ ایک طرف مذکورۂ سابق حد افراط یا تفریط تک نکل جانے والے خیالات کی تعدیل کی جائے یعنی اُس نقطۂ اعتدال کا پتہ لگایا جائے جہاں تک تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جانے کا حق ہے اور اُس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور دوسری طرف ان احادیث و اخبار میں مطابقت پیدا کر کے اُن کو ایک نقطہ پر جمع کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اُن کا اجتماعی مفاد کیا ہے۔

اِس کے لیے حسب ذیل تمہید پر غور سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

الفاظ سے استفادۂ معانی جو الفاظ و معانی کے مخصوص ارتباط کا نتیجہ ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعدد مرتبے اور مختلف درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ لفظ جو کسی معنی کے لیے وضع ہوی ہے جب گوش گذار ہو تو فوراً ذہن اُس معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ معنی دماغ میں گردش کرنے لگیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ متکلم نے وہی معنی مراد بھی لیے ہوں بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس لفظ کا ظاہر کرنے والا کوئی بافہم و شعور متکلم ہو بلکہ دروازہ کے کھولنے بند کرنے میں اُس کے چوکھٹ بازو اور چولوں سے اگر آواز نکلتی ہو اور کسی خاص لفظ کی تشکیل کر رہی ہو جو کسی معنی کی حامل ہے تو ذہن میں وہ معنی آئیں گے ضرور حالانکہ معلوم ہے کہ وہ کسی متکلم کے زبان و دہن کی لفظ نہیں کہ اُس سے یہ معنی مراد بھی ہوں۔

یہ دلالت دلالت تصوریہ ہے اس لیے کہ لفظ کے سننے کے بعد صرف معنی کا خطور ذہن میں ہوتا ہے اُس پر کوئی حکم ایجابی یا سلبی نہیں لگایا جاتا ہے لہٰذا تصور ہی تصور ہے۔ تصدیق کا پتہ نہیں ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کے ساتھ معنی ذہن میں آئیں اور اس طرح کہ متکلم نے یہی معنی مراد بھی لیے ہیں اور استعمال لفظ کا اسی معنی میں کیا ہے۔ اس کو کہا جائے گا دلالت تصدیقیہ اس لیے کہ یہاں تصور ہی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ متکلم نے یہی معنی مراد لیے ہیں۔

یہ دلالت اُسی وقت پیدا ہو گی جب متکلم فہم و شعور رکھتا ہو اور ارادہ کے ساتھ کلام کیا ہو دروازہ سے سنائی دینے والی آواز میں یہ دلالت پائی نہیں جا سکتی کیونکہ اس دلالت کی بنیاد قصد متکلم پر ہے۔ اسی طرح اگر متکلم باشعور ہستی یعنی انسان ہو مگر بوقت تکلم معلوم ہے کہ قصد و ارادہ موجود نہیں ہے جیسے سرسامی کا ہذیان اور مست بے ہوش کی بکواس۔ اِس صورت میں بھی دلالت تصدیقیہ کا وجود نہ ہو گا کیونکہ متکلم میں قصد و ارادہ کا وجود نہیں ہے۔

دلالت تصوریہ تو لفظ کے گوش زد ہوتے ہی فوراً پیدا ہوتی ہے اور بدلتی نہیں ہے لیکن دلالت تصدیقیہ معتبر صورت سے اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کلام ختم ہو جائے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ آئے اس لیے کہ اکثر خاتمہ کلام کے موقع تک ایسے قرائن آ جاتے ہیں جو لفظ کو پہلے معنی سے ہٹا کر کسی دُوسرے معنی کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ مثلاً متکلم کی زبان سے نکلا رأیت اسداً مخاطب کے کان میں اسد کی دال پہونچتے ہی "شیر" کے معنی ضرور آ جائیں گے۔ یہ دلالت تصوریہ ہے لیکن یہ فیصلہ کہ اسد سے مراد بھی یہی ہے اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب اس کے بعد "یرمی" کی لفظ آ نہ جائے ورنہ دلالت تصدیقیہ منقلب ہو جائے گی۔ فوراً یہ رائے قائم کرنا پڑے گی کہ "اسد" سے مراد مجازی معنی یعنی "رجل شجاع" ہے۔

ان دونوں دلالتوں کے پورے ہونے کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ کلام کے مقصود اصلی کا پتہ چلایا جائے اس لیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کے لفظی معنی کچھ ہیں اور وہ بحیثیت استعمال الفاظ مراد بھی ہیں لیکن اصلی مقصود وہ نہیں

ہیں بلکہ ذہن کا منتقل کرنا منظور ہے اس معنی سے کسی اور چیز کی طرف جو درحقیقت بتلانا منظور ہے۔

جیسے کنایہ کی صورت میں کہنے والا کہتا ہے "میں اب تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا"۔ یہ جملہ حسب ذیل الفاظ پر مشتمل ہے۔ میں۔ تمھارے۔ گھر۔ قدم۔ نہ رکھوں گا۔ ان میں سے ہر لفظ کے ایک معنی ہیں اور جب متکلم ان الفاظ کو ادا کرتا ہے تو وہ اُن معانی کا قصد بھی رکھتا ہے۔ یعنی میں سے مراد ذات متکلم ہے۔ اور اس کے بعد ہر لفظ جو ہے اُس سے وہی معنی مراد ہیں جو اُس لفظ سے باعتبار وضع لغوی ہونا چاہیے ہیں۔

کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دُوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہے لیکن پھر بھی اصلی مقصود اس جملہ کے کہنے سے یہ نہیں ہوتا کہ "میں قدم نہ رکھوں گا" بلکہ یہ کہ "میں آؤں گا نہیں" اس بنا پر اگر وہ خود اپنے پیروں پر اُس کے گھر میں نہ جائے بلکہ کسی سواری پر داخل ہو تب بھی اُس کا دعویٰ غلط سمجھا جائے گا حالانکہ اس صورت میں وہ خود قدم نہیں رکھتا بلکہ اس کے مرکب کے قدم پڑتے ہیں۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ لفظ، معنی اور مقصود کلام اس سب کے تمام ہونے کے بعد یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کلام سے اشارہ کس امر کی طرف ہے شلاً اتفاق سے مخاطب نے کبھی اس متکلم کو کہا تھا "کہ میں تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا"۔

آج یہ اسی طرح کہہ رہا ہے کہ "میں تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا"۔ اور اس کہنے سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ یہ بدلا ہے تمھاری اُس دن کی بات کا جو تم نے کہی تھی۔

یہ قسم پہلے تینوں درجوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ درجے حقیقۃً لفظ اور اس کے معنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لفظ کے اصلی معنی اور وہ کہ جو مراد ہیں اور اُس معنی کے ادا کرنے سے جس بات کا کہنا منظور ہے یہ سب لفظ ہی تک منتہی ہوتے ہیں لیکن یہ چیز جسے ہم نے چوتھے درجہ پر قرار دیا ہے لفظ اور اُس کے معنی سے بالکل خارج ہے۔

اسی بنا پر کسی شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں نقل بالمعنی کی صورت میں یہ حق حاصل ہے کہ انسان ان الفاظ کے تحت اللفظی معنی کو الفاظ کی الٹ پلٹ کے ساتھ یا مرادفات کی تبدیلی کے ساتھ بیان کر دے مثلاً کسی نے کہا تھا لا اضع قدمی فی دار فلان اس بات کو انسان یوں کہے کہ فلاں شخص نے کہا "میں اپنا پاؤں اس کے گھر میں نہ رکھوں گا اور یوں بھی کہ اب میں قدم اس کے گھر میں نہیں رکھوں گا"۔

حالانکہ یہ الفاظ اُس کے دہن سے نہیں نکلے تھے۔ لیکن چونکہ ان الفاظ سے معنی وہی پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان الفاظ کا منسوب کرنا اس کی طرف صحیح ہے۔

اسی طرح یہ بھی حق حاصل ہے کہ نقل کرنے والا اُن الفاظ کے مقصود اصلی کو اُس متکلم کی طرف منسوب کرے۔ مثلاً "تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا" اس قول کو اس طرح نقل کرے کہ فلاں شخص نے کہا۔ میں تمھارے یہاں اب کبھی آؤں گا نہیں"۔

یہ اگرچہ اُنھی الفاظ کا ترجمہ اور تحت اللفظی مضمون نہیں ہے لیکن پھر بھی چونکہ ان الفاظ کے ذریعہ سے

اصل میں یہی کہنا مقصود ہے اس لیے یہ بھی ان الفاظ کے ذریعہ سے مقولۂ قائل قرار پا سکتا ہے اور اُس کی طرف منسوب کرنا درست ہے۔

مگر وہ خارجی چیز جو چوتھی قسم میں ذکر کی گئی ہے، جو کلام سے بطور اشارہ نکالی جاتی ہے وہ ہرگز ہرگز مقولۂ متکلم قرار نہیں پا سکتی اور نہ نقل قول کے موقع پر اس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔

شلاً مثال مذکورۂ بالا میں یہ کہنا کہ اس نے کہا "یہ تمھاری بات کا جواب ہے، اُس دن کی" بالکل غلط ہے کیونکہ اُس نے یہ مضمون کہا نہیں تھا۔ درحقیقت ایک بات کہی تھی جس سے سننے والے نے اپنی ذہانت سے یہ اشارہ پیدا کیا تھا کہ اُس دن کی بات کا جواب ہے اُس کو اُس قائل کی طرف بطور قول منسوب کرنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دوسرا فرق ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ الفاظ کے پہلی قسم کے معنی یعنی جو الفاظ کے ذریعہ سے مراد و مقصود متکلم ہوں ہمیشہ ایک ہی ہو سکتے ہیں۔ اُن میں کبھی کثرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ناممکن ہے کہ ایک لفظ سے بوقت واحد ایک سے زیادہ معنی کا لحاظ کیا جائے لیکن وہ معانی کہ جو بطور اشارہ نکل سکتے ہیں وہ ایک سے بہت زیادہ ہو سکتے ہیں بلکہ کلام اتنا ہی اعلیٰ پایہ کا ہوگا جتنے اس قسم کے معانی اُس میں زیادہ پیدا ہو سکیں۔

پہلی قسم کے معانی الفاظ کی وضع لغوی سے تعلق رکھتے ہیں اور قرائن لفظیہ و معنویۂ کلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن دوسرے قسم کے معانی میں سننے والے کی عقل اور افتاد طبیعت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے یہ معنی لفظ کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ لفظ کے معنی و مطلب کو ملحوظ رکھ کر سامع ایک رائے قائم کرتا ہے اس میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ معنی صرف سامع کے حسن ظن یا بدگمانی یا خاص افتاد طبع کا نتیجہ ہوں اور حقیقۃً متکلم کو مقصود بھی نہ ہوں۔ جیسے محفل میں ایک شخص وزدی پیشہ کسی کہنے والے کے ان الفاظ کو کہ "خدا کے فضل سے مجھے چوری کی عادت نہیں ہے" سن کر یہ رائے قائم کرے کہ اس سے مجھ پر تعریض منظور ہے کہ "اس شخص کو چوری کی عادت ہے"۔

یہ معنی مذکورہ الفاظ سے تو کوئی تعلق رکھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ وہ جملہ سلبیہ ہے، یہ ثبوتیہ وہ اپنی لسبت نفی ہے یہ غیر کے متعلق ثبوت ہے لہٰذا یہ نہ اُس کا مضمون ہے۔ نہ مطلب لیکن یہ تعریض وہی حیثیت رکھتی ہے جو دلالت اشارہ کے ذیل میں ذکر ہوئی۔

بہت ممکن ہے کہ کہنے والے کو خبر بھی نہ ہو کہ اس مجمع میں کوئی چوری کی عادت رکھنے والا موجود ہے لیکن "چور کی ڈاڑھی کا تنکا" وہ اپنی طرف لے جائے گا اور سمجھے گا کہ مجھ کو کہا جا رہا ہے۔

اسی طرح سابق وحال کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کبھی یہ اشارہ پیدا کر لیا جاتا ہے حالانکہ متکلم کو بوقت کلام اُن حالات کا لحاظ نہیں ہے۔ جیسے مذکورۂ سابق مثال میں مخاطب کا کبھی متکلم کو یہ کہہ چکنا کہ "میں تمھارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا" اور آج اتفاق سے اس متکلم کی زبان سے اُس مخاطب کی لسبت انھی الفاظ کا جاری ہونا پتہ دیتا ہے کہ اُس سے اُس دن کے جواب کی طرف اشارہ ہے مگر بہت ممکن ہے کہ متکلم کو اس وقت اُس دن کی بات کا خیال بھی نہ ہو مختصر یہ ہے کہ اس قسم کے اشارے پیدا کرنے میں وسعت بہت بڑی ہے مگر اس میں قدم قدم پر غلطیاں واقع

ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے۔

ایک شخص جو کسی کو اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہے اس کی ہر بات میں کچھ نہ کچھ اپنے لیے برا پہلو پیدا کرتا ہے اگرچہ وہ ہر طرح نیک نیتی کے ساتھ کلام کرتا ہو اور کسی برے پہلو کا قصد نہ کرتا ہو۔ ایک شخص جو دوسرے کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہے ہر بات میں محبت ہی کا پہلو نکالتا ہے چاہے کسی خاص کلام میں اُس کے وہ پہلو نہ بھی پایا جاتا ہو۔

اُس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور ہر شخص جب غور کرے تو اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

یہ چار درجے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مقصود کلام کی تعیین کے سلسلہ میں قائم کیے جا سکتے ہیں۔

ایک پانچویں چیز اور ہے۔ اور وہ تعیین مصداق کلام یعنی ایک لفظ اور اس کے خاص معنی ہیں اور یہ تلاش کیا جائے کہ وہ معنی کس فرد میں پائے جاتے ہیں اور کون اُن کا مصداق قرار پا سکتا ہے یا اس مصداق کی فرد اکمل ہے۔

اس چیز کو مدلول کلام اور مقصود خطاب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ بالکل خارجی چیز ہے۔ اس کی تعیین شرح کلام کے تحت میں کسی طرح داخل ہی نہیں ہو سکتی۔

شرح کلام میں اگر آ سکتے ہیں تو لفظ کے معنی۔ مطلب۔ مقصد۔ اور وہ معانی کہ جو بطور اشارہ اُس کلام سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ امر کہ اس معنی کا مصداق کہاں پایا جاتا ہے اور کہاں نہیں۔

اس کو بیان مقصود و شرح الفاظ کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ کوئی واسطہ ہے۔

"تفسیر قرآن" جس چیز کا نام ہے اُس کو اس پانچویں چیز سے کوئی ربط نہیں ہے۔ کسی آیت کے معانی و مطالب کی تعیین کے بعد یہ بحث کہ اس آیت کا صحیح مصداق کیا ہو سکتا ہے؟ کسی طرح تفسیر کے تحت میں داخل نہیں ہوتا۔

اور اس لیے اس تعیین مصداق میں اگر مشاہدہ تجربہ یا عقل کی رہنمائی کی ضرورت ہو تو اُس سے کام لینا "تفسیر بالرائے" کے تحت میں مندرج نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو

(۱)

قرآن مجید میں ہے ربُّ المشرقین وربّ المغربین۔

اس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ خداوند عالم مالک ہے دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا۔ مشرق سے مراد بھی جیسا کہ اُس کے ظاہری معنی ہیں مشرق آفتاب اور مغرب سے مراد مغرب آفتاب ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ اس معنی کو بدل دے۔ اپنی عقل کے اوپر زور دے کر مثلاً یہ کہہ دے کہ مشرقین سے مراد "مشرق آفتاب نبوت" اور مشرق خورشید امامت ہے تو یہ یقیناً معنی میں تصرف ہے اس لیے وہ ہماری آئندہ بحث سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق و مغرب کے ظاہری معنی نقطہ طلوع و غروب قرار دیتے ہوئے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ یہ دو مشرق اور مغرب کون سے ہیں۔ تفسیر نہیں ہے۔

سابق زمانہ کے مفسرین نے مشرقین و مغربین کا مصداق گرمی اور جاڑے کا مشرق و مغرب قرار دیا اس لیے کہ اُن

کے ذرائع معلومات محدود تھے۔ اُن کو اس زمانہ کے ایسے انکشافات حاصل نہ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص جدید انکشاف کی بنا پر یہ کہے کہ مشرقین و مغربین کا مصداق حقیقی امریکا کے انکشاف سے پایۂ ثبوت کو پہونچا ہے اور دو مشرق دو مغرب آفتاب کا نقطہ مشرق و مغرب اس قطعہ زمین پر اور دوسرے اُس قطعہ زمین پر جہاں امریکہ واقع ہے اور یہ آیت قرآن امریکا کے وجود کا پتہ دے رہی ہے جو اُس کے جہت اعجاز کا معمولی کرشمہ ہے تو یہ کسی طرح تفسیر بالرائے نہ ہوگا۔

اس انکشاف کے لیے ہم کو حدیث و قول معصوم سے سند کی ضرورت نہیں ہے جب کہ خود قرآن مجید میں دو مشرق اور دو مغرب کا پتہ موجود تھا لیکن ہم اپنی کوتاہی معلومات کی وجہ سے اُس کے مصداق کا پتہ نہیں چلا سکے تھے۔

اب جب کہ ہمارے ذرائع معلومات میں وسعت پیدا ہوئی تو ہمیں اس کا پتہ لگا ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ اس کہنے میں کوئی گناہ ہے۔

(۲)

ربُّ المشارق وربُّ المغارب

سابق زمانہ کے مفسّرین کو اس کے مصداق کے سمجھنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ آفتاب تو ایک ہے پھر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب کہاں سے آئیں، اس لیے اُنھوں نے مشارق اور مغارب سے مراد ہر دن کا مشرق و مغرب قرار دے کر یہ کہا کہ آفتاب اپنی ذاتی حرکت کی بنا پر سال میں ہر دن ایک نئے مشرق سے نکلتا ہے اور ایک نئے مغرب سے اس بنا پر "مشارق" اور "مغارب" کہا گیا۔

حال کی تحقیقات میں یہ ثابت ہوا ہے کہ آفتاب ایک نہیں ہے۔ جتنے ثوابت ستارے سمجھے جاتے ہیں وہ ہر ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مستقل نظام ہیں اور اس نظام کے تحت میں سیارے ہیں۔ اُن تمام آفتابوں کے لیے اپنے اپنے سیارات کے اعتبار سے اسی طرح طلوع ہے اور اسی طرح غروب اس لیے مشارق اور مغارب کا بہترین مصداق ان تمام آفتابوں کے مشرق ہیں اور اُن کے مغرب۔

ایسا کہنا اگر صرف فاتی عقل کے صرف کرنے سے بھی ہو تب بھی تفسیر بالرائے نہ ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتابوں کا متعدد ہونا ائمہ معصومین علیہم السّلام کے احادیث میں بھی وارد ہوا ہے اس لیے رب المشارق والمغارب کے مصداق کی تعیین اقوال ائمہ معصومینؑ سے بھی ممکن ہے۔

(۳)

الحمد لله رب العالمین

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم متعدد ہیں اور حضرت احدیت اُن تمام عوالم کی پرورش کرتا ہے۔ معنی آیت کے صاف ہیں اور اُن میں کوئی گنجلک نہیں ہے لیکن یہ بہت سے عالم آئیں کہاں سے؟ عالم تو یہ ایک ہی ہے جو فلک الافلاک

سے شروع ہوتا اور اس مرکز ارض پر ختم ہو جاتا ہے اس لیے محدود علم والے مفسرین نے "عوالم" سے مراد انواع کائنات لیے۔ حالانکہ کسی طرح صحیح نہیں ہے یہ تمام انواع ایک ہی عالم کے اجزا ہیں متعدد عالم نہیں ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے آگے نظر کی رسائی ہی نہ ہوی۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا اس نظام شمسی میں محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے نظام بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک دنیا موجود ہے تو یہ عالموں کے بہت تعداد میں ہونے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن نے پہلے ہی اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیاؤں کے وجود کی خبر دی تھی تو اُسے تفسیر بالرائے کے تحت میں لانا صحیح نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ تو احادیث سے بھی ثابت ہے کہ عالم ایک نہیں ہے بلکہ متعدد ہیں تفصیلی بحث کے لیے اس آیت کی تفسیر کا انتظار کرنا چاہیے۔ آیتیں اس قسم کی بہت ہیں لیکن مثال کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

اس قسم کے نمونے جتنے آئیں جہاں معنی و مطلب میں کوئی تبدیلی نہ کی جا رہی ہو بلکہ مصداق کی تلاش کر کے دکھایا جا رہا ہو اس کے لیے کبھی حدیث و تفسیر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے عقل سے اپنے ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ ہرگز ہرگز تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہ ہوگا۔

تفسیر معانی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اُس کے معنی ہیں "کشف المبہم" یعنی غیر واضح کو واضح کرنا اور اسی مناسبت سے "استفسار" بمعنی استفہام مستعمل ہے یعنی کسی امر کو واضح کرنے کی خواہش۔

مذکورۂ سابق مدارج جو معانی الفاظ کے متعلق تحریر کیے گئے اُن میں سے پہلا ایک قہری چیز ہے جو لفظ کے کسی معنی کے لیے وضع ہونے کا نتیجہ ہے اور لفظ کے گوش زد ہونے اور سامع کے اس معنی پر مطلع ہونے کے ساتھ اس کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

لفظ سے اُس کے معنی کا ذہن میں آ جانا فطرت کا لازمہ ہے جو کسی کے بس کی بات نہیں ہے لہذا تفسیر بالرائے کا اس سے تو تعلق ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ انسان کا اختیاری امر نہیں ہے کہ جس سے طبیعت کا روکنا ممکن ہو۔

دوسرا درجہ یعنی الفاظ کو سن کر قرائن حالیہ و مقالیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس لفظ کے کلام متکلم میں یہ معنی ہیں۔ یہ بھی ہر زبان دان کا فطری حق ہے جو سلب نہیں ہو سکتا۔ تمدن و اجتماع کی بنیاد افہام و تفہیم پر ہے اور وہ اسی بنیاد پر قائم ہے کہ ایک متکلم کے کلام سے دوسرے کو معانی سمجھنے کا حق ہو بے شک یہ حق اس وقت سلب ہو جاتا ہے جب متکلم نے اس امر کی تصریح کر دی ہو یا خارج سے کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کا کلام عام روزمرہ کے محاورات پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ شروع سے آخر تک مخصوص اصطلاحات پر مبنی ہے۔

اس طرح بے شک الفاظ کے متعلق مراد متکلم کے سمجھنے کا دروازہ بند ہو جائے گا جب تک کہ اُن کے معانی بھی اُسی کی طرف سے بیان نہ کیے جائیں۔

لیکن قرآن مجید اس طرح نہیں ہے۔ وہ عام زبان و محاورہ کے مطابق اور مروجہ اصطلاحات و استعمالات ہی کے موافق نازل کیا گیا ہے۔ اسی لیے بار بار لوگوں کو اُس میں تدبر اور اُس کے معانی میں غور و تامل کی ہدایت ہوی ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا" یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔ کیا اُن کے دلوں پر قفل لگے ہوے ہیں"۔

اُس کی سچائی کا ثبوت پیش کرتے ہوے یہ بھی ارشاد ہوا "ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً" اگر یہ غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف نظر آتا"۔

اگر معانی قرآن میں افہام و عقول کے لیے رہروی کا راستہ ہی بند ہوتا اور اس کے معانی سمجھنے کا حق نہ ہوتا تو پھر تدبر و تامل اس کے معانی میں بے کار تھا اور اختلاف و عدم اختلاف کے جانچنے کا بھی کوئی موقع نہ تھا اس لیے کہ اختلاف الفاظ میں باعتبار معانی ہی ہو سکتا ہے۔

اس میں صاف تصریح موجود ہے کہ "انا انزلناہ قرانا عربیا" ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے"۔ کہیں ارشاد ہوا "بلسان عربی مبین" یہ صاف کھلی ہوی عربی زبان میں ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ عام روزمرہ عربی زبان میں ہے اور مبین کی لفظ سے تو اور زیادہ صاف ہوتا ہے کہ وہ بالکل واضح اور کھلے ہوے محاورات کے مطابق آیا ہے جس میں کوئی گنجلک نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو عقلی دلیل بھی ان آیات کے مفاد میں مضمر نظر آتی ہے۔ قرآن مجید رسالتمآبؐ کا معجزہ ہے اور اعجاز کی بنیاد اس امر پر ہے کہ جس شعبہ میں ایک زمانہ کے لوگوں کو ادعائے کمال ہو اُسی میں ان کی طاقتوں کو شکست دی جائے اس کی مثالیں سابق میں بحث اعجاز کے سلسلہ میں آ چکی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اور شعرا و ادبا کو اس میں کمال و سربلندی کا ادعا تھا، اس لیے اسی نوعیت کا معجزہ قرآن کریم عطا ہوا جس نے ان کے سر تسلیم کو خم کرا لیا لیکن حجت خدا اس کے ذریعہ سے اُس وقت تمام نہیں ہو سکتی جب وہ زبان و محاورات میں اُن کی اصطلاح سے جداگانہ ہو اس لیے کہ ایک زبان کے کامل ترین فصیح و بلیغ شخص کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی دُوسری زبان و محاورہ کی کتاب کا بھی بلحاظ فصاحت و بلاغت جواب دے سکے۔

بے شک یہ حجت اُسی وقت تمام ہوگی جب قرآن مجید عام روزمرہ زبان کے مطابق اور اسی اصطلاح پر مبنی ہو جس میں بحیثیت فصاحت و بلاغت اُن کو دعوائے خدائی تھا۔

اب اگر وہ فصاحت و بلاغت میں اس درجہ پر فائز ہوا کہ کوئی اس کے جواب دینے پر قادر نہ ہو تو اس کی حقانیت کا ثبوت ہوگا۔

متعدد آیات میں اس امر کا اظہار کہ یہ قرآن عربی زبان میں ہے غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ دیکھو یہ کوئی نئی زبان نہیں ہے اور نہ جدید اصطلاحات ہیں بلکہ یہ اُسی عربی زبان کے روزمرہ میں ہے جس میں تم کو فصاحت و بلاغت کا انتہائی دعوے ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تم اس کے جواب میں عاجز ہے تو اسے تم کو اپنی طاقت سے بلند ایک چیز سمجھنا چاہیے۔

اب اس میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ قرآن مجید مخصوص محاورات و اصطلاحات پر مبنی نہیں ہے اور اس کے بعد ہر عربی زبان کے واقف کار کو اُس کے معانی و مطالب سمجھنے کا حق حاصل ہے اور اس میں سوائے محاورات عرب سے واقفیت کے کوئی شرط نہیں ہے۔

بے شک یہ صورت حال درد انگیز ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر شخص جو عربی سے کوئی حس و مس نہ رکھتا ہو وہ بھی قرآن فہمی کا مدعی ہے۔ اس کو سوائے دماغی "بوالہوسی" کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کے بعد "شیوۂ اہل نظر" کی آبرو کا جانا یقینی و لازمی ہے۔

اسی صورت سے بالکل تیسرا درجہ یعنی کلام کے مقصود اصلی کی تعیین جو بضمیمۂ قرائن وغیرہ ہو۔

یہ بھی الفاظ کے ایسے ہی معانی ہوتے ہیں جو محاورہ و استعمال پر مبنی ہیں اور اس لیے ہر لفظ کے معنی میں صلاحیت نہیں ہے کہ اُس سے کسی دُوسرے معنی کو بطور مقصود اصلی قرار دے لیا جائے۔ بلکہ وہ دُوسرے معنی وہی ہو سکتے ہیں جو اُس لفظ کے اصلی معنی کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتے ہوں کہ ذہن اس لفظ کے سننے سے اُس معنی کی طرف منتقل ہو سکے اور اس لیے الفاظ کے محاورات و اصطلاحات سے واقفیت کی صورت جس طرح انسان اُن کے معانی تحت اللفظ کے سمجھنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح اُن معانی کے مطلب اور مقصود اصلی کے استفادہ کا حق بھی ہے۔

اسی لیے کثیر التعداد احادیث میں مختلف مقامات پر آئمہ معصومین علیہم السّلام نے احکام شرعیہ کے استفادہ کے لیے آیات قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے رواۃ احادیث کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن مجید سے شرعی احکام کو حاصل کریں۔

بے شک یہ امر ملحوظ رہے کہ کنایات اور مجازات کی تعیین میں ان تمام اُصول و شرائط کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اہل زبان نے مقرر و معین کیے ہیں۔

مثلاً اگر معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن ہے اور اُس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ معنی مجازی یا کنایہ پر اُس کا محمول کرنا اصول تکلم کے لحاظ سے درست نہ ہوگا اور صرف اپنے ذاتی خیال کے مطابق جو کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے ایسا کرنا تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج ہوگا۔

اس کے علاوہ جب معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے کنایہ یا مجازی معنی کو مراد لینا درست ہوگا جو محاورہ اور استعمال عرفی کے مطابق ہوں۔ ایک ایسے بعید معنی پیدا کرنا جو اس معیار کے تحت میں داخل نہ ہوتے ہوں اصول تکلم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں یہ کہنا کہ مراد خداوند عالم یہی ہے تفسیر بالرائے کا صحیح مصداق ہوگا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

قرآن مجید میں حضرت عیسٰی کے معجزات کا تذکرہ ہے۔

انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ وابرئ الاکمہ والابرص واحیی الموتی باذن اللہ۔

اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ حضرت عیسٰی مٹی سے ایک مجسمہ بصورت طائر بناتے تھے اور اُس میں پھونکتے تھے

وہ بحکم خدا صبح ہی کا پرند بن جاتا تھا کور مادرزاد اور کوڑھی کو شفا بخشتے تھے اور مردوں کو بحکم خدا زندہ کرتے تھے۔

یہ امر کسی عقلی بداہت اور نظریہ کے خلاف نہیں ہے کہ حضرت احدیت کے حکم سے اس کے کسی مخصوص بندہ کے ہاتھ پر اس قسم کے عجائب کا ظہور ہو۔

لیکن بعض اصحاب نظر نے جو معجزات انبیاء کے قائل نہیں ہیں آیت کے عجیب عجیب معانی بتلائے ہیں۔

"مٹی سے" کی لفظ سے مراد ہے انسان کہ جو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

"پرند کی صورت" اس کے معنی ہیں کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے فضائے روحانیت میں اڑنے کی "پھونکنے سے" مراد ہے ہدایت کی روح کا پہونچانا اور "فتکون طیرًا باذن اللّٰہ" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معارف و ہدایات کو حاصل کرکے ہوائے معرفت میں پرواز کرنے لگتا ہے، اندھے اور کوڑھی کو شفا دینے کے معنی ہیں اُن لوگوں کو ہدایت کرنا جو بالکل علوم و معارف سے بے بہرہ تھے۔ اور "مردوں کو زندہ کرنے" کے معنی کافروں کو مومن بنانا اور گمراہوں کو ہدایت کرنا۔

ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح الفاظ کی دنیا میں کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو کلام الٰہی چیستان بن جائے اور بالکل اصول و قوانین کلام سے دور جا کر گر پڑے۔

اس کو تفسیر بالرائے سمجھنا ضروری ہے اور کسی سیدھے سادے مسلمان کو اُس کی جرأت نہیں ہو سکتی اور نہ جائز سمجھی جا سکتی ہے۔

(۲)

قرآن مجید میں روز قیامت اور اس کے علامات، حشر و نشر اور مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کا بہت آیتوں میں تذکرہ ہے۔

یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی چیز قرآن میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی اہمیت دے کر نہیں بیان کی گئی ہے جس قدر روز قیامت کا تذکرہ۔

لیکن بہاء اللہ مازندرانی کی امت جو "بہائی" کے نام سے معروف و مشہور ہے وہ ان تمام آیتوں کے معانی دوسرے کہتی ہے۔ وہ "قیامت" سے مراد ظہور الٰہی یعنی خداوند عالم کے خاص نمایندہ کا ظہور "نفخ صور" سے مراد ہدایت کرنے والے کی آواز "مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے" سے مراد بے علم و عرفان افراد کا روح علم سے زندہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس طرح دنیائے لفظ و معنی میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کو کسی طرح کلام الٰہی کی صحیح تفسیر کے تحت میں نہیں لایا جا سکتا۔

(۳)

قرآن میں آیت ہے۔

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذابٌ عظیم۔

مہر لگا دی خدا نے ان کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کے لیے

سخت عذاب ہے"۔

بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کفار و مشرکین کی مذمت ہے، لیکن بعض ارباب عرفان نے اس کو اہل معرفت اور ارباب عشق صادق کی مدح قرار دیا ہے۔

خدا نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی یعنی علامت قرار دے دی کہ یہ خاص میرے لیے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں یعنی ماسوی اللہ کوئی چیز اُن کی نظروں میں سماتی ہی نہیں اور اُن کے لیے عذاب دردناک ہے، یعنی وہ محبت کی سختیوں کو جھیل رہے ہیں اور پھر عذاب "عذوبت" سے بھی مشتق ہے جس کے معنی "خوشگواری" کے ہیں اور محبت کی سختی میں ایک خاص خوشگواری و شیرینی بھی ہوتی ہے۔

اس قسم کے تاویلات صرف تفریح طبع کے لیے خوب ہیں لیکن کلام الٰہی اور اس کے معنی سے ان کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

اسی باب سے ملحق ایک شعبہ یہ ہے کہ عام مفہوم کی لفظ کو کسی ایک فرد مخصوص میں متعین کیا جائے اِس کے لیے دلیل خاص کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ ہوگا تو تفسیر بالرائے قرار پائے گا۔ مثال

والعصر ان الانسان لفی خسر" قسم ہے وقت عصر کی۔ یقیناً انسان نقصان اور گھاٹے میں ہے"۔

بعض واعظین سے سنا جاتا ہے کہ عصر جس کی قسم کھائی گئی ہے عصر روز عاشورا ہے ورنہ کوئی عصر اس کی مستحق نہیں کہ حضرت احدیت اس کی قسم کھائے۔

اس کے لیے اگر کوئی روایت معصوم ثابت نہ ہو تو یہ بہت کھلی ہوئی تفسیر بالرائے ہوگی جو کسی طرح جائز نہیں۔ بے شک اگر ایسے امور بطور احتمال ذکر کیے جائیں کہ شاید یہ مراد ہو اور بعید نہیں کہ ایسا مقصود ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

چوتھا درجہ یعنی الفاظ کے معانی و مطالب پورے ہو چکنے کے بعد اس بات کا پتہ لگایا جائے جس کی طرف اُس کلام سے اشارہ ہے۔ یہ الفاظ کے معنی و مطلب سے خارج چیز ہے اور اس لیے نہ افہام و تفہیم کے حدود اس کو اپنے اندر لیتے ہیں اور نہ محاورہ و گفتگو کے اصول اُس کو معتبر قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر جیسا کہ سابق میں ذکر ہوا یہ معنی جو اشارۃً نکالے جاتے ہیں نہ متکلم کی طرف منسوب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ان کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں ایسے اشارات و رموز موجود ضرور ہیں اور یہی وہ ہیں جن کو باطن قرآن بتلایا گیا ہے جس طرح کہ پہلے مدارج والے معانی و مطالب ظاہر قرآن میں داخل ہیں۔

اور اسی بنا پر ظاہر قرآن ایک ہے لیکن بطون قرآن متعدد ہیں یہاں تک کہ ارشاد ہوا ہے ان للقرآن سبعین بطنا۔ "قرآن کے ستر باطن ہیں" کیونکہ ظاہر قرآن کی بنیاد معانی الفاظ پر ہے اور معنی ایک لفظ کے بوقت واحد ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے لیکن باطن کی بنیاد رموز و اشارات پر ہے اور اشارہ ایک چیز سے متعدد امور کی طرف ممکن ہے۔

وہ ظاہر قرآن وہ ہے جس کے سمجھنے کا ہر ایک کو حق دیا گیا ہے۔ جو عربی زبان کے خصوصیات سمجھ سکیں لیکن باطن قرآن وہ ہے جس کے مخصوص اہل ہیں اور ہر شخص کو اُس میں طبع آزمائی کا حق نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشارات کی تعیین لفظ اور اس کے معنی سے تو تعلق رکھتی نہیں جس کو عام اصول و محاورہ کے مطابق سمجھا جا سکے بلکہ زیادہ تر سامع کی افتاد طبع اور ذہنیت کی تابع ہوا کرتی ہے اور اس لیے عام اشخاص کے کلام میں جب ہم اس قسم کے اشارات کی تعیین کریں تو وہ ہمیشہ واقع کے مطابق نہیں ہوا کرتی بلکہ سوء ظن یا سابق حالات و واقعات کے جوڑ توڑ کا نتیجہ ہوتی ہے اور اکثر متکلم کو وہ اشارہ یا تعریض مدنظر بھی نہیں ہوتی ہے جسے ہم نے اُس کے سر منڈھ دیا ہے۔

پھر جب معمولی اشخاص کے کلام میں عقل انسان مکمل رہنمائی نہیں کرتی تو خداوند عالم کے کلام میں یہ ناقص و غیر مکمل عقول کہاں صحیح نقطہ تک رہبری کر سکتے ہیں۔ اس لیے غلطی کا ہونا اس میں ناگزیر ہے۔

ایسے رموز و اشارات کی تعیین اور ظاہر لفظ سے آگے معنی نکالنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ الفاظ کے ظاہر معنی کو سمجھ کر اُس کے مضمون پر عمل کرنا یا اس کو بیان کرنا ہرگز ہرگز تفسیر نہیں ہے کیونکہ تفسیر کے معنی تو غیر ظاہر کو ظاہر بنانے کے ہیں۔ یہ اُسی پر منطبق ہے جس میں ایک غامض و مخفی امر کا کشف ہوتا ہے اور وہ یہ چوتھی صورت ہے۔

پھر اس کے علاوہ ممانعت تفسیر بالرائے کی ہوئی ہے۔ پہلے مراتب و مدارج جو ہیں ان کی بنیاد محاورات عرب کے تتبع، زبان دانی اور واقفیت الفاظ و معانی پر ہے۔ وہ اگرچہ عقل پر موقوف ہے بایں معنی کہ ایک مجنون اس کو حاصل نہیں کر سکتا لیکن اُن معانی کی تعیین براہ راست عقلی غور و خوض سے تعلق نہیں رکھتی۔ برخلاف چوتھے درجہ کے کہ وہ نہ تو تتبع لغات پر مبنی اور نہ زبان دانی و وسعت نظر سے متعلق ہے بلکہ پورے طور سے اس میں عقل آرائی و طبع آزمائی کو دخل ہے کہ ہو نہ ہو متکلم نے اس کلام سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ چیز وہ ہے جس سے ممانعت ہوئی ہے۔

قرآن مجید کے آیات میں خود قرآن مجید نے تفریق کی ہے ارشاد ہوتا ہے منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم۔

"اُس میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں جن پر عمل بالقرآن کی بنیاد قائم ہے اور کچھ متشابہات ہیں" وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کجروی ہے وہ متشابہ حصہ کی پیروی کرتے ہیں تاکہ فتنہ پردازی کریں اور طرح طرح کی تاویلیں کریں حالانکہ اُس کی حقیقی تاویل سے سوائے خدا اور راسخین فی العلم کے کوئی واقف نہیں ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے دو حصے ہیں ایک محکم اور ایک متشابہ۔

یہ تفریق بھی درحقیقت اسی پر مبنی ہے یعنی بعض آیات تو وہ ہیں جس کے معنی ظاہری موجود ہیں اور کوئی عقلی و نقلی قرینہ اُس کے خلاف موجود بھی نہیں ہے۔ یہ محکمات ہیں اور ان کے ظاہری معنی تنزیل قرآن ہیں اور

ان کے سمجھنے اور اتباع کرنے کا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے اور بعض آیات وہ ہیں کہ جن کے کوئی معنی ظاہری نہیں بلکہ مجمل و مبہم الفاظ ہیں یا جو کچھ معنی ظاہری ہیں وہ کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بنا پر غیر ممکن الوقوع ہیں اور مراد نہیں لیے جا سکتے اور اس کے خلاف کوئی معنی ظاہری ہیں نہیں، بلکہ اُن آیات کے معانی صرف رموز و اشارات کے طور پر ہیں۔

یہ معانی باطن قرآن ہیں اور ان کی تعیین و تشخیص تاویل قرآن ہے اور اس کا دروازہ عام افراد پر بند کیا گیا ہے اور راسخین فی العلم کے ساتھ مخصوص قرار دے دیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو دنیا کے ہر مسئلہ کو قرآن سے ثابت کرانے کے متوقع ہیں اور اپنے مطالبہ کے ثبوت میں ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین کو پیش کرتے ہیں اور اس بنا پر جس چیز کا ثبوت قرآن مجید میں نہ ہو اُس کے ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ قرآن میں دنیا کا ہر خشک و تر موجود ہے تو اگر یہ بات بھی کوئی اصلیت رکھتی تو قرآن میں ضرور موجود ہوتی اور جب کہ قرآن میں نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے۔

ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ قرآن مجید نے تو خود اپنی تفریق دو حصوں میں کر دی ہے ایک حصہ محکمات دوسرا متشابہات۔ محکمات کے معانی ظاہر قرآن ہیں اور متشابہات کے معانی باطن قرآن۔

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین اس کے ضرور یہ معنی ہیں کہ ہر چیز قرآن کے اندر ہے۔ لیکن اس میں یہ نہیں بتلایا گیا ہے کہ وہ ظواہر قرآن کے اندر ہی موجود ہے بلکہ کثیر حصہ اُن اشیاء کا بواطن قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔

اب قرآن مجید کے ظاہری مطالعہ و جستجو کے بعد کسی خاص امر کے متعلق حکم لگا دینا کہ وہ قرآن مجید میں نہیں ہے ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص ہندوستان کے صوبہ اودھ میں کسی شخص کی جستجو کر کے حکم لگا دے کہ وہ ہندوستان میں نہیں ہے حالانکہ وہ صوبۂ پنجاب میں موجود ہے۔

قرآن مجید کا بسم اللہ کی ابتداء سے سورۂ ناس کی انتہا تک پورا تتبع بھی کیا جائے تو اگرچہ پورے قرآن کی جستجو ہو گئی لیکن حقیقۃً وہ ظواہر قرآن کے حصہ تک محدود ہے کیونکہ بواطن تک عام عقلیں پہونچنے سے عاجز ہیں۔

وہ لوگ کہ جو ہر چیز کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کا خود دعوی کر بیٹھتے ہیں جیسا کہ بعض واعظین اہل منبر کا وتیرہ ہے اور وہ اپنے تبحر و اقتدار علمی کا ایک روشن برہان دکھلاتے ہیں وہ خود چونکہ راسخین فی العلم میں سے نہیں ہیں اور اس لیے اُن کے عقول نافہام بواطن قرآن تک پہونچنے سے قاصر ہیں اس لیے اس علم بالقرآن کی ہوس میں وہ قدم قدم پر تفسیر بالرّائے کے خطرناک اور مہلک میدان میں پہونچ جاتے ہیں جس سے فلیتبوّأ مقعدہ من النّار (اپنی جگہ آتش دوزخ میں بنائے) والے ہولناک وعید کی زد میں آجاتے ہیں۔

درحقیقت انسان کے لیے یہ امر کامیابی کی نشانی ہے کہ اگر وہ کسی بات کو نہیں جانتا تو احساس بھی کرے کہ میں نہیں جانتا اس لیے کہ اس صورت میں وہ رہنما کا طالب ہوگا اور حقیقت کو دریافت کرے گا لیکن خطرناک ہے وہ صورت کہ لاعلمی میں علم کے خواب دیکھے یعنی کسی بات کو نہ جانتا ہو اور خیال یہ کرے کہ میں اسے خوب جانتا ہوں۔

وہ ہر ہر قدم پر غلطی کا مرتکب ہوگا۔ کسی منزل پر چلنے والا یا خود آنکھیں رکھتا ہو جن سے دیکھ کر راستہ قطع کرے یا کسی آنکھوں والے کا ہاتھ پکڑے جو اُس کو اپنے ساتھ لے جائے۔ نتیجہ میں یہ بھی منزل تک پہونچ ہی جائے گا لیکن غضب یہ ہوگا کہ خود آنکھیں نہ ہوں اور دماغ میں فتور الیا ہو کہ سمجھے میرے آنکھیں موجود ہیں۔ یہ قدم اٹھائے گا تاریکی میں اور کسی کو ہاتھ پکڑنے کے لیے آواز بھی نہ دے گا بلکہ مونھ اٹھا کر چل کھڑا ہوگا اُس کو ہر قدم پر خطرہ ہے کہ دیوار سے ٹکرا جائے۔ گاڑی کے نیچے دب جائے۔ موٹر سے لڑ جائے یا نالے کھودے گڑھے میں گر جائے اور ہلاک ہو جائے۔ یہی صورت ہے اُن اشخاص کی جو خود علم قرآن رکھتے نہ ہوں لیکن خیال یہ ہو کہ حسبنا کتاب اللّٰہ "کتاب خدا ہمارے واسطے کافی ہے"۔

یہ قرآن کے غامض و تاریک راستوں میں قدم اٹھائیں گے بغیر کسی راہنما کی ہدایت کے نتیجہ یہ ہوگا کہ بھٹکیں گے اور منزل مقصود سے دور جا گریں گے اور یہی معنی ہیں قول جناب رسالتمآبؐ کے:- انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلّوا بعدی وانھما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض" میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک کتاب خدا اور ایک اپنی عترت۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی میرے بعد گمراہ نہ ہوگے اور یہ دونوں جدا نہ ہو سکیں گے۔ جب تک میرے پاس حوض کوثر تک نہ پہونچیں یعنی قیامت کا موقع نہ آئے۔"

رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا ہے ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے گمراہ نہ ہوگے لہٰذا اگر ان میں سے ایک یعنی قرآن کیساتھ تمسک کا دعویٰ ہوا لیکن اہلبیت کا دامن ہاتھ میں نہ ہوا تو خود قرآن بھی دامن چھوڑا کر الگ ہو جائے گا۔ اسی بنا پر کہ قرآن کے حقیقی اسرار و دقائق سمجھنے کے لیے ذاتی بصارت نہ ہونے کی صورت میں رہنما کی ضرورت ہے جب کہ خود راسخین فی العلم میں سے نہیں تو راسخین فی العلم کا دامن ہاتھ میں ہو۔

بے شک اس وقت تمسک بالقرآن بھی ہوگا اور تمسک بالعترۃ بھی اور اگر نہ خود راسخین فی العلم سے اور نہ اُن کا دامن ہاتھ میں تو فہم قرآن کے عمیق وادی میں نہ ذاتی بصارت رہنمائی کو حاضر اور نہ ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے جانے والا موجود۔ اب جو قرآن پر عمل کے لیے قدم بھی اٹھایا تو ہر ہر قدم پر لغزش اور رفتہ رفتہ نقطۂ حقیقت سے ہزارہا کوس دور۔ اس طرح عترت کا دامن تو ہاتھ سے چھوٹا ہی تھا عمل بالقرآن بھی رخصت ہوا۔ اور قرآن اور عترت دونوں ہی سے محرومی ہوی۔

سابق اور حال تبصرہ کے بیانات کی مدد سے غور و فکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمۂ ظاہری یعنی الفاظ کے تحت اللفظی معنی کہنے کا حق ہر واقف زبان عربی کو ہے جس کو عربی الفاظ کے معانی پر اتنا عبور حاصل ہو کہ وہ لغت کی مدد سے سہی ہر لفظ کے معنی سمجھ سکتا ہو اور قرائن مقام کی مدد سے

مشترک الفاظ میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کرسکتا ہو لیکن ایسے اشخاص کا ترجمہ قرآن کے لیے کھڑے ہونا جو عربی کے محاورات سے اس طرح واقف نہیں ہیں خود غلطی میں مبتلا ہونا اور دنیا کو گمراہی میں ڈالنا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تراجم قرآن جو موجود ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہی اشخاص کے قلم سے ہیں اور اس لیے اُن کا ضرر نفع سے بیشتر ہے۔

(۲) قرآن مجید کے معانی و مطالب جہاں تک ظواہر قرآن کے ساتھ متعلق ہیں ہر شخص کو اُن میں غور و فکر کرنے کا حق اور نتائج نکالنے کا موقع حاصل ہے۔ قرآنی آیات سے استدلال بھی اُن کے ظواہر معانی کی بنا پر ہر شخص کے لیے صحیح ہے بشرطیکہ اس میں اصول محاورۂ و تکلم کا لحاظ رکھا جائے عام و خاص مطلق و مقید مجمل و مبین۔ منسوخ و ناسخ کا خیال کرنا ضروری ہے۔

اگر انسان میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھ سکے تو بے شک جو کچھ ظواہر قرآن سے وہ استفادہ کرے اس کو صحیح سمجھنا اور اُس سے استدلال کرنا اس کے لیے درست ہوگا۔ اس کے لیے احادیث معصومینؑ سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ قرآن فہمی کا دعویٰ رکھنے والے افراد اکثر مذکورۂ بالا خصوصیات کی واقفیت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس صورت میں قرآن کے مطالب پر غور کرنے اور اس سے استدلال کرنے سے سوائے گمراہی کے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہوسکتا۔

(۳) قرآن کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے جو رموز و اسرار پیدا ہوں، علمی نکات برآمد ہوں فلسفی انکشافات کا پتہ چلے۔ ادبی محاسن کا اندازہ ہو انھیں سمجھنے کی کوشش کرنا سمجھنا اور پھر دنیا کے سامنے پیش کرنا مستحسن خدمت ہے جس کے معتول ہونے کے لیے معانی و مطالب کے گذشتہ معیار پر سمجھنے کے ساتھ ذوق سلیم اور قوت نظر و فراست اور ایک حد تک ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہے۔

اس قسم کی نکتہ پردازی و موشگافی بارگاہ تفسیر میں اُس وقت مقبول ہوسکے گی جب اُس علمی نکتہ رمز، یا انکشاف کے ثابت کرنے کے لیے صحیح معنی و مضمون قرآن میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اور اُس کے انہی معانی سے کہ جن کا معیار ابھی بیان کیا جا چکا ہے وہ نکات و رموز پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن مجید کے اصلی معانی و مطالب کو محفوظ رکھنے کے ساتھ اُن کے مصداق صحیح کا پتہ لگانے میں اگر تاریخی، جغرافیائی یا فلسفی معلومات اور جدید انکشافات سے مدد مل رہی ہو تو ان معلومات سے مدد لینا اور قرآنی آیت کے صحیح مصداق کا پتہ چلانا درست ہوگا قابل اعتراض سمجھا نہیں جائے گا۔

(۵) "متشابہات" یعنی ایسے آیات جن کے ظاہری معنی کچھ متعین نہیں ہیں۔ بلکہ صرف رموز و اشارات کے طور پر اُن کے معانی کا تعین ہوسکتا ہے اُن کے معانی کے تعین میں عقل سے کام لے کر اُن اشارات و رموز کا قطعی طور پر انکشاف کرنا درست نہیں ہے بلکہ اس میں "راسخین فی العلم" سے تمسک کی ضرورت ہے۔

بے شک اگر عقل پر زور دے کر کچھ اشارات بطور احتمال پیدا کیے جائیں اور انھیں صرف امکانی حدود کے اندر رکھا جائے یقین کے ساتھ کہنے کی جرأت نہ کی جائے کہ ان الفاظ سے مراد یہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کے لیے اُس وقت بھی دروازہ بند نہیں ہوگا کہ جب کسی حدیث نے اُس رمز و اشارہ کی کوئی خاص جہت بتلادی ہو۔ اس لیے کہ قرآنی آیات کے یہ

اشارات صرف دو ایک جہتوں میں منحصر نہیں بلکہ کثیر التعداد وجوہ رکھتے ہیں جیسا کہ احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام سے ثابت ہے اس لیے کوئی ایک جہت احادیث سے ثابت ہوگئی ہے تو اس کی بنا پر غیر ممکن نہیں ہے کہ اور جہتیں بھی پائی جاتی ہوں اور اُن کا احتمالی طور پر ذاتی غور و فکر سے استخراج کیا جاسکے۔

(۶) وہ آیات جن کے اصلی و حقیقی معنی قرینۂ عقلی یقینی کی بنا پر مراد لیے جانا ممکن نہیں ہیں جیسے الرحمن علی العرش استوی۔ ید اللہ فوق ایدیہم وغیرہ ان میں معنی حقیقی سے علیحدہ ہونے کے بعد پھر اگر اصول محاورۂ و تکلم ہی کی بنا پر معنی قریب عام روزمرہ پائے جاتے ہوں تو یہ "متشابہات" نہ سمجھے جائیں گے جیسے ید کے معنی "ہاتھ" نہ ہونے کی صورت میں "قدرت و طاقت" یہ بالکل اصول محاورہ کے مطابق ہیں۔

ان معانی کی تعیین بھی صرف عقل سلیم اور محاورہ دانی سے متعلق ہے لیکن اگر اصلی معنی مراد لیے جانا ممکن نہ ہوں اور اُن کے علاوہ کوئی معنی قریب عرفی یعنی عام روزمرہ کے مطابق نہ ہوں تو پھر یہ آیات "متشابہات" قرار پائیں گے اور ان کے لیے یقینی طور پر بغیر "راسخین فی العلم" کے بتائے ہوئے کچھ کہا نہیں جاسکے گا امکانی اور احتمالی وجوہ کا بیان کرنا بے شک صحیح ہے اور ممنوع نہیں ہے۔

(۷) وہ الفاظ جن کے ظاہری معانی موجود ہیں اُن کے لیے بھی بطور رمز و اشارہ کچھ معانی پائے جاسکتے ہیں۔ انھیں بھی جب کہ اہل الذکر اور راسخین فی العلم سے ماخوذ نہ ہوں بطور احتمال بیان کرنا درست ہے احادیث ائمہ میں اس قسم کے معانی باطنیہ بہت مذکور ہیں انہی کا نام "تاویل" ہے اور یہ انہی حضرات کا مخصوص حصہ ہے۔

(۸) جن آیات کے لیے معنی باطنی بطور تاویل آئمہ معصومینؑ کی جانب سے بیان کیے گئے ہوں یا ذاتی غور و فکر سے بصورت احتمال پیدا کیے جاویں اُس تاویل کی بنا پر اُس آیت کی تنزیل یعنی اصلی ظاہری معنی بالکل نظرانداز نہ ہو جائیں گے بلکہ وہ پھر بھی قابل لحاظ اور واجب الاتباع ہوں گے اور اگر کسی عقیدہ یا عمل کا اُن کے ساتھ تعلق ہے تو اُن کی پابندی ہی لازم ہوگی۔

یہی بہت بڑا فرق ہے معنی مجازی میں کہ جو لفظ کے اصلی معنی کو چھوڑ کر مراد ہوا کرتے ہیں اور معنی رمزی میں کہ جو بطور اشارہ مقصود ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں اصلی معنی بالکل نظرانداز ہوتے ہیں اور اُن سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ دُوسری صورت میں اصلی معنی بھی محفوظ رہیں گے اور ان کی پابندی ہی لازم ہوگی۔

اس کو اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کر کے سمجھا جائے پھر قرآن مجید سے اس کی مثال پیش کی ہوگی۔ مثلاً ایک شخص نے کہا کہ فلاں محفل میں جو گیا۔ دیکھا شیر بیٹھا ہے۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا "محفل کا ذکر کرنا قرینہ ہے اس کا کہ "شیر" سے کوئی بارعب و ہیبت انسان مراد ہے اصلی شیر نہیں ہے۔

اب اگر اس متکلم نے کسی دن یہ کہا کہ میں نے "سب جانور دیکھے۔ شیر آج تک نہیں دیکھا" تو اُس سے بطور اعتراض یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم نے ابھی اُس دن کہا تھا کہ میں نے شیر دیکھا۔ یہ اعتراض ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب شیر سے مراد ایک مخصوص شیر صفت انسان ہوگیا تو اب شیر کے اصلی معنی سے اُس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ نہ اُس کے

صدق و کذب کے لیے اصلی جانور شیر کا دیکھنا نہ دیکھنا معیار بن سکتا ہے۔ یہاں اصلی معنی بالکل نظر انداز ہو گئے اور قابل لحاظ نہیں رہے۔

اب دوسرا جملہ ملاحظہ ہو۔ ایک شخص کسی ایسے انسان پر تعریض کرتے ہوئے جس کی آنکھوں میں خدانخواستہ بصارت کم ہے یہ کہتا ہے کہ خدا کے فضل سے میری آنکھوں میں بصارت کم تھوڑی ہے۔

یقیناً اس سے یہ کہنا مقصود ہے کہ فلاں شخص کی آنکھوں میں بصارت کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی بنا پر وہ خود اپنے الفاظ کی پابندی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اُس کا یہ کہنا جب ہی درست ہوگا جب حقیقۃً اُس کی آنکھوں میں بصارت کم نہ ہو۔ لیکن اگر تھوڑی دیر میں اُس نے خود ضعف بصارت کی شکایت کی تو اُس کا یہ کلام لغو مہمل اور غلط سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں اصلی معنی نظر انداز نہیں ہوئے ہیں اور اُن کے محفوظ رہتے ہوئے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن میں ان دونوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بہت باتیں ایاکِ اعنی واسمعی یا جارہ کے طور پر کہی گئی ہیں یعنی خطاب کسی سے ہے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے جیسے یہ آیت۔

لئن اشرکت لیحبطن عملک و لتکونن من الخاسرین۔

"(اے رسولؐ) اگر تم شرک اختیار کرو تو تمھارا عمل رائگاں ہو جائے اور تمھیں نقصان اٹھانا پڑے" حقیقۃً یہ تنبیہ رسالتمآبؐ کے لیے نہ تھی بلکہ دوسرے اشخاص سے متعلق ہے جو رسول کو آواز دے کر کی جا رہی ہے۔

حقیقی مقصود دوسرے لوگوں کے متعلق کہنا ہے کہ شرک کرنے کے بعد کوئی عمل قابل اعتبار نہ ہوگا۔ اب کوئی شخص استدلال کرنا چاہے یا اعتراض کرے کہ کلمہ "ان" عربی میں محتمل الوقوع بات کے لیے آتا ہے رسول سے کہنا کہ لئن اشرکت پتہ دیتا ہے کہ آپ سے شرک کے وقوع کا احتمال تھا اور یہ آپ کی عصمت کے خلاف ہے" تو یہ استدلال یا اعتراض درست نہ ہوگا اس لیے کہ یہ خطاب جب دوسروں کی تنبیہ کے لیے ہو گیا تو اس کے نتیجہ کا تعلق آپ کے ساتھ باقی ہی نہیں رہا بلکہ دوسروں کی جانب ہو گیا۔

۲۔ قرآن مجید میں بہت جگہ یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ کی لفظ ہے جس کے اصلی و ظاہری معنی نماز اور زکوٰۃ کے ہیں۔ اگر بعض روایات میں یہ نظر سے گذرے کہ اقامہ صلوٰۃ اشارہ ولایت کے عقیدہ کی طرف ہے جو سبب درستی عبادات ہے۔ تو بے شک یہ اشارہ اپنی جگہ پر درست ہوگا اور حق و صدق لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ یہ آیت وجوب نماز کی دلیل ہی نہ رہے اور کہا جائے کہ اس سے تو "ولایت ائمہ معصومینؑ" مراد ہو گئی اب اس کو نماز سے کیا تعلق۔ یہ مغالطہ ہوگا جو بالکل غلط ہے۔ اس آیت میں نماز کا حکم ہے اور پھر اشارہ وجوب ولایت کی طرف ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے معنی بالکل نظر انداز ہو گئے ہوں اور دوسرے معنی بطور استعمال لفظی مراد ہوں۔

تاویل آیات کے مختلف اقسام

آیات قرآن کی تفسیر و تاویل جو احادیث میں مذکور ہوتی ہے اُس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جن میں اکثر اشخاص کو اشتباہ ہوتا ہے اور اس لیے نتائج کے اخذ کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں۔

(۱) بعض احادیث ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں کسی آیت کے شان نزول اور مورد ورود کی تعیین کی جاتی ہے کہ یہ آیت کس موقع پر وارد ہوئی تھی۔ اس قسم کے احادیث سے اُن آیات کے عموم یا خصوص پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ الفاظ قرآن اگر عمومی حیثیت رکھتے ہیں تو شان نزول کے مخصوص ہونے کی وجہ سے ان میں خصوصیت پیدا نہیں ہوگی۔ بے شک اگر الفاظ آیت ہی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اُن میں خود عموم نہیں پایا جاتا تو حدیث اس وقت میں ایک تاریخی حقیقت کے انکشاف کا فائدہ دے گی کہ آیت میں شخص خاص سے مراد کون ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

(۱) افمن کان مؤمنا، کمن کان فاسقا لا یستوون "کیا جو شخص مومن ہو وہ برابر ہے اُس شخص کے جو فاسق ہو نہیں کبھی نہیں یہ دونوں برابر نہیں ہیں"۔ اس سے یہ کلیہ ثابت ہے کہ مومن اور فاسق عزت و احترام۔ احکام و حقوق میں مساوی نہیں سمجھے جا سکتے۔ بے شک ایسا ہی ہے۔ اگرچہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت شان امیر المومنینؑ میں وارد ہوئی ہے جب کہ آپ سے ولید بن عقبہ نے مفاخرت کرنا چاہی ہے۔ مومن سے مراد امیر المومنینؑ اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ مراد ہے۔

(۲) یا ایھا الذین امنوا ان جآءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔

"اے جماعت مومنین اگر فاسق تمھاری طرف کوئی خبر لائے تو تحقیق ضروری سمجھو"۔

اس سے کلیہ قائم ہو گیا کہ فاسق کی خبر بغیر تحقیقات قبول نہ کی جائے یعنی معتبر نہ سمجھی جائے۔

حالانکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس آیت کا مورد نزول ولید بن عقبہ ہے۔

دوسری قسم کی مثال جس میں پہلا جزو پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم و انتم لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم و عفا عنکم۔

جائز ہے تمھارے لیے شب ماہ صیام مقاربت کرنا اپنی عورتوں کے ساتھ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کیا کرتے تھے۔ اب خدا نے تمھیں معاف کر دیا۔

اس آیت میں پہلا جزء حکم کی صورت رکھتا ہے جو آئندہ سے متعلق ہے۔ اس میں عموم ہے اگرچہ مورد نزول معین اشخاص سے متعلق تھا لیکن حکم عمومی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ہمیشہ کے لیے قائم ہے دوسرا جزء کہ "خدا کو معلوم ہے

تم خیانت کرتے رہے مگر خدا تم کو معاف کرتا ہے"۔

یہ بیان واقعہ کی صورت رکھتا ہے جو ماضی سے متعلق ہے اس سے خود ظاہر ہے کہ وہ کچھ مخصوص افراد ہوں گے جو ایسا کرتے ہوں گے اور اُن کو معاف کیا گیا ہے۔

روایات نے بھی اُن کے اسما بتا دیے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اس سے کوئی عمومی کلیہ نہیں قائم ہو سکتا اور نہ مورد آیت کے بعد آنے والے لوگ اُس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں مثلاً مجرمین اپنے لیے ایک عمومی پروانہ عفو و مغفرت گذشتہ جرموں کا خیال کریں کہ جو کچھ جو کریں معاف کیونکہ خدا نے گذشتہ خیانتوں سے درگذر کی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر گناہ ہو چکنے کے بعد تو گذشتہ ہی میں داخل ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض آیتوں میں لفظی حیثیت سے عموم و شمول کا پہلو ہوتا ہے لیکن قرینۂ مقام اور سیاق کلام خود بتاتا ہے کہ اُس سے خاص اشخاص مراد ہیں یہاں بھی جو احادیث اُن خاص اشخاص کا مصداق بتائیں وہ حکم اُنہی افراد سے مخصوص سمجھا جائے گا۔ مثال

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔	تمہارا مالک بس خدا ہے اور اُس کا رسول اور وہ ایمان لانے والے جو نماز قائم کرتے ہوں اور زکوٰۃ دیتے ہوں ایسی حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔

الفاظ ظاہری حیثیت سے بے شک عموم رکھ سکتے ہیں یعنی ہر وہ شخص جو نماز پڑھنے کے ساتھ حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرے لیکن سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص قسم کے منصب حکومت کی قرارداد ہے جس کے لیے نا مزدگی خصوصیت کی مقتضی ہے۔

اب اگر روایات نے بتا دیا کہ یہ آیت امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے تو وہ کسی دوسرے شخص سے متعلق نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کسی درجہ تک صفت ایمان اور نماز گذاری کے ساتھ متصف بھی ہو اور حالت رکوع میں زکوٰۃ بھی ادا کرے۔

(۲) بعض احادیث کسی مفہوم وسیع کلی کے فرد اکمل یا فرد اہم کی تشخیص کرتے ہیں جو بوقت نزول آیت خاص طور سے منظور نظر ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ وہ آیت بالکل اُس شخص خاص سے مخصوص ہو گئی اور اُس میں عمومیت باقی نہیں رہی۔

ظاہر ہے کہ ہر مفہوم کلی جب کہ وہ بذریعہ لفظ زبان پر جاری ہو تو متکلم نیز مخاطب کی نظر کا اُس کے افراد کاملہ کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے اشخاص بالکل اُس سے خارج ہی ہو جائیں بلکہ ان افراد کے اندازہ کے لیے اس مفہوم کے دامن کی وسعت پر نظر ڈالنا ضروری ہوگی۔

اس کی نظیر حسب ذیل ہے۔

(۱) بعض روایات میں یہ ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں یا ایھا الذین امنوا کی لفظ ہے اُس سے

منظور نظر ائمہ معصومین ہیں۔

بے شک کیا شبہ ہے اس میں کہ وہ حضرات اس مفہوم کے مصداق اصلی اور افراد کاملہ ہیں لیکن اس سے بعض اشخاص کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اس صورت میں جو جو احکام واجبات و محرمات یا ایھا الذین امنوا کے خطاب سے مخاطب کر کے کہے گئے ہیں وہ سب ائمہ سے مخصوص ہو گئے اور ہم اُن احکام سے علیحدہ ہیں بالکل غلط ہے۔

ان اشخاص کو یا ایھا الذین امنوا کی لفظ کے استعمال کو اُس مقام پر دیکھ لینا چاہیے کہ جہاں اس کے بعد کا مذکور حکم ائمہ کی شان مخصوص کے بالکل خلاف ہے۔

جیسے یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کا تعلق باعتبار اپنے ذیل کے غیر ائمہ ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس کا منشا یہی ہے کہ یا ایھا الذین امنوا کے مفہوم کلی میں ائمہ معصومین کا فرد ممتاز ہونا دوسری بات ہے اور اُس کے بعد والے حکم کا اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص یا بالکل عام یا ان کے غیر کے ساتھ مخصوص ہونا دوسری چیز۔

اس بیان سے بہت سے اُن آیات کے متعلقہ روایات کا حل ہو جائے گا جن کے احکام کسی ذات سے مخصوص نہیں۔ لیکن اُن کے روایات میں یہ ہے کہ یہ آیات شان امیر المومنینؑ میں وارد ہوئے ہیں۔

اور اسی سے اُن روایات کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ثلث قرآن شان امیر المومنینؑ میں نازل ہوا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ جہاں جہاں بھی کوئی صفت مدح قرآن مجید میں ہے اس کے فرد ممتاز ہونے کی بنا پر بحیثیت لفظ امیر المومنین کا منظور نظر ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح آیات مذمت کا تعلق اعدائے اہلبیت کے ساتھ اگرچہ بسلسلۂ تذکرہ امم سابقہ ہو۔ ان تمام بیانات کی تطبیق مفصل طور سے ان آیات کے ذیل میں ہو گی جن کے متعلق اس قسم کے روایات وارد ہو گئے ہیں۔

(۳) بعض احادیث بے شک ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کسی عموم آیت کی تخصیص اور کسی اطلاق کی تقیید کی جاتی ہے۔ ان احادیث میں صاف طور سے مذکور ہوتا ہے کہ آیت قرانی میں عموم یا اطلاق مراد نہیں ہے بلکہ تخصیص ملحوظ ہے یہ احادیث اگر معتبر ہوں اور معیار اعتبار کے لحاظ سے قابل عمل ہوں تو یقیناً عموم یا اطلاق آیت کی تخصیص یا تقیید کا باعث ہوں گے۔ مثال

ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم۔	بیویوں کے لیے چوتھا حصہ ہے تمہارے متروکہ کا اگر تمہارے لیے اولاد نہ موجود ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو اُن کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

اس میں متروکہ کی لفظ مطلق ہے جس میں منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی کوئی تفریق نہیں ہے لیکن اگر احادیث معتبرہ سے ثابت ہو جائے کہ یہ حکم اموال منقولہ سے مخصوص ہے تو اس کا پابند ہونا ضروری ہوگا۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ متعدد آیات قرآن سے ملا کر کوئی مطلب نکالا جائے۔ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُن دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں کسی میں کوئی معنوی تصرف نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے ظاہری معنی پر برقرار رکھی جائے اور پھر بھی آیات کے مجتمع ہونے سے کوئی ایسا مطلب نکل آتا ہو جو اُن میں سے کسی ایک آیت میں خاص طور سے مذکور نہ تھا۔

یہ صورت درست ہے اور جو مطلب اس طرح پیدا ہو وہ یقیناً قابل اعتبار ہے۔

مثال ۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے جس میں مدت رضاع یعنی بچوں کو دودھ پلانے کی میعاد مقرر کی گئی دو برس۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔ بچہ والی عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دو برس تک دودھ پلائیں۔

دوسری آیت ہے جس میں کم از کم مجموعی مدت حمل اور رضاعت کی ڈھائی برس بتائی گئی ہے۔

وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا۔ اُس کے حمل اور دودھ بڑھائی تک تیس مہینہ ہیں۔

جس وقت ان دونوں آیتوں کو ملایا جائے۔ تیس[۳۰] مہینہ مجموعی مدت حمل و رضاعت۔ اس میں سے دو برس یعنی چوبیس مہینہ رضاعت کے لیے۔ باقی بچے ۶ مہینہ۔

یقیناً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم مدت حمل کی چھ مہینہ ہے۔

یہ نتیجہ بالکل درست ہے اور یقیناً مفاد کلام الہی ہے اگرچہ دونوں آیتوں میں سے کسی ایک میں بھی بہ خاص طور پر مذکور نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ یہ نتیجہ اجتماعی معنی ظاہری پر مبنی نہ ہو بلکہ دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے قرآن مجید کی کسی ایک آیت کے متعلق احادیث میں تفسیر کے لحاظ سے کوئی معنی باطنی بتلائے گئے ہوں۔ انسان اس معنی باطنی کو لے کر کسی دُوسری آیت کو جہاں اسی طرح کی کوئی لفظ مذکور ہو اُس معنی باطنی پر منطبق کرے اور اس سے کوئی خاص نتیجہ نکال لے۔ یا کسی مشترک لفظ سے ایک جگہ بقرینۂ مقام ایک معنی مراد ہوئے تو اب جہاں کہیں وہ لفظ آئے انسان اُسی معنی پر محمول کر دے اور یہ کہے کہ القران یفسر بعضہ بعضا اس جگہ اس لفظ کے یہ معنی مراد ہیں تو یہاں بھی یہی ہیں۔ یا ایک جگہ بطور مجاز کسی معنی میں استعمال ہوا ہو اور دُوسری جگہ قرینۂ مجاز کے معدوم ہوتے ہوئے بھی اُسی پہلی آیت کے استعمال کو قرینہ قرار دیا جائے۔

یہ جوڑ توڑ آیتوں کا ہرگز درست نہیں ہے۔ اگر کسی ایک آیت میں کسی لفظ کے کوئی معنی باطنی مذکور ہو گئے تو یہ ضروری نہیں کہ دوسری آیت میں بھی وہی معنی مراد ہوں اُس دوسری آیت میں صرف قیاس کی بنا پر اُن معانی کو پیدا کرنا تفسیر بالرائے ہوگا۔

اسی طرح ایک جگہ مشترک لفظ کے ایک معنی بقرینہ مراد ہو گئے تو دُوسری آیت میں اُس لفظ کے ضروری نہیں کہ وہی معنی ہوں یا ایک جگہ بطور مجاز ایک معنی میں استعمال ہوا تو یہ کہا ضروری کہ دوسری جگہ بھی وہی معنی ہوں

القران یفسر بعضہ بعضا۔ "قرآن مجید کی ایک ایک آیت خود دُوسری آیت کی تشریح کرتی ہے" درست ہے لیکن یہ قرآن مجید کی کوئی خصوصی صفت نہیں ہے بلکہ جو کسی دانشمند اصول محاورہ و تکلم کے واقف کار کا کلام ہو اُس میں یہ صفت پایا جانا ضروری ہے اور یہ ایک چیز ہے جو اصول محاورہ و تکلم کی پابند ہے۔ عام کی تخصیص خاص سے مطلق کی تقیید مقید سے یہ چیزیں وہ ہیں جہاں ایک متکلم کا ایک وقت کا کلام دوسرے وقت کے کلام کا مبیّن و شارح ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی صورت جب قرآن مجید میں پیدا ہو تو بے شک ایک آیت سے دُوسرے کی تشریح و تفسیر ہو جائے گی۔

لیکن اس کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک آیت کو دُوسری آیت سے پیوند لگا کر معنی پیدا کیے جائیں خواہ وہ اُصول محاورہ کے بالکل خلاف کیوں نہ ہوں۔

مثال ۔ قرآن مجید میں "صلوۃ" کی لفظ بمعنی درود مستعمل ہوی ہے۔

ان اللہ و ملٰئکتہ یصلّون علی النبیّ یاایھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیما ؕ

مگر یہ یقیناً یہیں سے مخصوص ہے۔ بعض مخالفین شریعت نے اس آیت کو قرینہ قرار دے کر جہاں جہاں قرآن مجید میں اقیموا الصلوٰۃ کا حکم تھا جو نماز سے متعلق ہے اُسے بھی درود کے معنی میں قرار دے لیا۔ بس اب کیا ہے۔ نماز سے چھٹکارا ہو گیا۔ درود پڑھ لیں گے وہ کوئی مشکل نہیں۔ یہ بالکل حقیقت سوزی اور باطل پروری ہے جو کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جا سکتی۔

واعظ لوگ اس طرح کے بہت جوڑ توڑ کیا کرتے ہیں۔ اس میں قدم قدم پر تفسیر بالرائے ہوتی ہے جو سخت ترین گناہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ بڑا نازک ہے اس میں وسعت بھی بہت ہے جو بہت سے تنگ خیال افراد کے نقطۂ تصور سے آگے ہے۔ یہ لوگ اتنے تابع لفظ ہوتے ہیں کہ ذرا غور و فکر صرف کر کے جو کوئی نکتۂ حکمت اور نقطۂ حقیقت قرآن سے نکالا جائے جو سابق کی کتابوں میں مذکور نہ ہو اُسے تفسیر بالرائے کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو "تدبر فی القرآن" کے حکم کا کوئی نتیجہ نہ ہوتا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس میں ضیق اور نزاکت بھی بے حد ہے جو اُن لوگوں کے حدود تخیل سے بہت تنگ ہے کہ جو قرآن مجید کے آیات کی آنکھ بند کر کے اپنے دل سے تفسیر شروع کر دیتے ہیں اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

یہی باعث ہے کہ ہمیں اس تبصرہ کو اتنے طولانی بنا دینے کی ضرورت پڑی۔ ہم نے اس میں جو اصول و قواعد قرار دیے ہیں ان کو اگر انسان پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ وہ نقطۂ اعتدال پر قائم رہ کر تدبر فی القرآن کے فیوض و برکات سے بہرہ مند بھی ہوگا اور تفسیر بالرائے کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے محفوظ بھی رہے گا۔

دسواں تبصرہ

قرآن مشکل ہے یا آسان

گذشتہ تبصرہ میں اس قسم کے بیانات موجود ہیں جو اس بحث کا تصفیہ کر دیتے ہیں پھر بھی چونکہ اس سلسلہ میں مزید بحث کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اس لیے ذیل میں اس تنقیح پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

"قرآن آسان ہے" اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہر شخص ترجمہ پڑھ کر قرآن سے مطلب نکال لے یہ اُس کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور اہل علم کی تشریح کا پابند ہو۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(پہلی دلیل) قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں مگر اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اُس کے معنی اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی ذمہ داری علمائے مذہب پر ہے جنھوں نے عام لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانسے رکھنے کے لیے عجیب و غریب معنی اور تفسیریں لکھنا شروع کیں۔ عجیب و غریب مسئلے گڑھے۔ ان مسئلوں کو قرآنی آیات سے مطابق کرنے کی کوشش میں قرآنی آیتوں کے وہ معنی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے لہذا یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے معنی اور مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح سے اس گروہ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور رکھا حالانکہ اگر اس کے معنی عوام نہیں سمجھ سکتے تھے تو لوگ اسلام کیسے لائے تھے۔ یاد رہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ ہر فرقہ اپنے اصولوں کی پیچ میں یا بادشاہت کی لاگ میں قرآن کے آیات کو اپنے مفید مطلب معنی پہنانے لگا اور کچھ دن بعد وہ اُس کا ایمان ہو گیا۔

(دُوسری دلیل) کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور آسان زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے۔ اگر نہ سمجھ سکے تو لکھنے والا قصوروار ہے نہ کہ پڑھنے والا، لہذا کسی کتاب کا مشکل زبان میں ہونا اُس کا عیب ہے، نہ کہ خوبی۔ قرآن بلیغ ہے اور بلیغ وہی کلام ہے جس سے کہنے والے کا مقصد سننے والے کے دماغ میں صحیح طور سے پہونچے۔

(تیسری دلیل) ہم خود قرآن سے پوچھیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے؟ قرآن میں ہے کہ ہم قرآن کو ایسی کھلی اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں جس کو تم سمجھ سکو۔ اگر اس کو ایسی زبان میں نازل کیا جاتا جس کو تم نہ سمجھ سکتے تو کوئی ایمان نہ لاتا۔ عربی کے معنی خود صاف اور کھلی ہوئی زبان کے ہیں۔

الٓرٰ کتاب احکمت اٰیاتہ ثمّ فصّلت من لدن حکیم خبیر۔ ولقد جئناھم بکتاب فصّلناہ علی علم ھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کتاب بھیجی ہے وہ حکیم بھی ہے۔ واقف کار بھی۔ اس نے ہر طرح سمجھ بوجھ کر کتاب کو تفصیل وار بیان کر دیا ہے۔

(۱) حمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتاب فصّلت اٰیاتہ قراٰناً عربیاً لقوم یعلمون بشیراً ونذیراً فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون۔

(۲) ولو جعلناہ قراٰناً اعجمیاً لقالوا لولا فصّلت اٰیاتہٗ ءاعجمی وعربی۔

ان آیتوں سے دو باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔

(۱) قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لیے جو عربی جانتی تھی۔ یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں ہے جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے۔

(۲) ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ لوگ سمجھتے نہ تھے بلکہ مُنہ پھیر کر چل دیتے تھے اور سنتے ہی نہ تھے یعنی صحیح طور سے متوجہ نہیں ہوتے تھے۔

ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدّکر" ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے۔

اس ایک آیت کو ایک سورہ کے اندر چار مرتبہ دُہرایا گیا ہے کیا اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن آسان ہے۔

(چوتھی دلیل) ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ قرآن کے لفظی معنی لیکچر کے ہیں قرآن میں ۱۱۴ سورے ہیں ہر سورہ بجائے خود ایک لیکچر ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ان لیکچروں کے درمیان میں لوگوں نے سوال کر دیے ہیں۔ ان کا جواب دے کر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے موضوع قرآن حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک خدا کی عبادت کرو (توحید)

(۲) ایک ایسے دن پر ایمان لاؤ جس دن اپنے کیے دھرے کا جواب دینا ہوگا (یعنی قیامت)

(۳) ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے اور لڑائی کے وقت کیسا برتاؤ کرنا چاہیے اور لڑائی کیسے لڑنا چاہیے (یعنی معاشرتی و جنگی احکامات وغیرہ)۔

(۴) ذیل کے اعتراضات اور اُن کے جوابات۔ ان میں کے دو اعتراض محمدؐ پر ہیں اور دو قرآن پر۔

الف۔ رسُولِ خدا پر دو اعتراض۔

(۱) چونکہ محمدؐ ایسے انسان ہیں جیسے اور انسان ہوا کرتے ہیں لہذا محمدؐ رسول نہیں ہو سکتے۔

(۲) چونکہ محمدؐ معجزہ نہیں دکھاتے ہیں لہذا رسول نہیں ہو سکتے۔

ب - قرآن پر دو اعتراض -

(۱) قرآن نازل وازل کچھ نہیں ہوا۔ محمدؐ کی من گھڑت ہے -

(۲) پہلے خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں موجود ہیں لہٰذا اب ایک اور کتاب نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۵) پرانے رسولوں کے قصے -

ان لیکچروں کا مضمون بہت چھوٹا سا ہے ۔ ان مضمونوں کو ہر لکچر میں دہرایا گیا ہے ۔ کہیں لوگوں نے سوالات بھی کیے ہیں ۔ خاص معاملات بھی آپڑے ہیں۔ سوالات کے جوابات اور معاملوں کے متعلق حکم بھی دے دیے گئے ہیں -

اوپر بیان کیے ہوئے موضوع قرآن کو مدنظر رکھ کر قرآن کو پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن سمجھ میں آتا ہے یا نہیں قرآن میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے تو بات لوگوں کے دماغوں میں سمائے ۔ اگر ایک لفظوں میں بات سمجھ میں نہیں آئی تو اُسے دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا۔ اگر ایک طریقہ سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو اُسے دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا۔ اگر اصول سمجھ میں نہ آیا تو مثال دی گئی۔ ان اصولوں کو قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم دونوں کے لیے ہے ۔

دوسرا اصول قرآن کو بلکہ ہر کتاب کو سمجھنے کا اُس کے معنوں پر غور کرنا ہے ۔

ان فی ذلک لذکریٰ لمن کان له قلب او القی السمع وھو شھید۔

افلا یتدبرون القراٰن ام علیٰ قلوب اقفالھا۔

تیسری بات - مترجم قرآن میں بریکٹ (   ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے ۔ قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے ۔

چوتھی بات - اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں۔

پانچویں بات آیتوں کے شان نزول کے جھگڑے بھی عام طور سے بے کار ہیں کیونکہ ہر فرقہ نے شان نزول اپنے مطلب کے موافق گڑھ رکھی ہے ۔ آیت میں اصول بیان کیے جاتے ہیں وہ اصول جب کبھی ایسا واقعہ ہوگا اُس پر چسپاں ہوں گے ۔

یہ بات بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ بے جوڑ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں ۔ عام طور سے سورے نازل ہوتے تھے اس کے ذیل میں قرآن کے موضوع کے متعلق حوالے پیش کیے گئے ہیں بہت سی آیات قرآن کے تراجم کے۔ یہ تھیں وہ اصولی باتیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن بالکل آسان چیز ہے ۔ اور اس کے لیے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے ۔ مگر کیا یہ نتیجہ درست ہے ؟ اس کے لیے ایک ایک کر کے مذکورہ پہلوؤں پر آپ کے سامنے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(۱) قرن اوّل کے مُسلمانوں کا عملِ بالقرآن

کیا یہ صحیح ہے کہ قرن اوّل کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقی حاصل کی ؟ شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر دل کی لگتی کہیے' قرآن کو سامنے رکھ کر بتایئے کیا قرآن میں کہیں اس کا حکم ہے کہ تلوار لے کر آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کر دو' امن وامان کو غارت کر دو اور لوگوں کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرو ۔ اگر یہ سب "عمل بالقرآن" ہی تھا تو غیر مُسلمین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ اسلام خونریزی کا حامی ہے اور وہ تلوار کے زور سے اپنی اشاعت کراتا ہے ۔ کیا اپنے کسی دعوے کی حمایت کے لیے اسلام کے دامن کو داغدار بنا دینا گوارا کیا جاسکتا ہے ؟

کیا قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کا رواج تعلیم قرآن کے مطابق تھا ؟

کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا رواج جس کے خلاف ابوذر غفاری احتجاج کرنے اُٹھے تھے عمل بالقرآن کا نتیجہ تھا ؟

کیا دمشق اور بغداد کی جہانداریاں صاف اور ستھرے اور سادے اسلام اور تعلیم قرآن کے موافق تھیں ؟

کیا عیش و عشرت کی گرم بازاریاں اور توبہ شکن حلقوں میں "مقدس" درباروں کی آتش آشامیاں قرآن کے رو سے بالکل مناسب تھیں ؟

کیا جمل اور صفین کی میدان داریاں، خود مسلمانوں کے گلوں پر مسلمانوں کی شمشیر آزمائیاں اور آپس کی فتنہ سامانیاں بہر صورت تعلیم قرآن کا مظاہرہ تھیں ؟

حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ الفاظ میں اتنی طاقت ہر گز نہیں کہ وہ انسانی حافظہ سے واقعات کی یاد محو کر سکیں ۔

کیا کربلا کا تاریخی واقعہ کسی عبارت آرائی کے زور سے مٹ سکتا ہے ؟ اور کیا جنگ حرّہ اور مدینہ و مکہ کی شرمناک داستانیں فنا ہو جائیں گی ؟

ممکن ہے کہ "خیر القرون" کو سراہنے والے مسلمان آج ناواقف غیر مسلموں کے سامنے پرانے زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کا جامہ پہنا دیں اور اُن کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھالیں مگر تاریخ کی دوربین سے اُس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے "گھر کے بھیدی" مسلمان بھی کیا اس فریب خیال کا شکار بن سکیں گے ؟

بڑے نیک طینت بڑے پاک باطن' ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں ۔

گنتی کے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی بدولت خواہ اُس زمانہ کو خیر القرون کہہ لیجیے اور خواہ جو مقدس نام چاہیے بنا لیجیے' جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے اتنی تاریکی نظر آرہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا "دور جہالت" اُس

کے سامنے بات ہے۔ صرف اس لیے کہ عام طور پر نہ مسلمانوں نے قرآن میں تدبّر کیا، نہ قرآن کے معانی کی تشریح میں حقیقی رہنماؤں کا دامن تھاما، نہ اُن عملی مثالیوں پر نظر ڈالی جنھوں نے اپنی سیرت کو قرآنی تعلیمات کی تصویر بنا رکھا تھا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کو اپنی ناقص سمجھ، ذاتی خیالات اور نفسانی خواہشوں کا جولانگاہ بنالیا اسی کا نتیجہ تھی مسلمانوں کی وہ ابتری، پراگندگی اور پریشانی جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اب آج بھی مسلمانوں کو اس پردہ میں کہ "قرآن مشکل نہیں، آسان ہے" اسی کی تلقین کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی ترقی یا اصلاح نہیں ہوسکتی۔ بے شک اپنی من مانی باتوں کو از روئے قرآن جاہلوں کے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔

وہ ناواقف بار ہے کاتیہ جو عربی کے سر پیر سے واقف نہیں یہ سنکر خوش ہوجاتا ہے کہ قرآن میں میرے وطن کا نام بڑی مہربانی سے "برادر" کی لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ یومئذ تحدث "اخ بارھا" اس بیچارے کو کیا خبر کہ یہ "اخ" برادر کے معنی میں نہیں اور وہ "بارھا" شہر کا نام نہیں ہے بلکہ "اخبار" ایک لفظ ہے جو خبر کی جمع ہے اور وہ "ھا" کی طرف مضاف ہے جو مؤنث کی ضمیر ہے۔ مگر یہ باتیں اُس کے سامنے کہیے تو وہ سمجھے گا کہ عالموں کی الٹی سیدھی تاویل ہے اور لہک لہک کر بار بار علامۂ اقبال کا یہ شعر پڑھے گا ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک جمع اور مضاف اور مؤنث کی ضمیر کی بحثیں اتنی دشوار ہیں کہ "پاژند" معلوم ہوتی ہیں اُسے تو آسانی اسی میں معلوم ہوگی۔ کہ وہ کہے "اخ بارھا" یعنی بارہا جو سادات کی بستی ہے یا قرآن میں انگریزی زبان کی لفظ تلاش کرنے والا خوش ہوجائے یہ آیت سُنکر

ولم یکن لہ کفُواً احدٌ۔

وہ اُسے یوں سمجھتا ہے کہ ولم یکن لہ کف one احد

سمجھتا ہے کہ وَن انگریزی کی لفظ ہے۔

اب اگر کسی بیچارے عالم کی شامت آئی اور اس نے کہا یہ وَنْ انگریزی کی لفظ نہیں ہے یہ تو کفو کی لفظ کا جزو ہے اور تنوین سے نون کا تلفظ پیدا ہوا ہے جو اعرابی حرکت ہے۔ کوئی مستقل لفظ نہیں ہے تو وہ فوراً کہنے لگے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک یہ عالمانہ تشریح تاویل اور پاژند ہے اور سیدھی سادھی بات جو قرآن سے نکلتی ہے وہ یہی کہ وَنْ بمعنی واحد انگریزی ہے اور اُس کی تفسیر ہے لفظ "احد" اور اس طرح اُس کے نزدیک ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن خود اپنا مفسر ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں۔

بتا ہے اس "بوالہوسی" کا کیا علاج کیا جائے اور اب "شیوۂ اہل نظر" کی آبرو کہاں رہ سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھ لیجیے کہ قرآن کے عجیب و غریب معنی اور تفسیریں جو لکھی گئیں، عجیب و غریب مسئلے جو گڑھے گئے،

قرآنی آیتوں کو وہ معانی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ سب اُسی دور کی پیداوار میں جسے قرن اول کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کرکے انتہائی ترقیاں حاصل کیں۔

بعد کے مسلمان تو سب زلہ خوار ہیں انہی اگلے زمانہ کے مفسّروں کے اور اُنہی کی تفسیروں میں سے کسی ایک کو لے کر اُس پر استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مگر وہ مفسّرین جن کی تفسیروں نے عجیب و غریب معانی کی بنیاد رکھی اور عجیب و غریب مسائل کی داغ بیل ڈالی وہ یہی صدر اسلام کے مفسّرین ہیں جیسے مجاہد، ضحاک، سدی، کلبی، مقاتل وغیرہ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اقوال سے کتب تفاسیر بھرے پڑے ہیں۔

بہر یقین جانیے کہ عجیب و غریب معانی کی ایجاد اور تاویلوں کی تراش خراش سب اسی اصول کے ماتحت تھی کہ قرآن آسان ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ سے اُس کے معنی بنا سکتا ہے۔ یہی وہ خیال تھا جو جمہور اسلام میں عام طور پر پھیلایا گیا اور اسی کے ماتحت قرآن کے آیات بازیچۂ اطفال بنالیے گئے۔ اس کے برخلاف اہلبیت رسولؐ کا یہ اعلان تھا کہ قرآن کے معنی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور اس کے لیے بڑے معلومات کی ضرورت ہے۔ ان کا اعلان یہ تھا کہ قرآن فہمی آسان نہیں، بہت مشکل ہے اور اس کے لیے خاص رہنمایان دین کے ساتھ جن کو رسولؐ کے تشریحات براہ راست پہونچے ہیں تمسک کی ضرورت ہے۔

جمہور اسلام نے آئمۂ اہلبیت کی اس تعلیم کو نہ پہلے کبھی مانا، اور نہ بعد میں اب تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اُس ترقی و تنزل کو جو جمہور مسلمین کے ساتھ متعلق ہے اس عقیدہ سے کس طرح وابستہ کیا جاسکتا ہے؟

مسلمانوں نے کسی وقت انتہائی ترقی کی اور اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہوگئے۔ یہ ممکن ہے بجائے خود حقیقت ہو مگر اُسے قرآن فہمی کے کسی نظریہ سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔

اس کا سبب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہ کہ مسلمان شروع شروع اُس سادہ اور مساویانہ نظام زندگی پر بربنائے عادت چلتے رہے جس کو پیغمبر اسلام نے رائج کیا تھا اور فطرت کے اُس پیغام کو لے کر آگے بڑھے جو دلوں پر قبضہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا، اس لیے وہ فتوحات حاصل ہوئے جنھیں آج اُن کی بہت بڑی ترقی کے نام یاد کیا جاتا ہے لیکن یہی ترقی تنزل کا پیش خیمہ بن گئی اس لیے کہ اُن میں ملوکیت کا دور دورہ ہوگیا اور سلطنت و کامرانی نے عیش و عشرت کا عمل دخل کردیا۔ کچھ دن تک دلوں پر بیٹھی ہوئی دھاک نے قوموں کا سر اُٹھنے نہ دیا لیکن جب ان کی عملی کمزوریاں طشت از بام ہوئیں اور اُن کے "رازہائے درون خلوت" افسانۂ ہر انجمن بن گئے تو سرگرم عمل قوموں کی جرأت بڑھی ان کی آپس کی رقابتوں اور داخلی کمزوریوں نے دشمن کی امداد کی اور آخر وہ ہوا جس کی بنا پر آج کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔

اگر وہ اُن کی ترقی سچے قرآن کے اصول کو سمجھ کر اُنہی حدود و قواعد کے باعث ہوتی تو وہ کبھی تنزل سے بدیل نہ ہوتی۔ وہ جماعت جو اقلیت میں تھی، جس کے سرگروہ اہلبیت معصومین تھے اُنھوں نے قرآن کے بارے میں مطلق العنانی اور غیر مشروط آزادہ روی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے لیے حدود و قواعد مقرر کیے اور ان کے تحت

میں تدبر فی القرآن کا حکم دیا۔ ان کے مختصر گروہ نے ہزاروں مادی شکنجوں کے اندر گرفتار رہ کر بڑے روحانی فتوحات کیے اور دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس نے اتنے مشکلات اور مصائب کے باوجود اس طرح اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہو اور اپنے دائرہ میں توسیع جاری رکھی ہو۔ یہاں تک کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں کچھ نہ کچھ افراد اُس کے ایک اصول، ایک مسلک اور ایک طریقہ کے پابند موجود ہیں۔ ان کی چاہے یہ ترقی سمجھیے یا تنزل، بہر حال وہ ایک محدود اور معتدل سطح پر ہمیشہ رہے۔ نہ دوڑ کر زیادہ چلے اور نہ گرے اور وہ ہمیشہ ایک راستہ پر قائم رہے کہ قرآن فہمی کوئی آسان بات نہیں، مشکل ہے اور اس لیے اُنھوں نے تنہا قرآن کو اپنی رہنمائی کے لیے کافی بھی نہ سمجھا بلکہ اہلبیت کے دامن سے تمسک ضروری خیال کیا۔ اب ان میں اگر روحانی حیثیت سے کچھ تنزل نظر آ رہا ہو تو اس کا سبب یہ سمجھنا چاہیے کہ ان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جو "ہمرنگ جماعت" بن کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور ہر شخص بذات خود اُس سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اس کے لیے کسی غیر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔

دوستو! یہ خیال ہماری قومی زندگی کے لیے راس نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ "رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔" غالباً اس ادعا کے موقع پر پیش نظر ایران یا پنجاب اور حیدرآباد کے بابی وبہائی، قادیانی، چکڑالوی اور مہدوی فرقے ہیں جو انہی آخری دنوں کے پیداوار ہیں۔ ورنہ جہاں تک اسلام کے اُن فرقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جن کے عقائد کتابوں میں مدوّن ہیں اور جن کے اختلافی مسائل پر بحث سے علم کلام کی تشکیل ہوئی ہے۔ وہ تمام فرقے رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی پیدا ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اگر آپ صدر اسلام کے واقعات پر نظر ڈالیے تو ان سے بھی معلوم ہوگا کہ اُس زمانہ میں بھی قرآن کی مختلف تاویلیں کی جاتی تھیں اور اس کے معانی میں اکثر دشواری محسوس کی جاتی تھی۔

پھر بتایے کہ کون سادہ دور ہو سکتا ہے جب قرآن کے معانی ومطالب بالکل متفقہ حیثیت رکھتے تھے اور اُن میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

بے شک قرآن کے مشکل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل "چیستان" ہے یعنی اُس سے کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

یقیناً اہل زبان اُس کے ظاہری معانی سے بہرہ اندوز ہوئے اور اسی کا اثر تھا کہ مشرکین مسلمان ہوئے اور اُنھوں نے اس کے غیر معمولی اعجاز کا اندازہ کیا مگر غیر عربی داں طبقہ کے لیے یہ بات بھی مفقود ہے۔ ان کے لیے قرآن کو آسان کہہ دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں۔

---

(۲) بلاغت کا مفہوم

"کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور سادہ زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے"۔

سوال یہ ہے کہ پڑھنے والا کون؟ ہر پڑھنے والا خواہ وہ زبان داں ہو یا غیر زبان داں؟ سمجھ دار ہو یا ناسمجھ؟ حاضر الذہن ہو یا پریشان دماغ؟ اگر بلاغت کا معیار یہ ہے اور کسی کتاب کی خوبی یہی ہے تو عالم امکان میں کوئی کتاب بلکہ کسی متکلم کا ایک جملہ بھی اس معیار پر ٹھیک نہیں اترتا۔

جب تک دنیا میں زبانیں مختلف ہیں۔ جب تک کہ دل و دماغ کی طاقتیں جداگانہ ہیں۔ جب تک سننے والوں کی کیفیتوں میں اختلاف ہے اُس وقت تک تو یہ ناممکن ہے کہ کسی کلام سے ہر پڑھنے والا پورا فائدہ اٹھا سکے اس لیے کم از کم آپ کو یہ قید تو لگانا ہی پڑے گی کہ جس زبان میں وہ کلام ہے اُس زبان کے واقف کار اُس کلام کو سمجھ سکیں اور اس قید کے لگانے کے ساتھ ہی قرآن کی اس آسانی سے اُردو داں طبقہ کی محرومی ظاہر ہے۔

خود ایک زبان میں مختلف مقامات کے محاوروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کلام سب کے لیے مساوی نہیں ہو سکتا۔ مختلف شہروں کی زبان جدا، شہر اور دیہات کی زبان بالکل الگ، بلند اور سفید پوش طبقہ اور بازاری لوگوں کی زبان علیحدہ اور مردوں عورتوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے زبان کے اکثر فقرے ایسے ہوں گے جو کسی کے لحاظ سے آسان اور کسی کے لحاظ سے مشکل ہوں۔ نتیجہ صاف ہے، کہ سب کے لیے اُن کی آسانی قائم نہیں رہ سکتی۔

اب میں نہیں سمجھتا کہ بلاغت کے مذکورہ معیار پر کونسا کلام وہ ہوگا جسے بلیغ کہا جا سکے؟

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جو مخصوص مخاطبین کے لحاظ سے جن کو براہ راست متوجہ کر کے وہ کلام کیا جا رہا ہے دشوار گذار نہ ہو مگر اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہر شخص کے لیے آسان ہی ہوگا، اور کسی کو اس کے سمجھنے کے لیے شرح اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔

پھر قرآن کی اگر وہ حیثیت ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے کہ وہ لکچروں کا مجموعہ اور اُن لکچروں کے ضمن میں جو خاص سوالات ہوئے ہیں اُن کا جواب بھی ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ لکچر کے ماحول، حاضر الوقت اشخاص کے معیار فہم اور سامعین کی ذہنیت کا لحاظ ضروری ہے۔ یہی بلاغت کا حقیقی تقاضا ہے۔

اس سے عمومی آسانی کا نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا ہے؟

اس پر بھی غور کر لیجیے کہ زبان میں زمانہ کے امتداد سے کتنے انقلابات ہو جاتے ہیں۔ قرآن کی تنزیل کو ساڑھے تیرہ

سو برس سے زیادہ ہوئے ہیں۔ غیر ممکن ہے کہ اس مدت میں تمام محاورات اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے خالص عرب اہل زبان بھی قرآن کے معانی کو صرف اپنی زبان دانی کے بھروسے پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ انھیں بھی قدیم محاورات عرب کے تتبع قدیم ذخیرۂ ادب پر عبور، اور آیات واحادیث کے مختلف استعمالات میں غور و خوض کی ضرورت ہے، اور اس لحاظ سے قرآن ان کے لیے بھی بالکل آسان نہیں ہے۔

اس کے بعد جہاں تک فصاحت اور سلاست کا تعلق ہے وہ الفاظ کے لغوی معانی اور کلام کے عرفی مفاہیم ہو سکتے ہیں لیکن جو کسی خاص شعبہ کے اصطلاحات ہوتے ہیں وہ بہر حال اُس شعبہ کے ماہرین کی تشریح پر موقوف ہوں گے۔ قرآن ایک خاص شریعت کا ترجمان بن کر آیا تھا اس لیے اس میں اس قسم کے الفاظ اور معانی کی کمی نہیں ہے صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج، خمس، انفال، جہاد وغیرہ سب اصطلاحی لفظیں ہیں۔ اس کی تشریح ہرگز صرف زبان دانی کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ماہرین شریعت کی تفسیر کی ضرورت ہوگی۔

اس صورت میں کیونکر کہا جا سکے گا کہ قرآن بالکل آسان ہے اور ہر شخص اُسے سمجھ سکتا ہے۔

پھر اب غور کیجیے کہ کلام کا مشکل ہونا جو بلاغت کے خلاف ہے اور جس کے لحاظ سے کلام کو آسان ہونا چاہیے وہ کیا ہے؟

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ ہو جس کی وجہ سے اصول محاورہ کے واقف اہل زبان اُس کے معنی کو نہ سمجھ سکیں خواہ وہ الجھاؤ ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہو۔ اس کو اصطلاحاً تعقید کہتے ہیں یا الفاظ ایسے صرف کیے گئے ہوں جن کے مفہوم کے لیے عام طور پر فصحا اہل زبان کچھ دوسرے الفاظ صرف کرتے ہیں اور ان الفاظ سے وہ واقف نہیں ہیں اس کو "غرابت" کہتے ہیں۔

لیکن اگر کلام بجائے خود اصول محاورہ کے مطابق ہے اور اُنھی الفاظ پر مشتمل ہے جو اُس کے دور دورہ میں فصحا کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے مگر اب ہمارے لیے مشکل ہے اس وجہ سے کہ ہم اُس زبان سے یا اُس دور کی زبان کے خصوصیات سے ناواقف ہو گئے ہیں تو اس طرح مشکل ہونا ہرگز کلام کا عیب نہ ہوگا بلکہ ہمارا نقص ہوگا کہ ہم اُس کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھیے کہ ایک ہوتے ہیں کلام کے لفظی معنی، یہ تو ایک کلام ہے جو کہ سلیس زبان میں ہے ہر زبان داں جو اُن محاورات سے واقف ہو سمجھ لے گا اور اگر نہ سمجھے تو خیر مان لیجیے کہ کلام کا نقص ہے لیکن ایک ہوتے ہیں وہ مطالب جو لفظی معانی کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا غور کیا جائے اُتنے نتائج اور حقائق کلام سے زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے جو متکلم کی بلندی اور قابلیت کے لحاظ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہے اور کلام کے اس حیثیت سے سمجھنے کے لحاظ سے انسانی جماعت کا مجمع اُتنا ہی چھٹتا جاتا ہے جتنے بلند متکلم کا وہ کلام ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن ایک غیر معمولی درجہ کا کلام ہے تو ضرور اُس میں یہ بلندی موجود ہوگی اور یقیناً انسانی

دماغ کی ایک بلند سطح ہی وہ ہوگی جو اُس کے معانی و نکات کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

اگر اُس میں یہ بات نہیں ہے اور وہ بالکل ہی سطحی باتوں پر مشتمل ہے جن کو ہر معمولی انسان پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے آگے اس میں کچھ نہیں ہے تو یہ "آسانی" یقیناً اُس کا نقص ہے۔

اس صورت میں وہ بلند طبقہ کے انسانوں سے اپنی عظمت تسلیم نہیں کرا سکتا اور نہ اُن سے اپنی فوقیت کا اقرار لے سکتا ہے۔

(۳) قرآن سے ثبوت

اب خود قرآن سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اپنے کو آسان بتاتا ہے یا مشکل؟ اس کے لیے ذیل کے آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) متعدد آیات میں رسول کے فرائض میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو قرار دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو سورۂ بقر پ۱ يتلوا عليهم اٰياتك ويعلمهم الكتاب والحكمة۔

پ۲ يتلوا عليكم اٰياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب الحكمة۔

سورۂ اٰل عمران پ۴ وسورۂ جمعہ پ۲۸ يتلوا عليهم اٰياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة۔

اس سے ظاہر ہے کہ رسول کا کام تھا آیات کتاب کو پڑھ کر سنانا (یہ کام الفاظ سے متعلق ہے) اور اُس کتاب کو تعلیم دینا (یہ معانی سے متعلق ہے)۔

اگر قرآن آسان ہوتا اس طرح کہ ہر شخص اُس سے خود ہی سب کو سمجھ لیتا تو تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔

(۲) هو الذی انزل عليك الكتاب منه اٰيات محكمات هن امّ الكتاب واخر متشابهات فامّا الذين فی قلوبهم زيغ فيتّبعون ما تشابه منه ابتغآء الفتنة وابتغآء تاويله وما يعلم تاويله الّا الله والراسخون فی العلم يقولون اٰمنّا به كل من عند ربنا وما يذّكّر الّا اولوا الالباب۔

"اس نے تم پر کتاب اتاری جس میں کچھ تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو "ام الکتاب" ہیں اور کچھ "متشابہ" آیتیں ہیں پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہوتی ہے وہ پیروی کرتے ہیں انھی اجزا کی جو متشابہ ہیں فتنہ پردازی اور تاویل سازی کے لیے حالانکہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر خدا اور "راسخین فی العلم" کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نہیں یادداشت حاصل کرتے مگر وہ لوگ جو سمجھ دار ہوں"۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ اس میں دو قسم کی آیتیں ہیں کچھ آسان اور کچھ مشکل۔ اور یہ کہ مشکل آیتوں کی اصلی تاویل کو سب نہیں جانتے بلکہ اُس کے جاننے والے مخصوص ہیں۔ میں نے ترجمہ "ام الکتاب" اور "متشابہ" کی اصلی لفظوں کو اس لیے لکھ دیا کہ قرآن کو آسان کہنے والے خود ہی اُس کے معنی سمجھ لیں۔ تفسیر کی کیا ضرورت ہے۔

(۳) سورۂ ص پ ۲۳ کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب۔

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، بابرکت تاکہ یہ لوگ اس کے آیات میں غور کریں اور تاکہ صاحبان عقل اس سے یاد دہانی قبول کریں"۔

جو شے بالکل کھلی ہوئی اور آسان ہو اُس کے لیے غور کی ضرورت نہیں ہوتی نیز صاحبان عقل و فہم سے مخصوص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل سطحی مطالب پر مشتمل نہیں ہے۔

(۴) سورۂ محمدؐ پ ۲۶ ۔ افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالها۔

اس آیت میں لوگوں کا شکوہ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں اگر قرآن بالکل سطحی ہوتا تو غور و خوض کی ضرورت نہ ہوتی۔

(۵) ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید۔

" اس میں یاد دہانی ہے اُس کے لیے جو دل و دماغ رکھتا ہو یا کان لگائے اس حالت میں کہ حاضر الذہن ہو"۔

جو چیز بالکل سطحی اور آسان ہوتی ہے اُس کے لیے ان شروط کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص خود ہی آسانی سے سمجھ لیتا ہے اب اگر کچھ آیتیں ایسی ہیں جو بتلاتی ہیں کہ قرآن آسان ہے تو اس کے معنی وہی سمجھنا چاہئیں جو ہم نے "بلاغت" کی بحث میں اس کے پہلے لکھے ہیں یعنی اس کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جس کی وجہ سے اصول محاورہ کے واقف اہل زبان اُس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور یہ کہ اُس کی زبان آسان ہے۔ نہ یہ کہ اُس کے مطالب بالکل سطحی ہیں جن کو ہر شخص بغیر کسی غور و تامل کے سمجھ سکتا ہے۔

پھر ذرا ان آیات پر نگاہ بھی ڈال لیجیے۔

کچھ وہ آیتیں ہیں جن میں کتاب مجید کے "مفصل" ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس تفصیل میں خود قید موجود ہے۔ (لقوم یعلمون) لاحظہ ہو آیت: حٰمٓ تنزیل من الرحمن الرحیم کتاب فصلت آیاته قرآنا عربیا لقوم یعلمون۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ونفصل الآیات لقوم یعلمون۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا مفصل ہونا ہر شخص اور ہر جماعت کے لحاظ سے نہیں ہے۔

پھر ان آیات سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جاسکتا ہے کہ قرآن ہر شخص کے لیے آسان ہے اور اہل علم کی تشریح و تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ وہ آیات ہیں جن میں قرآن کی زبان کو "مبین" کے وصف سے یاد کیا ہے مگر ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ خود قرآن کو آسان کہنے والوں کی زبان سے سن لیجیے۔

"قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لیے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے"۔

اب بتایئے کہ اس آسانی سے غیر عربی داں طبقہ کو بلکہ ان کو جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ بہر حال اہل زبان کی تشریح و تفصیل کے محتاج ہوں گے اور تفسیر کی ضرورت باقی رہے گی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جو ایک زبان میں زیادہ آسان ہوگا وہی دُوسری زبان میں زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

بات یہ ہے کہ زبان کی آسانی روزمرہ کے محاورات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور محاورے ہی وہ ہوتے ہیں جن کا ترجمہ بعض اوقات مشکل اور لبا اوقات غیر ممکن ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر اپنی زبان میں مشکل عبارت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس میں استعارے کنائے صرف ہوئے ہیں یا دقیق مطالب ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دُوسری زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں۔

پھر اگر قرآن کو عربی زبان والوں کے لیے آسان کہا بھی گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل سکتا ہے کہ وہ سب کے لیے آسان ہے اور مطلب تو یہی تھا کہ ہمارے اُردو داں طبقہ کو آسانی پیدا ہو اور انھیں علماء سے دریافت کرنے اور تفسیر و تشریح کی جستجو کی ضرورت نہ ہو مگر یہ مطلب قرآن کی آیتوں سے کسی طرح نہیں نکلتا۔

(۴) قرآن کا مطالعہ

"ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں"۔

مجھے نہیں معلوم قرآن کو پڑھ کر دیکھنے کا کیا مطلب ہے۔ اصل الفاظ قرآن کو دیکھ کر؟ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سمجھنا عربی دانی پر موقوف ہے اور غیر عربی داں ہر گز نہیں سمجھیں گے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ترجمہ کو پڑھ کر؟ بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے ثبوت میں بہت سا وقت قرآن کی آیتوں کے ترجمے پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ مگر یاد رکھیے کہ یہ ترجمے سب عربی داں لوگوں کے کیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ترجمے آسان ہیں لیکن یہ نہیں ثابت ہوگا کہ قرآن بالکل آسان ہے۔

(آسان ہونے کے ثبوت میں اپنی سمجھ کا مظاہرہ اس طرح کرنا کہ قرآن کے معنی لیکچر کے ہیں رہی غلط ہے قرآن کے لفظی معنی "لیکچر" کے نہیں ہیں بلکہ "ریڈنگ" کے ہیں۔)

اور ان لکچروں کا موضوع یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ قیامت پر ایمان لاؤ وغیرہ یہ سب باتیں بالکل آسان ہیں لہٰذا قرآن آسان ہے۔

میرے خیال میں اگر آسان ہونے کا یہی معیار ہے کہ اس طرح کا ایک خلاصہ آدمی سمجھ لے تو دنیا کی کوئی کتاب مشکل نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی دقیق فلسفہ کی کتاب آسان ثابت کی جاسکتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کا موضوع یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کن باتوں کے کیا اسباب ہیں۔ اور منطق کی کتاب اُس کا موضوع یہ ہے کہ کن طریقوں سے نامعلوم باتیں معلوم کی جائیں وغیرہ وغیرہ مگر کوئی کتاب جو مشکل ہوتی ہے وہ اُن جزئیات اور خصوصی مطالب کے

لحاظ سے جو اُس عام موضوع کے تحت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے قرآن کو اُس مجمل خلاصہ کے اعتبار سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اُس کے تفصیلی مضامین کے لحاظ سے تب آسان اور مشکل ہونے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کی آسانی کے ثبوت میں بہت سی آیتوں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں مگر یاد رکھیے کہ تراجم سب تفسیر کے ماتحت ہیں یعنی جس قسم کی تفسیر کو مترجم نے قبول کیا ہے اس کے مطابق آیت کا ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم سے مدد لینا حقیقۃً تفاسیر کا پابند بننا ہے۔ پھر تفسیر سے بے نیازی کا دعوٰی کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے۔

ترجمے صرف تحت اللفظی معنی پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ورنہ بعض اوقات شاید اُن سے کچھ بھی مطلب سمجھ میں نہ آئے بلکہ بریکٹ میں توضیحی الفاظ یا محذوفات کی خانہ پری کے لیے ضمیمے درج کیے جاتے ہیں۔ اس کا اقرار خود سابقہ دلائل کے ذیل میں موجود ہے کہ "مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے۔ قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے"۔

اس طرح کے ترجموں کو حقیقۃً ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہیے۔ پھر ان ترجموں کی مدد سے اگر قرآن آسان ہو گیا تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکلے گا۔ کہ وہ بغیر تفسیر کی مدد کے خود آسان ہے۔

بے شک اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں مگر یہ اُس وقت ہے جب کوئی شخص تنہا الفاظ قرآن سے معنی سمجھ لے لیکن اگر اُس نے مترجمین کی تفسیروں سے مدد لے کر معنی سمجھے تو تفاسیر بے کار کہاں ثابت ہوئے؟

شان نزول کو بے کار سمجھنا یہ کہہ کر کہ عام طور سے اصول بیان کیے جاتے ہیں اور اصول شان نزول کے پابند نہیں ہوتے، بالکل غلط ہے۔ اکثر آیتیں بنیادی حیثیت سے شان نزول ہی سے مخصوص ہیں۔ مثلاً قرآن میں کہا گیا الیوم اکملت لکم دینکم الخ "آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا"۔

جب تک کہ معلوم نہ ہو آیت کس دن اُتری "آج" سے کیا مطلب سمجھا جائے۔

یا یہ آیت کہ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔ اگر خصوصیت واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ عام اصول کہاں ہے کہ جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دے اُس کے واسطے ولایت ضرور ثابت ہوگی۔

یا یہ آیت کہ علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم۔

آخر کس عام اصول کی حامل ہے۔

یہ کہنا کہ "عام طور پر سورے نازل ہوتے تھے۔ متفرق آیتیں نہیں اترتی تھیں"۔ حقیقت کے بالکل خلاف ہے چھوٹے سورے تو خیر اکثر ایک ساتھ اُترے ہوئے بھی ہیں مگر جو بڑے سورے

ہیں اُن میں خود آیات کا مضمون صاف بتلاتا ہے کہ وہ مختلف موقعوں پر اتری ہوئی ہیں۔ اگر سورے ایک ساتھ نازل شدہ ہوتے تو آیتوں میں ناسخ اور منسوخ آیت ایک ہی سورے میں موجود نہ ملتی خصوصاً اس طرح کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد کو۔ نیز مکی اور مدنی آیتیں مخلوط نہ ہوتیں۔ حالانکہ موجودہ ترتیب قرآن میں یہ سب کچھ باتیں ہیں۔

اس کا ذکر ہمارے رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اب مذکورۂ بالا بیانات کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مشکل ہے یا آسان؟

گیارھواں تبصرہ

کتاب تفسیر کے ضروری خصوصیات

اور

موجودہ متداول تفاسیر پر ایک نگاہ

مذکورۂ بالا معیار کے مطابق جو ہم نے قرآن کے الفاظ و معانی و مطالب و ارشادات کے متعلق گذشتہ تبصرہ میں بیان کیا ہے ایک ایسی کتاب کے لیے جو تفسیر قرآن مجید کے طور پر تحریر کی جائے حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ تحریر ہونے کی ضرورت ہے۔

(۱) سب سے پہلے خود قرآن مجید کے الفاظ پر نظر ڈالی جائے اُس کے مفردات الفاظ کو لغت و محاورہ کے مطابق حل کیا جائے جس کی بنیاد زیادہ تر ذاتی حیثیت سے عربی علم ادب کے ساتھ مزاولت اور موارد استعمال کے تتبع پر قائم ہو سکتی ہے۔ صرف کتب لغت میں دیکھ لینے سے صحیح نقطۂ حقیقت تک پہونچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ مثلاً جیسا کہ علامہ بلاغی نے اپنی تفسیر آلاء الرحمن کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے ایک معمولی لغت "لمس" اور "مس" کا ہے اس میں لغت کی کتابوں میں وہ خبط و خلط ہے جس کی انتہا نہیں "نہایۃ اللغۃ" میں لفظ "مس" کے معنی میں لکھا ہے مست الشئ اذا لمسته بیدک۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ مس کے معنی ہیں "لمس" اب قاموس دیکھیے لمسه مسّه بیده ای

لمسہ ۔لمس کے معنی ہیں ہاتھ سے مس کرنا اور مس کے معنی لمس کرنا۔

مصباح میں ہے مسستہ افضیت الیہ بیدی من دون حائل" مس کے معنی یہ ہیں کہ ہاتھ پہونچایا جائے کسی چیز تک بغیر کسی حائل کے"۔

"لمس" کو لکھا ہے افضی الیہ بیدہ۔

"اس کے معنی ہیں ہاتھ کا پہونچانا کسی شئے تک"

ابن درید نے کہا ہے" لمس" کے معنی میں داخل ہے کہ ہاتھ سے مس کیا جائے اور پھر یہ کہا ہے کہ لمس کے معنی مس کے ہیں اور جو بھی کسی شے کو مس کرے تو اُس نے اُسے لمس کیا ہے"۔

فارانی کا قول ہے کہ لمس کے معنی ہیں مس۔ تہذیب میں ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ لمس کسی شے کا مس کرنا ہے اور مس کو لکھا ہے کہ مس کے معنی ہیں کسی شے کا مس کرنا ہاتھ سے۔ جوہری نے کہا ہے لمس کے معنی ہیں مس مصباح میں حل لغت کے بعد لکھا ہے۔

اذا کان اللمس ھو المس نکیف یفرق الفقھاء بینھما۔

"جب کہ لمس اور مس ایک چیز ہے تو آخر فقہاء ان دونوں میں فرق کیوں قرار دیتے ہیں"۔

لیکن جیسا کہ علامہ ممدوح نے تحریر فرمایا ہے حقیقت یہ ہے کہ فقہاء معنی الفاظ کو صحیح طور سے سمجھنے میں ان لغویین سے زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کی عمر گذرتی ہے کتاب اور سنت کی سیر اور کلام عرب کے تتبع میں۔ اُنھوں نے بہت خوب سمجھا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ لمس اور مس دونوں کے معنی بالکل ایک نہیں ہیں۔ ان دونوں میں باعتبار معنی کے فرق ہے۔

"لمس" کسی شے کا خاص طور پر چھونا ہے۔ ایک ایسے حصۂ جسم سے اپنے کہ جس میں احساس کی طاقت ہو" خاص طور پر چھونے کا مطلب یہ ہے کہ چھونا اسی قصد سے ہو کہ اس شئے کا احساس کیا جائے۔ خاص ہاتھ سے چھونے کی خصوصیت نہیں ہے مگر ہر طرح سے چھونے کی تعمیم بھی نہیں۔ اگر کسی اور حصۂ جسم سے اس مقصد سے چھا جائے کہ احساس حاصل ہو تو وہ بھی لمس ہوگا۔ لیکن اکثر یہ لمس ہاتھ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ وہ آسان ذریعہ ہے اور اُس کا احساس زیادہ قوی ہے مگر "مس" کے معنی ہیں چھو جانا دوسری شے کا۔ اس میں قصد احساس کی خصوصیت نہیں ہے جس طرح ہاتھ کے ذریعہ سے ہونے کی ضرورت نہیں۔

جو شخص موارد استعمال کا تتبع کرے اور اس کے ساتھ صحیح ذوق رکھتا ہو وہ تصدیق کرے گا کہ لمس اور مس کے یہی معنی ہیں جو تحریر ہوئے اور لغویین کی کوئی ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔

اس ذیل میں بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ ان میں غلط فہمی کا واقع ہو جانا کسی بڑے مختلف فیہ عقیدہ کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے۔

مثال کی حیثیت سے لفظ "توفی" ہے کہ اہل لغت نے اس میں وہ دھاندھلیاں کی ہیں جن کی انتہا نہیں کسی

نے "اماتہ" مردہ بنانا کے معنی لکھدئے "توفی" اس کے اتباع میں بعض کوتاہ نظر اہل تفسیر نے یا عیسیٰ انی متوفیک کے معنی لکھدیے (ممیتک) یعنی اے عیسیٰ میں تمھیں موت دینے والا ہوں۔ کسی نے کہا ممیتک حتف انفک" یعنی تمھیں ایسا کروں گا کہ اپنی موت مرو" کسی نے اس کے ساتھ اپنے عقیدۂ حیات مسیح کو سنبھالتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ" ممیتک فی وقتک بعد النزول من السماء" تمھیں موت دی جائے گی تمہارے وقت پر جب کہ تم آسمان سے اُتر چکو گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ اس لفظ کے" فلسفہ لغوی" پر نظر ڈالی نہ اُس کے" مبدأ اشتقاق" پر نہ "انقلاب تصریفی" پر نہ قرآن مجید کے محاورات پر نہ عرب کے استعمالات پر ورنہ ہرگز ہرگز وہ توفی کے معنی موت کے نہ قرار دیتے اور ہمارا دعوٰی ہے کہ کبھی ایک جگہ بھی قرآن یا غیر قرآن میں "توفی" بمعنی موت نہیں ہے وہ ایک عام مفہوم ہے جو کبھی بحیثیت مصداق موت پر منطبق ہوتا ہے کبھی نوم پر اور کبھی زمین سے آسمان پر زندہ اٹھا لیے جانے پر۔ توضیح اور تشریح کے لیے خود اسی آیت کی تفسیر کا انتظار کرنا چاہیے۔

(٢) مفردات الفاظ کے حل کر چکنے کے بعد اُن کے باہمی ارتباط و آویزش پر نظر ڈالی جائے یہ وہ چیز ہے جو علم نحو سے متعلق ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں بھی نحویوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے زیادہ ذاتی محاورات اور عربی کلام کے اسلوب سے انس اور واقفیت کو دخل حاصل ہے۔ علم نحو کی کتابیں اُس وقت کے لیے خوب ہیں جب کہ انسان عربی سے ناشناس ہو اور عربی زبان کو حاصل کرنا چاہ رہا ہو اس وقت کے لیے نحو کے بنیادی قواعد بے شک لیے ہیں۔ جن کو پیش نظر رکھ کر وہ آگے بڑھے اور تحصیل علم عربی میں مصروف رہے لیکن جب انسان کو ملکہ عبارت کے دیکھنے اور صحیح پڑھنے کا پیدا ہو گیا۔ اب اس کو نحو کی کتابوں اور نحویوں کی دور از کار باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے سیر و تتبع کلام فصحاء میں اُس کے سامنے نئے نئے اسلوب پیش کرتا جاتا ہے جو اُن حدود سے بالکل آگے ہے جن تک نحوی لوگ پہنچ سکے ہیں۔

یقین سمجھنا چاہیے کہ نحویین کی بہت سی باتیں بالکل ڈھکوسلے کی ہوتی ہیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ علامہ بلاغی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

مثلاً ایک عربی شاعر کا کلام ہے۔

جاءوا بمذق ھل رأیت الذئب قط۔

لائے وہ دودھ جس میں پانی ملا ہوا تھا کیا تم نے بھیڑیا کبھی دیکھا ہے؟

یہ ایک خاص انداز ہے کلام کا جس کا لطف زبان شناس افراد اٹھا سکتے ہیں۔

اب ہمارے نحوی اصحاب اس کی ترکیب کہنے بیٹھے۔ سچ یہ ہے "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" کی مثل اصل ہوگئی۔

الفیہ کے شارحین نیز دوسری نحوی کتابوں کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کلام کی تقدیریں ہے۔

"جاءوا بمذق مقول فيه هل رأيت الذئب قط"

"وہ لوگ پانی ملا ہوا دودھ لائے جس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس توجیہ سے شاعر کی روح پر کیا گذری۔

وہ بیچارہ دودھ کی رنگت کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ رنگ پیش نظر ہو جائے جو پانی کی کثرت سے دودھ میں نظر آرہا تھا۔ اُس نے یہ الفاظ ایک خاص مصوری کے انداز پر کہے تھے ذی علم محقق ارباب نحو نے اس کو یوں کہا کہ "دودھ ایسا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے"۔ یہ "کبھی بھیڑیا دیکھا ہے" اس کلمۂ مقدر: "مقول فیہ" جس کے بارے میں کہا جاتا ہے" کے ذریعہ سے دودھ کی صفت قرار دیا گیا۔ لیکن کیا اس طرح شاعر کا اصلی مقصود حاصل ہوتا ہے؟ کیا شاعر یہی کہنا چاہتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں آخر دودھ کے بارے میں اس کہے جانے کے کیا معنی کہ کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ هل رأيت الذئب قط۔

تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

بالکل مستقل استفہامی جملہ ہے جس کو سابق کلام سے ترکیبی حیثیت سے کوئی آویزش نہیں ہے وہ صرف ظاہر کرنے والا ہے دودھ کی ایک صفت کا جو شاعر نے مقدر رکھی ہے۔ مذکور نہیں ہے وہ یہ کہ لونه كلون الذئب وہ دودھ ایسا تھا کہ جس کا رنگ ہو بہو بھیڑیے کے رنگ کا سا تھا۔

اس کو دل میں رکھ کر اس نے کہا هل رأيت الذئب قط "تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟ یعنی اگر تم نے دیکھا ہو تو تم تصدیق کرو گے کہ بے شک دودھ اسی رنگ کا ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ معنی کہیں بھی نحویین کی ساختہ وپرداختہ ترکیب سے پیدا ہوتے ہیں؟

یہ علم نحو کے لال بجھکڑ قرآن مجید میں بھی ایسے ایسے تصرفات کیا کرتے ہیں اور اکثر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہے کیا؟ وہ اکثر جہاں ان کے خودساختہ قاعدے کسی لفظ کے سمجھنے کی طرف رہنمائی نہیں کرتے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ کلمہ زائدہ ہے جس کی بنیاد پر آج مسیحیین نے قرآن مجید کے خلاف یہ شور بلند کر دیا ہے کہ اس میں زائد یعنی بے فائدہ و بے معنی الفاظ کثرت سے موجود ہیں جو فصاحت و حکمت متکلم کے خلاف ہیں۔

لیکن یہ قصور کن کا ہے؟ ان بے سلیقہ نحویین کا جنھیں زیر زبر پیش کی بحثیں کرتے کرتے نیچی سطح پر اُڑنے اور ظاہری پہلوؤں پر پھسلتی ہوئی نظریں کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ کبھی معانی کی گہرائیوں میں داخل ہی نہیں ہوتے اور سمجھتے ہی نہیں کہ اس کی تہ میں کیا مضمر ہے۔

مثلاً قرآن مجید میں متعدد جگہ لا اقسم کی لفظ ہے۔

لا اقسم بمواقع النجوم۔ لا اقسم بهذا البلد۔ لا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون وغیرہ وغیرہ۔

ان آیات کی تفسیر میں جار اللہ زمخشری ایسا متبحر عالم نحو و لغت ایسا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے

پہلی آیت

لا اقسم بمواقع النجوم وانه لقسم لو تعلمون عظيم۔

"میں نہیں قسم کھاتا ستاروں کے غروب کرنے کے مقامات کی حالانکہ یہ قسم اگر تم جاننا چاہو تو بہت عظیم ہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ کلمۂ "لا" زائدہ ہے اور اصلی معنی یہ ہیں کہ "میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے غروب کرنے کے مقاموں کی"۔

دُوسری آیت

لا اقسم بيوم القيامة ولا اقسم بالنفس اللوامة۔

"میں نہیں قسم کھاتا روز قیامت کی اور نہیں قسم کھاتا انسان کے نفس عاقلہ کی جو معصیتوں پر ملامت کرتا ہے"۔

یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ

"لا نافیہ کا آنا فعل قسم پر کلام عرب میں بہت شائع و ذائع ہے۔

مثلاً امرأ القیس نے کہا ہے۔

لا وابيك ابنة العامری لا يدّعی القوم انی افر

"نہیں قسم تیرے باپ کی اے عامری لڑکی قوم والے نہیں دعویٰ کر سکتے کہ میں جنگ سے فرار کرتا ہوں۔

غویہ بن سلمہ نے کہا ہے۔ الا نادت امامة باحتمال لتحزننی فلا بك لا ابالی

"امامہ (شاعر کی معشوقہ) نے اعلان کیا ہے کہ وہ سفر کرے گی صرف اس لیے کہ مجھے رنج پہونچے تو نہیں قسم تمھاری میں پرواہ نہ کروں گا"۔

اس کلمۂ لا کا فائدہ قسم میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زائد ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ "لا" نفی ہی کے لیے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں اس شئے کی قسم نہیں کھاتا اس لیے کہ اُس کی عظمت ظاہر ہو اس کی دلیل ہے یہ آیت فلا اقسم بمواقع النجوم وانه لقسم لو تعلمون عظيم گویا حرف نفی کے داخل کرنے سے یہ مقصود ہے کہ میرا اس شئے کی عظمت ظاہر کرنا قسم کھا کر قسم نہ کھانے کے برابر ہے کیونکہ وہ شئے خود ہی عظیم ہے اور اس سے زیادہ کی مستحق ہے"۔

یہ حضرت زمخشری کا کلام عجیب و غریب حیثیت رکھتا ہے۔ کہاں فعل قسم یعنی اقسم پر لائے نفی کا داخل ہونا جیسا کہ قرآن کی محل بحث آیت میں تھا اور کہاں امراء القیس اور دوسرے شاعر کے کلام میں حرف نفی یعنی واو اور ب کے اوپر کلمۂ لا کا داخل ہونا جو شاہد میں پیش کیا گیا ہے۔

اس لا کو قسم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس جملہ کا جو اس کے بعد نفی کی صورت میں آنے والا ہے پیش خیمہ ہے یا ایک جزو ہے جو مخاطب کو متوجہ کرنے کے لیے آگے رکھ دیا گیا ہے۔

یہ اُردو میں اور ہر زبان میں اسی صورت سے مستعمل ہے " نہیں خدا کی قسم میں ہر گز وہاں نہیں جاؤں گا " یہاں شروع والا " نہیں " " خدا کی قسم " سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے بعد کے جملہ " وہاں نہیں جاؤں گا " ہی کی متعلقہ نفی ہے جسے کلام میں زور بڑھانے کے لیے شروع ہی سے کہہ دیا گیا ہے۔ اس کی نظیر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم " ۔ نہیں خدا کی قسم۔ یہ لوگ مومن نہیں سمجھے جا سکتے جب تک کہ تمہارے فیصلہ پر راضی نہ ہوا کریں ان جھگڑوں میں جو اُن کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔

اس کو کیا نسبت اُس کلمۂ لا سے جو خود فعل قسم پر داخل کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہو گئے ہیں کہ میں قسم نہیں کھاتا ہوں اور جس کے بعد کوئی منفی جملہ ہے بھی نہیں بلکہ اثباتی جملہ ہے۔

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ ارباب نحو لفظی جوڑ توڑ کی دھن میں معنی پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اور صرف اپنے فکر و نظر کو الفاظ کی ظاہری صورت پر محدود رکھتے ہیں۔

اب ملاحظہ ہو:۔

تیسری آیت

فلا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون میں نہیں قسم کھاتا ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی جو تم نہیں دیکھ سکتے "۔

اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

" یہ قسم ہے تمام اشیاء کی " کیونکر اور کس طرح ؟ کچھ پتہ نہیں۔

چوتھی آیت

سورۂ بلد میں ہے لا اقسم بهذا البلد " میں نہیں قسم کھاتا اس شہر کی " اس کے معنی یہ ہیں کہ " قسم کھاتا ہوں۔

چہ خوش ! یہ ہے عالم ان مفسرین کا جو علم نحو میں بال کی کھال کھینچنے کے مدعی ہوتے ہیں وہ کس طرح الفاظ کی بلاغت اور معانی کی لطافت کو بے دردی سے پامال کرتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

دوسرے مقامات ایسے بہت سے ہیں جہاں ان لوگوں نے " لا " کے کلمہ پر خط نسخ کھینچا ہے۔ اور اس کو معنی کے عالم سے نکال پھینکا ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

یا ایها الذین امنوا اتقوا الله وامنوا برسوله یوتکم کفلین من رحمته و یجعل لکم نورا تمشون به و یغفر لکم و الله غفور رحیم لئلا یعلم اهل الکتاب الا یقدرون علی شئ من فضل الله و ان الفضل بید الله یؤتیه من یشاء و الله ذو الفضل العظیم

اے اہل ایمان تقوی اختیار کرو اللہ سے اور اس کے رسول کا اقرار کرو تو وہ عطا کرے گا تمہیں دوہرا حصہ اپنی رحمت کا اور قرار دے گا تمہارے لیے ایک روشنی جس کی مدد سے راستہ طے کرو گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا خدا بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ تاکہ نہ سمجھیں اہل کتاب کہ وہ لوگ جو ایمان لائے) کچھ قدرت نہیں رکھتے اور فضل و احسان خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (پ ۲۷ سورہ حدید)

اس آیت میں یہ لوگ تصریح کرتے ہیں کہ لئلا یعلم اهل الکتاب کے فقرہ میں لا زیادہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ " تاکہ معلوم ہو اہل کتاب کو " ان لوگوں کی آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کو کہنا ہو کسی بات کے بارے میں کہ وہ اس طرح سے ہے مگر وہ اس میں نفی کا کلمہ بڑھا کر جملہ ایسا کہہ دے جس کے معنی یہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے

یہ صرف معنی میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگر غور سے کام لیتے تو معلوم ہوتا کہ لا زائدہ نہیں ہے وہ نفی کے معنی رکھتا ہے اور حقیقۃً متکلم کو وہی مقصود ہے۔

مطلب آیت کا گنجلک بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ اہل ایمان اگر تقویٰ اختیار کریں گے تو خدا کی خاص رحمتوں کے ساتھ مخصوص ہوں گے اور وہ ان کو نور عطا کرے گا اور اُن کی مغفرت کرے گا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلمین یہود و نصاریٰ جو اس وقت مسلمانوں کو ظاہری حیثیت سے بالکل بے بس اور بے اقتدار دیکھ رہے ہیں انھیں نتیجہ میں یہ علم نہ ہوگا اور یہ نہ دکھلائی دے گا کہ حقیقۃً یہ (اہل ایمان) بے بس ہیں اور ان کا کوئی اقتدار نہیں ہے اور نیز اس لیے کہ فضل و احسان تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اب دیکھا آپ نے کہ کلمۂ " نفی " رکن کلام ہے یا نہیں۔ اور بغیر اس کے معنی ناقص ہو جاتے ہیں یا نہیں۔

قدرت کو اہل کتاب کے سامنے مومنین کا بے بس اور بے اقتدار ہونا تھوڑی ظاہر کرنا منظور ہے بلکہ اُسے تو یہی مقصود ہے کہ وہ انھیں بے بس اور بے اقتدار نہ سمجھیں۔

ایسی نظیریں دوسری بھی بہت ہیں جہاں ان لوگوں نے حکم قضاء مبرم بعض کلمات کے زائدہ ہونے کا جاری کر دیا ہے حالانکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کلمات کو منظور نظر معنی کے پورے ہونے میں بہت بڑا دخل حاصل ہے۔

علامہ سید رضی طاب ثراہ نے اپنی تفسیر " حقائق التنزیل و دقائق التاویل " میں ایک مستقل تبصرہ قرآن مجید میں حروف و کلمات زائدہ کے موجود نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ اور اس اخیری دور کے یگانۂ روزگار متکلم آقا شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے کتاب الہدیٰ الی دین المصطفیٰ " اور اپنی کتاب تفسیر " آلاء الرحمن " میں اس پر بہت سیر حاصل بحث فرمائی ہے اور ہم ان الفاظ کے متعلق تفصیلی حیثیت سے تبصرہ خود ان آیات کے ذیل میں انشاء کریں گے جہاں اس قسم کے الفاظ وارد ہوں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کے آیات کی تفسیر میں ان نحوین اور ارباب عربیت کے بیانات پر پورا اعتماد کرنا ہمیشہ انسان کو ٹھوکریں کھلوائے گا اور غلطیوں میں مبتلا کرے گا۔

علم نحو کے مسائل کا استنباط تو خود شعرائے عرب کے اشعار سے زیادہ قرآن مجید کے آیات کے استعمال سے کیا گیا ہے۔ پھر ہم ان ساختہ تخیلات کو قرآنی الفاظ کا معیار کیوں کر بنا سکتے ہیں۔

بلکہ قرآنی الفاظ کے باہمی تعلق اور آویزش میں بہت زیادہ ضرورت خود ذاتی حیثیت سے قرآن میں تدبر کرنے کی ہے جس کے لیے محاورات عرب کے پیش نظر ہونے اور عربی دانی کے خاص ملکہ کی ضرورت ہے جس کے لیے انسان عربیت کے سمندر میں اس طرح پیر گیا ہو کہ وہ اس کے لیے کوئی اجنبی چیز باقی نہ رہی ہو۔

ایسے اشخاص بہت کم ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے آیات کی شرح صرف انہی کا حق ہو سکتا ہے اور کسی کا نہیں

(۳) مفردات کے حل اور الفاظ کے باہمی تعلق اور ارتباط کو بھی سلجھی ہوئی طبیعت سے سمجھنے کے بعد آیت کا لفظی ترجمہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ سمجھ میں ضرور ہی آجائے گا۔ اس ترجمہ کے بعد انسان کو غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت پڑے گی کہ ان میں سے کون الفاظ اور جملے ایسے ہیں جن کا تحت اللفظی ترجمہ واقعی مراد ہے اور کون ایسے ہیں کہ وہ بطور محاورہ کنایہ کے طور پر وارد ہوئے ہیں اس کے لیے نہ کتب لغویہ مدد دیں گے اور نہ نحو و صرف کے قواعد یہ زیادہ تر تتبع محاورات عرب کے علاوہ ذوق سلیم پر مبنی ہے۔

نیز ایسے قرائن پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی جو الفاظ کو اصلی معانی سے پھیر سکتے ہیں۔ ایسا قرینہ کبھی عقلی ہوتا ہے۔ اُس کے لیے عقلی سنجیدگی کی ضرورت ہے اور کبھی نقلی مثلاً ایک آیت کے مجاز کا قرینہ دُوسری آیت میں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ قرآن پر عبور اتنا ہو کہ کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت ذہن اُن تمام آیات کی طرف متوجہ ہو جن کے ساتھ اُس آیت کے مفہوم کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

اگر آیت کا تعلق احکام شرعیہ کے ساتھ ہو تو یہ دیکھ لینا ضروری ہوگا۔ کہ آیت کا عموم یا اطلاق احادیث کی بنا پر تخصیص اور تقیید کے ساتھ تبدیل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اس کے لیے احادیث ائمہ معصومینؑ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

لیکن احادیث میں سند کی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہوگی کیونکہ اگر حدیث بجائے خود معتبر نہ ہوئی تو وہ قرآن کی تخصیص و تقیید کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

آیات کے شان نزول میں مستند اور معتبر علماء و مورخین کے بیانات سے تمسک کرنا چاہیے۔

جو آیات واقعات اور قصص سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں اتنی مقدار سے زیادہ کہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے کچھ اور تشریح و تفصیل کرنا ہو تو معتبر حدیثوں سے تمسک کیا جا سکتا ہے۔

عام مفسرین کی کتابوں میں جو بہت سے قصص "اسرائیلیات" میں سے داخل ہو گئے ہیں اُن کا نقل کرنا بغیر رد کیے ہوئے درست نہیں ہے۔ وہ اسلام کے روایات سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ نو مسلم یہودیوں کو مسلمانوں میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ اُن کی روایتوں کو حدیث اور قرآن کا درجہ دیا جانے لگا اور اسلامی مفسرین کی کتابیں اُن سے لبریز ہو گئیں حالانکہ اُن سے اسلامی معتقدات کی صحت کو صدمہ پہنچا اور حقیقت واقعات مسخ ہو کر رہ گئی۔

آیات قرآن کے معانی کے سلسلہ میں کلبی۔ مداینی۔ مقاتل سدی وغیرہ کے کثیر التعداد اقوال نقل کرنے سے سوائے طبیعت کے پریشان ہونے کے کوئی نتیجہ نہیں۔

اس لیے کہ یہ مفسرین کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتے اور نہ اُن کے اقوال کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی کوئی وجہ ہے۔

ایک امر یہ ضروری ہے کہ اکثر آیات کے معانی میں مختلف جماعتوں کی طرف سے جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اور مخالفین اسلام کی جانب سے اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں اُن کا دفعیہ اور کلام الٰہی کی حقانیت کو توہمات کے گرد و غبار کو ہٹا کر صاف طریقہ سے نمایاں کیا جائے۔

جہاں ضرورت ہو نکات فصاحت و بلاغت اور خصوصی محاسن کلام پر روشنی ڈالی جائے اس حد تک کہ جہاں تک الفاظ رہنمائی کر سکتے ہیں۔

بے شک اس طرح کی تفسیر کا مکمل ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت کا انجام پانا قرار پائے گا اور اس کے لیے بہت بڑی ربانی توفیق کی ضرورت ہے۔

افسوس ہے کہ موجودہ جتنی تفسیر کی کتابیں ہیں اُن میں سے زیادہ مذکورۂ بالا خصوصیات سے عاری ہیں۔ اُن میں سے بعض جو مختصر ہیں وہ تو اپنے اختصار کی وجہ سے اُن تمام جہتوں کی جامع ہو ہی نہیں سکتیں اور جو طولانی ہیں اُن میں خارج از بحث باتوں سے طول دیا گیا ہے، مثلاً اقوال کی بھرمار کر دی۔ بمناسبت حدیثیں اور روایتیں جو مضمون آیت سے کوئی ضروری آویزش نہیں رکھتیں ذکر کرنا شروع کر دیں۔ نحویین کے اقوال کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا اور خواہ مخواہ کی طول طویل تقریروں سے آیت کے متعلقہ مضمون کو خطیبانہ رنگ میں بیان کر دیا۔

علامہ فخر الدین رازی کی اتنی بڑی تفسیر اور اس کے متعلق ارباب نقد و تبصرہ کو یہ رائے قائم کرنا پڑی کہ فیہ کل شئ الا التفسیر" اس کتاب میں سب کچھ ہے تفسیر ہی نہیں ہے"۔

شیعوں کے موجودہ مکمل تفاسیر میں مجمع البیان سب سے بہتر ہے لیکن اُس میں غیر معتبر مفسرین اور مخالفین مذہب کے اقوال کی اتنی بھرمار کر دی گئی ہے کہ حقیقت گم ہو گئی اور اس کے برخلاف احادیث آئمہ علیہم السلام نظر انداز ہو گئے وہ کتابیں کہ جنھوں نے آیات کی تفسیر میں احادیث ائمہ علیہم السلام کے تذکرہ کی پابندی کی جیسے علامہ سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان۔ ملا محسن فیض کی تفسیر صافی انھوں نے ایک تو احادیث میں نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ بس صرف احادیث کے نقل کرنے پر اکتفا کر دی اور آیت کے لفظی و معنوی دُوسرے پہلوؤں پر خود نظر نہیں ڈالی۔ اس کے علاوہ روایات میں تفسیر ظاہر و باطن کا فرق نہیں قرار دیا۔

اس طرح ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً اس طرح کی تفسیر اب تک تصنیف نہیں ہوئی ہے جو اُن خصوصیات و جہات کی جامع ہو جن کی ضرورت کا ہم نے "تفسیر قرآن" کی تصنیف کے لیے تذکرہ کیا ہے۔

بارھواں تبصرہ

علم تفسیر کی تدوین
اور
شیعوں کے خدمات

ہمارے اُس تبصرہ کو زیر نظر رکھتے ہوئے جو تحریف قرآن کے مسئلہ پر ہم نے قلمبند کیا ہے ہمارے اس قول کو کچھ تعجب کی نظر سے دیکھنا نہیں چاہیے کہ علم تفسیر کی اصلی بنیاد خود وحی آلہی سے قائم ہوئی ہے اور رسولؐ کی زبانی شل قرآن کے اس کی تبلیغ ہوئی۔

یعنی بہت سے آیات قرآن مجید کے ساتھ توضیحی تشریحات خود رسالتمآبؐ کی زبان پر جاری ہوئے اور وہ وحی آسمانی کی حیثیت سے منزل من اللہ تھے جن کو آئمہ اہلبیت کے احادیث میں تنزیل قرآن یعنی قرآن کے معنی تنزیلی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلی کتاب جو ان تنزیلی معانی پر مشتمل علم تفسیر میں تصنیف ہوئی وہ امیر المومنینؑ کا جمع کردہ قرآن تھا۔ جس کے بارے میں احتجاج طبرسی کی روایت میں حضرت امیرؑ نے فرمایا۔ ولقد جئتھم بالکتاب کملا مشتملا علی التنزیل والتاویل۔

"میں نے پیش کیا صحابہ کے سامنے مکمل قرآن جس میں تنزیل اور تاویل بھی موجود تھی" اسی کے متعلق محمدؐ بن سیرین کا قول تھا کہ لواصیب ذلك الکتاب کان فیه العلم۔

"اگر وہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو ایک بڑا علمی ذخیرہ دستیاب ہوتا (تاریخ الخلفاء ص۱۸۴)

علم تفسیر کی جامعیت کے متعلق حضرت کا یہ قول مشہور ہے کہ

لو شئت لا وقرت سبعین بعیرا من تفسیر فاتحة الکتاب۔

"اگر میں چاہوں تو ستر اونٹوں کا بار صرف سورہ حمد کی تفسیر سے بھردوں"

اس روایت کو محض شیعہ سُنی علماء نے نہیں بلکہ فرقۂ خوارج اباضیہ کے عالم شیخ جمیل سعدی اباضی نے بھی اپنی کتاب قاموس الشریعة ج ۳ (صفحہ ۲۷) میں تسلیم کیا ہے اور قرآن مجید کے جامعیت علوم ومعارف

اور وسعت معانی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وانظر الی ما روی عن علی بن ابیطالب انه قال لو شئت لا وقرت حمل سبعین بعیرا من تفسیر فاتحة الکتاب فهو بالقوة فی معرفته لا بالفعل اذ لا یساعده الوقت واذ صح کذالك وهو صحیح اذ لا یقول کذلك الا ومعه من تفسیرها ما یبلغ ذلك فلا بد وان یکون فی نفسه انه یوقر حمل سبعین بعیرا وانه یمکن ان یکون معانیها ما یبلغ اکثر من ذلك ایضا فاذا ساعده الوقت استطاع ان یوقر سبعین بعیرا اخری۔

دیکھو اُس حدیث کو جو علی ابن ابیطالب سے منقول ہے کہ اُنھوں نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو ستر اونٹ کا بار تفسیر سورۂ حمد سے بھردوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اُس کی معرفت اتنی حاصل ہے کہ لکھ سکتے ہیں نہ یہ کہ بالفعل اس کا لکھنا ممکن ہے کیونکہ وقت اور زمانہ اتنی گنجائش نہیں رکھتا اور جب کہ یہ مطلب درست ہوگیا اور حقیقۃً درست ہی ہے اس لیے کہ علی بن ابیطالب نے ایسا نہیں کہا جب تک کہ ان کی نظر میں سورۂ حمد میں اتنے ہی مطالب نہ تھے جو اس حد تک پہونچ جائیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بجائے خود سورۂ حمد میں اتنے مطالب موجود ہیں کہ ستر اونٹوں کا بار لکھا جاسکتا ہے اور ممکن ہے کہ اُس میں اس سے زیادہ مطالب ہوں کہ اگر وقت مساعدت کرتا تو آپ اس کے علاوہ اور ستر اونٹوں کا بار لکھ دیتے۔

آپ کے علاوہ صحابۂ کرام میں ایسے گنتی کے لوگ اور بھی تھے جنھیں قرآن مجید کے معانی ومطالب کے متعلق واقفیت حاصل تھی جیسے ابی بن کعب اور جابر بن عبداللہ انصاری جن کو ابو الخیر نے طبقات المفسرین کے طبقہ اولیٰ میں ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی امیر المومنین کے شیعۂ مخلصین میں سے تھے۔

لیکن افسوس ہے کہ اس گروہ کو اپنے معلومات پورے طور سے ظاہر کرنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ ہوائے حکومت علمی ترقیوں کے خلاف چل رہی تھی۔ مثل مشہور ہے "الناس اعداء لما جهلوا" کوئی شخص اگر تاویل وتفسیر کے متعلق ذرا گفتگو کرتا تو اُس کو سزا دی جاتی تھی۔

بے چارے ایک شخص کو جس کا نام صبیغ تھا صرف اس بات پر درّے لگائے گئے کہ وہ تاویل قرآن کے متعلق سوال کرتا تھا۔ غیظ وغضب اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ شہر بدر کیا گیا اور مسلمانوں کو تاکید ہوئی کہ اس کے ساتھ نشست وبرخاست نہ کی جائے اور کسی قسم کے تعلقات نہ رکھے جائیں۔

اس تسلط اور سخت گیری کے دور میں بھلا کسی کو علمی تحقیقات کا کیا شوق ہوتا اور تفسیر وتاویل قرآن کی کیا خدمت انجام پاسکتی تھی۔

بے شک امیر المومنین حضرت علیؑ کی ذات تھی جو خاموشی کے ساتھ علوم کا ذخیرہ مہیا کر رہی تھی۔ آپ نے

علاوہ اُس قرآن کے جو جمع فرمایا تھا اور جسے ہم نے بتایا کہ وہ حقیقۃً ایک مدوّن تفسیر کی حیثیت رکھتا مستقل طور سے اقسام علوم قرآن اور اُن کے امثلہ کو بسط و تشریح کے ساتھ ارشاد فرمایا جو قلمبند صورت سے ابتک موجود ہے۔ شیخ جلیل ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی کتاب جو "تفسیر نعمانی" کے ساتھ مشہور ہے وہی ایک متصل حدیث ہے جو امیرالمومنینؑ سے منقول ہے۔ اس میں حضرت نے آیات قرآن کی ساٹھ قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کی ایک مثال ذکر فرمائی اور آیات کی تفسیر کی ہے۔

سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ نے اس کتاب کا خلاصہ تحریر فرمایا جو شیخ حر عاملی تک پہونچا تھا اور انھوں نے وسائل الشیعہ میں احکام فقہیہ کے متعلق مضامین کو اُس سے اخذ کیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار کی اُس جلد میں جو قرآن مجید سے متعلق ہے ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ باب ما ورد عن امیرالمومنینؑ فی اصناف آیات القرآن وانواعھا وتفسیر بعض آیاتھا بروایۃ النعمانی وھی رسالۃ مفردۃ مدونۃ کثیرۃ الفوائد نذکرھا من فاتحتھا الی خاتمتھا۔

"اس باب میں ذکر ہوگا وہ جو امیرالمومنینؑ سے منقول ہوا ہے آیات قرآن کے اقسام اور بعض آیات کی تفسیر میں نعمانی کی روایت کی بناء پر اور یہ ایک مستقل تدوین شدہ رسالہ ہے جو بہت فوائد پر مشتمل ہے ہم اس کو شروع سے آخر تک پورا نقل کرتے ہیں۔"

اس کو مکمل طور سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ میری نظر سے ایک قدیم رسالہ گذرا ہے جس کی ابتدا یہ ہے۔

حدثنا جعفر بن محمد بن قولویہ القمیؒ قال حدثنی سعد الاشعری ابوالقاسم وھو مصنفہ الحمد للہ ذی النعماء والآلاء والمجد والعزّ والکبریاء وصلی اللہ علی محمد سید الانبیاء وعلی آلہ البررۃ الاتقیاء روی مشایخنا عن اصحابنا عن ابی عبد اللہؑ قال قال امیرالمؤمنینؑ انزل القرآن علی سبعۃ احرف کلّھا شاف کاف امر وزجر وترغیب وترھیب وجدل وقصص ومثل۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے راوی جعفر بن محمدؒ بن قولویہ ہیں اور انھوں نے اشعری سے نقل کیا ہے جو اس رسالہ کے اصلی مصنف ہیں انھوں نے مرسل طریقہ سے اپنے مشائخ حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اصحاب ائمہ کے واسطے سے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا قرآن سات قسم کی آیتوں پر نازل ہوا جن میں ہر ایک ہر طرح مکمل ہے امر اور نہی اور ترغیب اور تخویف اور جدل اور قصص اور امثال اس کے بعد حدیث کو آخر تک درج کیا ہے۔

لیکن یہ نعمانی کی روایت سے ترتیب میں مختلف ہے اور اس میں مختلف قسموں کو ابواب کی صورت میں منقسم کردیا گیا ہے اور درمیان درمیان بعض احادیث کا اور اضافہ کردیا گیا ہے اس طرح یہ متصل طور پر صرف امیرالمومنینؑ

کا کلام باقی نہیں رہا۔

فاضل نوریؒ مصنف مستدرک الوسائل کو اس کے سلسلۂ سند میں بھی یہ تردد پیدا ہوا ہے کہ سعد سے مراد بظاہر سعد بن عبداللہ اشعری قمی ہیں اور جعفر بن محمدؒ بن قولویہ ان سے بلا واسطہ روایت نہیں رکھتے ہیں۔ بے شک ان کے والد محمد بن قولویہ سعد بن عبداللہ کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ روایت میں درمیان سے (عن ابیہ) کا فقرہ سہواً چھوٹ گیا ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جعفر بن محمدؒ بن قولویہ اپنے والد سے اور وہ سعد بن عبداللہ سے روایت رکھتے ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم کی ابتدا میں جو آیات قرآن کے اقسام و انواع تحریر کیے ہیں انھیں بھی جہاں تک دیکھا جائے اسی حدیث امیرالمومنینؑ کا خلاصہ ہے جسے کاتب نعمانی اور سعد بن عبداللہ اشعری نے اپنے طریقہ سے تحریر کیا تھا۔

بہر حال سب سے پہلے علم تفسیر کے تدوین کی بنیاد امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قائم ہوئی ہے۔

آپ کے شاگردوں میں ترجمان القرآن امام المفسرین **عبداللہ بن عباس** تھے جن کی آپ نے مثل اولاد کے تربیت کی تھی اور اُن کو علوم و کمالات سے آراستہ کیا تھا۔

ابن عبدالبر نے کتاب الاستیعاب میں لکھا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے اُن کو دعا دی تھی کہ اللّٰھم علّمہ الحکمۃ وتاویل القرآن "خداوندا اس بچہ کو حکمت اور تاویل قرآن کا علم عطا فرما" اس کی برکت تھی اور امیرالمومنینؑ کے فیض تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ باوجود کمسنی کے اکابر صحابہ کے سامنے "ترجمان القرآن" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ ایسے جلیل القدر صحابی کا قول تھا کہ نعم ترجمان القرآن ابن عباس لو ادرک اسناننا ما عاشرہ منا رجل۔

"کیا کہنا ترجمان قرآن ابن عباس کا۔ اگر ہماری عمروں کو پہونچے ہوتے تو ان کے تبحر علمی کی وجہ سے کوئی ہم میں سے ان کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی قابل نہ ہوتا۔

شقیق ابووائل کا بیان ہے کہ ابن عباس نے حج کے موقع پر تقریر کی تو سورۂ نور سے بیان کی ابتدا کی اور برابر آیتیں پڑھ پڑھ کے اُن کی تفسیر کرتے رہے۔ میں اس وقت کہتا تھا۔ کہ میں نے آج تک کوئی ایسا متکلم نہ دیکھا اور نہ سنا اگر فارس اور روم اور ترک اقوام اس کو سن لیں تو سب اسلام قبول کر لیں[1]۔

حافظ ابونعیم اصفہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء سے ابن عباس کے ایک خاص شاگرد ابوصالح کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ میں نے ابن عباس کی علمی صحبت جس شان کی دیکھی ہے وہ ایسی ہے کہ اگر تمام قبیلۂ قریش اس پر فخر کریں تو بجا ہے۔

[1] مذکورہ واقعات کے لیے ملاحظہ ہو استیعاب بر حاشیہ اصابہ مطبوعہ مصر ج ۲ صفحہ ۳۵۰ - ۳۵۷۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگوں کا اژدہام اتنا ہوا کہ راستہ رک گیا۔ گلی میں کسی کا ایک طرف سے دوسری طرف جانا غیر ممکن ہوگیا۔ ابن عباس کو اطلاع ہوئی تو مجھ سے کہا کہ ذرا وضو کے لیے پانی رکھ دو۔

میں نے پانی رکھا ابن عباس نے وضو کیا اور بیٹھے۔ مجھ سے کہا جاؤ کہو کہ جو لوگ قرآن مجید کے قرأت الفاظ و حروف کے متعلق سوالات پیش کرنا چاہتے ہوں وہ گھر میں داخل ہوں میں باہر گیا اور میں نے اُن لوگوں کو اطلاع دی۔ یہ لوگ داخل ہوئے اور اس طرح کہ وہ کمرہ اور پورا گھر اُن سے بھر گیا انھوں نے کوئی سوال نہیں کیا مگر یہ کہ ابن عباس نے اس کا جواب دیا اور کچھ بڑھا کر بتلایا۔

اس کے بعد کہا کہ اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع دو۔ یہ لوگ باہر گئے۔ مجھ سے کہا کہ کہو جو لوگ تفسیر قرآن اور تاویل کے متعلق سوالات کرنا چاہتے ہوں وہ داخل ہوں۔ میں نے اُن لوگوں کو اطلاع دی وہ لوگ بھی داخل ہوئے انھوں نے بھی کوئی سوال نہیں کیا مگر یہ کہ ابن عباس نے اُن کے مقصود سے زیادہ اُس کے متعلق جواب دیا۔ پھر اُن لوگوں سے بھی کہا کہ اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع دو۔ وہ لوگ بھی باہر گئے۔

اس روایت کو تفصیل سے سید مرتضٰی زبیدی شارح قاموس نے اپنی کتاب "اتحاف السادۃ المتقین"[۱] میں جو غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کی شرح میں لکھی ہے درج کیا ہے۔

ابن عباس کے اقوال تفسیر قرآن میں عام طور سے کتب تفسیر میں درج ہیں اُن کی طرف منسوب ایک تفسیر "تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباس" بھی موجود ہے جو مصر میں متعدد بار طبع ہوئی ہے لیکن اس تفسیر کے متعلق ہرگز وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس کے مذکورہ مضامین ابن عباس کی طرف صحیح نسبت رکھتے ہیں۔

امیر المومنینؑ کے تلامذہ باختصاص میں میثم بن یحییٰ تمار بھی ایک بڑے واقف اسرار بزرگ تھے ان کے متعلق رجال کشی میں یہ روایت ہے، کہ انھوں نے ابن عباس سے کہا۔

سلنی ما شئت من تفسیر القرآن فانی قرأت تنزیلہ علی امیر المومنینؑ و علمنی تاویلہ فقال یا جاریۃ الدواۃ و القرطاس۔

"مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہو تفسیر قرآن کے متعلق دریافت کرو اس لیے کہ میں نے قرآن پورا امیر المومنینؑ سے حفظ کیا ہے اور حضرت ہی نے مجھ کو اُس کی تاویل کی تعلیم دی ہے۔ ابن عباس نے کنیز سے کہا کہ جا دوات اور کاغذ لے آ۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میثم تمار نے علوم قرآن کا استفادہ امیر المومنینؑ سے ابن عباس سے زیادہ کیا تھا جس کو عبداللہ بن عباس بھی تسلیم کرتے تھے۔

میثم صرف تشیع کے جرم کی بنا پر ۶۰ھ میں بحکم ابن زیاد کوفہ میں قتل ہوئے۔

---

[۱] جلد اول صفحہ ۱۰۱۔ ۱۰۲ مطبوعہ مصر۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ ابن عباس کے شاگردوں کا ہے۔ ان میں علم تفسیر کے بڑے عالم سعید بن جبیر بن ہشام اسدی تھے جن کے متعلق حافظ سیوطی نے اتقان میں قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اعلم التابعین فی التفسیر یعنی علم تفسیر میں تمام تابعین میں سب سے بڑے عالم تھے" ابن ندیم نے فہرست (مطبوعہ مصر ۵ھ) میں علم تفسیر کے مصنفات کے تذکرہ میں ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے اور ان کے قبل کسی مدون تفسیر کا پتہ نہیں دیا ہے۔

ابن جبیر اپنے تشیع کے جرم پر ۹۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے حکم سے قتل ہوئے۔

دوسرے **ابو صالح** میزان البصری یہ بھی ابن عباس کے مخصوص شاگرد تھے اور علم تفسیر کے عالم تھے علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ نے کتاب "الشیعۃ و فنون الاسلام" میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تابعین میں سے تھے اور شیعہ تھے۔ ان کے تشیع اور وثاقت کی تصریح شیخ مفید طاب ثراہ نے اپنی کتاب "الکافئۃ فی ابطال توبۃ الخاطئۃ" میں کی ہے۔ ابو صالح کا انتقال دوسری صدی کے ابتدائی دور میں ہوا۔

طاؤس بن کیسان ابو عبداللہ یمانی۔ علم تفسیر میں یہ بھی ابن عباس کے شاگرد تھے۔ اتقان میں ہے۔ کہ شیخ احمد بن تیمیہ نے ان کو "اعلم الناس بالتفسیر یعنی علم تفسیر کے سب سے بڑے علماء میں شمار کیا ہے طاؤس یمانی کا انتقال ۱۰۶ھ میں ہوا۔

اس طبقہ کے لوگ جنھیں ہم نے ابن عباس کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے اہل بیت میں سے امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں محسوب ہیں۔

تیسرا طبقہ امام محمد باقرؑ کے اصحاب کا ہے۔ اس زمانہ میں اہل بیت کے فیوض علمیہ ذرا آشکارا طور پر لوگوں کو پہونچ رہے تھے اور تقیہ کا پردہ ہلکا تھا۔ علم تفسیر کو بھی اس زمانہ میں کافی ترقی حاصل ہوئی۔

خود امام محمد باقرؑ نے ایک کتاب تفسیر میں تحریر فرمائی جس کا پتہ ابن ندیم نے فہرست میں دیا ہے اور علم تفسیر کے مصنفات کے تذکرہ میں لکھا ہے

کتاب الباقر محمد بن علی بن الحسین رواہ عنہ ابو الجارود زیاد بن المنذر رئیس الجارودیۃ الزیدیۃ۔

امام باقر بن علی بن حسین کی کتاب جسے اُن سے ابو الجارود زیاد بن منذر رئیس جارودیہ نے نقل کیا ہے۔

ابو الجارود آخر عمر میں بے شک زیدی المسلک ہو گئے تھے اور فرقہ امامیہ سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن اس زمانہ میں جب وہ اس جماعت سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے ابو بصیر یحییٰ بن قاسم اسدی اور بعض دیگر معتبر رواۃ شیعہ نے اس کتاب کی اُن سے روایت حاصل کر لی تھی۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب مثل بہت سے علمی جواہر ریزوں کے محفوظ نہیں رہی بے شک کتابوں میں امام محمد باقرؑ سے تفسیر قرآن کے متعلق جو بہت روایات مذکور ہیں وہ ممکن ہے کہ اسی کتاب سے ماخوذ ہوں آپ کے اصحاب میں سے جابر بن یزید جعفی تھے جنھوں نے علم تفسیر امام محمد باقرؑ سے حاصل کیا تھا۔ اُن کی کتاب

تفسیر کا تذکرہ نجاشی اور شیخ طوسی کی فہرستوں میں موجود ہے ۱۲۸ھ میں انتقال کیا۔

عطیہ عوفی ایک بزرگ ابن عباس کے شاگرد تھے۔ ان کی تفسیر پانچ جلدوں میں تھی۔

رُواسی محمد بن حسن بن ابی سارہ، ان کی کتاب معانی القرآن کا تذکرہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں موجود ہے۔

سب سے مشہور قدیم مفسر **سدّی** جن کا نام اسمٰعیل بن عبدالرحمن کوفی ابو محمد قرشی تھا سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے۔ امثل التفاسیر تفسیر اسمٰعیل السدّی روی عنہ الائمۃ مثل الثوری وشعبۃ

"بہترین تفسیر اسماعیل سدی کی تھی جس کی ثوری اور شعبہ ایسے آئمہ فن نے روایت کی ہے"۔

اُنھوں نے تین اماموں کے زمانہ کا ادراک کیا۔ امام زین العابدینؑ۔ امام محمد باقرؑ۔ امام جعفر صادقؑ اور زیادہ فیوض امام باقرؑ سے حاصل کیے یہ سدی کبیر کہلاتے ہیں اور یقیناً شیعہ تھے۔

لیکن ایک دُوسرے شخص سدی صغیر تھے جن کا نام محمدؐ بن مروان ہے۔ وہ فرقۂ شیعہ سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ اور علم تفسیر سے تعلق انھیں بھی ہے اس لیے اکثر اقوال سدّی کے جو کتب تفسیر میں درج ہیں اُن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ سدّی کبیر اسماعیل بن عبدالرحمن ہی کے ہیں۔ اسماعیل سدّی کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوی۔

ابان بن تغلب یہ بڑے جلیل المرتبت بزرگ تھے۔ انھوں نے بھی تینوں اماموں سے استفادہ کیا۔ حافظ سیوطی نے لغیۃ الوعاۃ فی طبقات النحاۃ (مطبوعہ مصر) ص۱۷۲ میں تصریح کی ہے۔

کان قاریا فقیھا لغویا اماميا ثقۃ عظیم المنزلۃ جلیل القدر روی عن علی بن الحسین وابی جعفر وابی عبد اللہ وصنف غریب القرآن وغیرہ۔

وہ حافظ قرآن فقیہ۔ لغوی۔ امامی المذہب ثقہ بڑے بزرگ مرتبہ آدمی تھے علی بن حسین (زین العابدین) اور ابوجعفر (باقر) اور ابوعبداللہ (صادقؑ) سے روایت کی۔ غریب القرآن (قرآن کے مشکل الفاظ کا حل) اور دوسری کتابیں تصنیف کیں۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ مصر ص۳۰۸) میں لکھا ہے۔

لہ من الکتب کتاب معانی القرآن لطیف" ان کے مصنفات میں سے ایک کتاب "معانی القرآن" عمدہ کتاب ہے ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

کلبی یہ مشہور مفسر ہیں ان کا پورا نام محمد بن سائب بن بشیر کلبی تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے رمی بالرّفض یعنی ان کے متعلق رافضی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ سمعانی نے لکھا ہے۔

محمد بن السائب صاحب التفسیر کان من اھل الکوفۃ قائلا بالرّجعۃ۔

ابن سائب صاحب تفسیر اہل کوفہ میں سے تھے اور رجعت کے قائل تھے۔

رجعت خاص فرقۂ شیعہ کا عقیدہ اور طرۂ امتیاز ہے۔

ان کی کتاب علم تفسیر میں بہت بسوط تھی۔ ابن عدی نے لکھا ہے ھو معروف بالتفسیر ولیس لاحد تفسیرا طول منہ ولا اشبع۔

"ان کی تفسیر مشہور ہے۔ کسی کی تفسیر اس سے زیادہ طولانی اور سیر حاصل نہیں تھی"۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ مصر ص۱۴۰) میں ان کی کتاب تفسیر قرآن کا ذکر کیا ہے۔

نیز یہ واقعہ درج کیا ہے کہ سلیمان بن علی (البصرہ کے ایک رئیس) نے محمد بن سائب کو کوفہ سے بصرہ بلوا کر اپنے گھر میں تفسیر قرآن کے درس کا سلسلہ جاری کرایا۔ ابن سائب تفسیر بیان کرتے تھے اور لوگ لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ سلسلۂ درس سورۂ برارت کی ایک آیت تک پہونچا جس کی تفسیر ابن سائب نے عام معتقدات کے خلاف بیان کی۔ لوگوں نے کہا، ہم تو یہ تفسیر نہیں لکھیں گے۔ محمد بن سائب نے کہا جب تک اس آیت کی تفسیر اُسی طرح جس طرح خداوند عالم نے نازل فرمایا ہے لکھی نہیں جائے گی اُس وقت تک میں ایک حرف آگے لکھواؤں گا نہیں۔

یہ قضیہ سلیمان بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلیمان نے کہا جو کچھ وہ کہتے ہیں اسی کو لکھو اور چھوڑدو ان باتوں کو جو اس کے مخالف ہیں۔

علامہ سید حسن صدر تحریر فرماتے ہیں کہ یہ امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے مخصوصین میں سے تھے۔ (الشیعۃ وفنون الاسلام ص۱۱) زمانہ کے لحاظ سے امام جعفر صادقؑ کے عصر سے پورے طور پر تعلق رکھتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ آخری دور میں برابر عراق میں قیام رہا ہو۔ اس لیے امام جعفر صادقؑ کی صحبت سے شرف یاب نہ ہوے ہوں۔ ۱۴۶ھ میں وفات پائی۔

ابو حمزہ ثمالی ثابت بن ابی صفیہ دینار ان کی کتاب علم تفسیر کا تذکرہ ابن ندیم نے فہرست (ص۵۰) میں ان الفاظ سے کیا ہے۔

کتاب تفسیر ابی حمزۃ الثمالی واسمہ ثابت بن دینار وکنیۃ دینار ابوصفیہ وکان ابو حمزۃ من اصحاب علی بن الحسینؑ من النجباء الثقات وصحب ابا جعفر۔

ابوحمزہ ثمالی کی کتاب تفسیر۔ ان کا نام ثابت بن دینار تھا۔ اور ان کے والد دینار کی کنیت ابوصفیہ تھی۔ ابوحمزہ علی بن حسین (امام زین العابدینؑ) کے اصحاب میں سے منتخب اور معتبر لوگوں میں سے تھے اور (امام) ابوجعفر (محمد باقرؑ) کی صحبت بھی حاصل کی تھی۔

شیخ طوسی نے امام زین العابدینؑ۔ امام محمد باقرؑ۔ امام جعفر صادقؑ۔ امام موسیٰ کاظمؑ چار اماموں کے اصحاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

یہ امام جعفر صادقؑ کے اصحاب ہیں جنھوں نے آپ کے قبل کے دور کو بھی پایا ہے۔ انھی میں سے **ابُوبصیر** یحییٰ بن قاسم اسدی تھے علامہ سید حسن صدر تحریر فرماتے ہیں کہ ان کی علم تفسیر میں ایک مشہور و معروف کتاب تھی جس کا

تذکرہ نجاشی نے فہرست مصنفین شیعہ میں کیا ہے۔ شیخ طوسی نے اُن کی بھی وفات سنہ ۱۵۰ھ میں بتلائی ہے۔

محمد بن علی بن ابی شعبہ حلبی ان کا بھی شیخ طوسیؒ نے اصحاب امام محمد باقرؑ میں ذکر کیا ہے اور جامع الرواۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے بھی روایت کی ہے۔ اُنھوں نے بھی ایک کتاب تفسیر میں لکھی۔

اب اُن اشخاص کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو امام جعفر صادقؑ کے اصحاب سے ہیں اور آپ کے قبل دوسرے اماموں کی صحبت کو پانا اُن کا ثابت نہیں ہے۔

منخل بن جمیل اسدی کوفی نجاشی نے لکھا ہے۔

روی عن ابی عبد اللہ له کتاب التفسیر

امام جعفر صادقؑ کے راوی ہیں اور کتاب التفسیر اُن کی تصنیف ہے۔

ابن غضائری کی تحریر کے موافق امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ تک رہے اور آپ سے بھی احادیث اخذ کیے۔

وہیب بن حفص ابو علی حریری مولی بنی اسد فہرست مصنفین شیعہ میں نجاشی نے لکھا ہے۔

روی عن ابی عبداللہ وابی الحسن۔ وصنف کتبا کتاب تفسیر القرآن و کتاب فی الشرایع مبوب۔

امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظم سے احادیث اخذ کیے اور متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کتاب تفسیر قرآن ہے۔

معلی بن محمد بصری یہ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں خود ان کی حضوری خدمت امامؑ میں ثابت نہیں ہے لیکن ان کے بھائی ابراہیم بن محمد بصری امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ معلی کی متعدد کتابیں تصنیف سے ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

کتاب الایمان، کتاب الدلائل، کتاب الکفر، کتاب شرح المودۃ فی الدین، کتاب التفسیر، کتاب الامامۃ، کتاب فضائل امیر المومنینؑ، کتاب قضایا امیر المومنینؑ، کتاب المروۃ، کتاب سیرۃ القائمؑ۔

ہشام بن سالم۔ فرقۂ شیعہ کے ممتاز متکلم اور مناظر تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کا امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے اور نجاشی نے اُن کے مصنفات میں کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے۔

حمزہ بن حبیب زیات کوفی قرار سبعہ میں سے امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے، اُنھوں نے کتاب متشابہ القرآن تصنیف کی جس کا ابن ندیم نے فہرست میں ذکر کیا ہے اور اس موضوع میں ان کے پہلے کوئی تصنیف نہیں ہوئی تھی۔

امام جعفر صادقؑ کے بعض اصحاب میں آپ کی وفات کے بعد ایک خاص وبا واقفی فرقہ کی پیدا ہوئی تھی یعنی بعض اشخاص نے آپ کے بعد دوسرے اماموں کو تسلیم نہیں کیا یہ لوگ مذہبی حیثیت سے کتنے ہی قابل مذمت سمجھے جائیں لیکن ہر حال ان کے علمی خدمات کو بالکل نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان میں سے **علی بن ابی حمزہ بطائنی** تھے جو امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ابو بصیر یحیٰی بن

قاسم اسدی کے مخصوص شاگرد تھے۔ چونکہ ابو بصیر نابینا تھے۔ یہ اُن کے قائد یعنی ہاتھ پکڑ کر راستہ چلانے والے تھے۔ نجاشی نے اُن کے مصنفات میں سے کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر حصہ اس کا ابو بصیر سے ماخوذ تھا۔

اسی طرح **حصین بن مخارق** ابو جنادہ سلولی یہ بھی واقفی تھے۔ شیخ طوسیؒ نے رجال میں اصحاب امام جعفر صادقؑ اور اصحاب امام موسیٰ کاظمؑ میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ ابن ندیم نے اُن کے متعلق لکھا ہے۔

کان من الشیعۃ المتقدمین وله من الکتب کتاب التفسیر۔

"یہ قدیم شیعوں میں سے تھے اور ان کے تصانیف سے کتاب تفسیر ہے۔"

عبد اللہ بن عبد الرحمن الاصم المسمعی البصری اصحاب امام جعفر صادقؑ سے، نجاشی نے اُن کے مصنفات میں کتاب الناسخ والمنسوخ کا شمار کیا ہے۔

جابر بن حیان صدر اسلام کے یگانۂ روزگار فلسفی اور ریاضی دان امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے ان کے کثیر التعداد تصانیف میں ایک کتاب تفسیر میں ہے سنہ ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے وہ اصحاب ہیں جنھوں نے حضرت صادقؑ کے زمانہ کو نہیں پایا۔

عیسیٰ بن داؤد النجار نجاشی نے لکھا ہے۔

کوفی من اصحابنا قلیل الروایۃ روی عن ابی الحسن موسیٰ له کتاب التفسیر۔

کوفہ کے رہنے والے ہمارے فرقہ امامیہ کے لوگوں میں سے تھے، کم حدیثوں کے راوی ہیں اُن کی کتاب تفسیر قرآن میں ہے۔

کسائی علی بن حمزہ:- ابن ندیم نے اُن کتابوں میں جو معانی قرآن کے متعلق لکھی گئی ہیں درج کیا ہے کتاب معانی القرآن للکسائی سنہ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

یونس بن عبد الرحمٰن امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ دونوں بزرگوں کی صحبت سے شرف یاب ہوئے۔ امام جعفر صادقؑ کو بھی دیکھا تھا مگر آپ سے استفادہ کا موقع حاصل نہیں ہوا۔

ابن ندیم نے فہرست (مطبوعہ مصر صفحہ ۳۰۹) میں اُن کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

علامۃ زمانه کثیر التصنیف والتالیف علی مذاهب الشیعۃ۔

اپنے زمانہ کے علامہ اور شیعی مذہب کے متعلق کثیر التعداد کتابوں کے مصنف تھے۔

نجاشی نے اُن کے تصانیف میں کتاب تفسیر القرآن کو بھی تحریر کیا ہے۔ سنہ ۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن خالد برقی یہ بھی امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے اور نجاشی نے اُن کی کتابوں میں کتاب التفسیر اور کتاب التنزیل والتعبیر کا ذکر کیا ہے۔

حسن بن محبوب ابو علی سراد شیخ طوسی نے امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ دونوں بزرگوں کے اصحاب میں شمار کیا ہے اور ابن ندیم نے فہرست صفحہ ۳۰۹ میں لکھا ہے۔

من اصحاب مولانا الرّضا و محمد ابنه و له من الکتب کتاب التفسیر۔

یہ امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کی تصنیف سے کتاب تفسیر تھی۔

ان کا انتقال ۲۲۴ھ میں ہوا۔

اسی سے متصل وہ طبقہ ہے کہ جو امام رضاؑ کے مخصوص عہد اور آپ کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے

حسن بن علی بن فضال جو امام رضاؑ کے مخصوصین میں سے تھے۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست صـ۳۱۲ میں لکھا ہے۔

کان من خاصة ابی الحسن الرّضاؑ وله من الکتب کتاب التفسیر۔

نجاشی نے اُن کے مصنفات میں سے کتاب الناسخ والمنسوخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے بھی ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔

دارم بن قبیصه تمیمی دارمی یہ بھی امام رضاؑ کے اصحاب میں تھے اور کتاب الناسخ والمنسوخ تصنیف کی۔

حقیقۃً یہ عصر شیعی معارف و علوم کی ترویج کا زرین دور ہے۔

اسی دور میں ابو عبد اللہ **محمد بن عمر واقدی** نے "کتاب الغیب فی علوم القرآن" لکھی اس کے متعلق علامہ سید حسن صدر کا خیال ہے کہ یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں علوم قرآن کو جمع کیا گیا، ابن ندیم نے لکھا ہے کان یتشیع حسن المذهب یلزم التقیة۔ یہ شیعہ تھے اور خوش عقیدہ شخص تھے مگر تقیہ کے پابند رہتے تھے[1] کتاب منتخب فی تاریخ آداب العرب (مطبوعہ مصر صـ۱۳۱) میں بھی ان کے تشیع کی تصریح کی ہے۔

۱۱ر ذی الحجہ ۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔

ہشام بن محمد بن سائب کلبی۔ ابن ندیم نے اُن کتابوں میں جو تفسیر قرآن میں تصنیف ہوئی ہیں لکھا ہے۔

کتاب تفسیر الآی التی نزلت فی اقوام باعیانهم لهشام الکلبی (یعنی) اُن آیات کی تفسیر جو خاص خاص جماعتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ہشام کلبی کی تصنیف (فہرست ابن ندیم صـ۳۴)۔

مشہور نحوی **فراء** ابو زکریا یحیٰی بن زیاد اقطع کوفی نے کتاب معانی القرآن تصنیف کی جو چار جلدوں میں تھی ابن ندیم نے فہرست صـ۹۹ میں لکھا ہے۔

قال ابو العباس ثعلب کان السبب فی املاء کتاب الفرّاء فی المعانی انّ عمر بن بکیر کان من اصحابه وکان منقطعا الی الحسن بن سهل فکتب الی الفراء ان

ابو العباس ثعلب کا بیان ہے کہ فرّاء کے کتاب معانی القرآن تصنیف کرنے کا یہ سبب تھا کہ عمر بن بکیر ان کے شاگرد تھے اور امیر حسن بن سہل کے مخصوصین میں سے تھے۔ اُنھوں نے فرّاء کو خط

[1] فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر صـ۱۴۴۔

الامیر الحسن بن سهل ربّما سألنی عن الشیٔ بعد الشیٔ من القرآن فلا یحضرنی فیه جواب فان رأیت ان تجمع لی اصولا او تجعل فی ذلك کتابًا ارجع الیه فعلت فقال الفراء لاصحابه اجتمعوا حتی املی علیکم کتابا فی القرآن و جعل لهم یوما فلما حضروا خرج الیهم وکان فی المسجد رجل یؤذن ویقرأ بالنّاس فی الصّلوة فالتفت الیه الفرّاء فقال له اقرء بفاتحة الکتاب نفسرها ثم نوفی الکتاب کلّه فقرأ الرّجل ویفسر الفراء فقال ابو العباس لم یعمل احد قبله مثله ولا احسب ان احدا یزید علیه۔

لکھا کہ امیر حسن بن سہل اکثر مجھ سے قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے معنی دریافت کیا کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا جواب میرے پیش نظر نہیں ہوتا اگر مناسب ہو تو آپ کچھ خاص اُصول میرے لیے قلمبند کر دیجیے یا ایک کتاب تصنیف کر دیجیے کہ میں اس کی طرف رجوع کروں۔ فراء نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ تم سب جمع ہو کہ میں ایک کتاب قرآن مجید کے متعلق تم کو لکھوا دوں۔ جب وہ لوگ جمع ہوے تو فراء باہر آے مسجد میں ایک شخص (حافظ قرآن) موذن تھا اور نماز پڑھاتا تھا فراء نے اس سے کہا کہ تم سورۂ حمد کے شروع سے برابر قرآن پڑھتے جاؤ اور ہم اس کی تفسیر کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ کتاب تمام ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تفسیر کی تصنیف فراء نے مکمل کی۔ ابو العباس ثعلب کا قول ہے کہ فراء کے قبل کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی اور مجھے نہیں امید کہ اس کے بعد کوئی شخص اس سے بہتر تحریر کر سکے۔

فراء نے ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔

امام رضاؑ کے اصحاب میں سے **حسن بن سعید** بن حماد کوفی اہوازی بھی تھے۔ جو امام محمد تقیؑ کے زمانہ تک رہے اور آپ سے روایت کی۔ اُن کے مصنفات میں سے نجاشی نے کتاب تفسیر القرآن کا بھی ذکر کیا ہے۔

ان کے چھوٹے بھائی **حسین بن سعید** بن حماد اہوازی بھی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ اور ان دونوں بزرگوں کے بعد امام علی نقیؑ کی خدمت میں بھی شرف یاب ہوے تھے اُن کے بھی مصنفات میں کتاب التفسیر کا نام موجود ہے۔

علی بن اسباط کوفی یہ بھی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں تھے اور نجاشی نے کتاب التفسیر کا ان کی ذکر کیا ہے۔

علی بن مہزیار الاہوازی بڑے جلیل المرتبہ کثیر الاحادیث بزرگ تھے امام رضاؑ امام محمد تقیؑ امام علی نقیؑ تینوں بزرگوں کی صحبت سے شرف یاب ہوے۔ چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ہے کتاب التفسیر اور کتاب حروف القرآن۔

عبد اللہ بن صلت ابو طالب قمی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے اصحاب میں سے تھے نجاشی نے کہا ہے

یعرف له کتاب التفسیر" ان کی معروف کتاب تفسیر قرآن ہے"۔

ابوالعباس مبرد محمد بن یزید ازدی ان کے تصانیف میں جو ابن ندیم نے ذکر کیے ہیں حسب ذیل کتابیں ہیں۔ کتاب معانی القرآن جو "الکتاب التام" کے نام سے مشہور تھی۔ کتاب اعراب القرآن۔ کتاب الحروف فی معانی القرآن۔ کتاب ما اتفقت الفاظہ واختلفت معانیہ فی القرآن ۲۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری قمی بزرگان علمائے شیعہ میں سے اور شہر قم کے مسلّم فقیہ تھے امام رضاؑ، امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ تینوں بزرگوں کے فیوض سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کے مصنفات میں سے کتاب الناسخ والمنسوخ ہے۔

اس کے بعد کا طبقہ وہ ہے جس نے امام محمد تقیؑ اور آپ کے بعد کے آئمہ سے روایت کی ہے اور امام رضاؑ تک نہیں پہونچے ہیں ان میں سے **احمد بن محمد بن خالد برقی** ہیں شیخ طوسی نے ان کا امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کے اصحاب میں ذکر کیا ہے یہ بڑے کثیر التصانیف تھے۔ نجاشی اور شیخ طوسی نے پوری ایک سو کتابیں ان کے تصانیف سے ذکر کی ہیں ان میں سے دو کتابیں علم تفسیر سے تعلق رکھتی ہیں کتاب الشواہد من کتاب اللہ عزوجل اور کتاب التاویل ۲۷۴ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اورمة ابوجعفر قمی امام علی نقیؑ کے زمانہ میں تھے اگرچہ روایت کسی امام سے حاصل نہیں ہے اور اسی لیے شیخ طوسیؒ نے باب من لم یروعنہمؑ (وہ اشخاص جنھیں کسی امام سے روایت حاصل نہیں ہے) میں درج کیا ہے ان کے مصنفات میں سے ہے کتاب تفسیر القرآن۔

اس کے بعد کے طبقہ میں **علی بن حسن بن علی بن فضال** ہیں۔

امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکری کے اصحاب میں سے تھے شیخ طوسی و نجاشی نے ان کے تصانیف کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی تعداد تیس تک پہونچتی ہے ان میں سے کتاب التفسیر بھی ہے۔

بس اب یہ اصحاب ائمہ علیہم السلام کا آخری دور ہے۔

حسن بن خالد برقی سابق الذکر محمد بن خالد کے بھائی اور احمد بن محمد بن خالد برقی کے چچا تھے ان کے متعلق ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں لکھا ہے کہ امام حسن عسکریؑ کے افادات سے ایک تفسیر قرآن مرتب کی جو ایک سو بیس حصوں پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب اب بالکل نشان نہیں رکھتی۔

بے شک ایک کتاب "تفسیر امام حسن عسکریؑ" کے نام سے موجود ہے جو مشہور و معروف اور مطبوع و شائع شدہ ہے لیکن تحقیق کی بنا پر یہ کہنا ناگزیر ہے کہ یہ کتاب حضرت کی طرف صحیح نسبت نہیں رکھتی اور ضعیف و غیر معتبر نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔

نجف اشرف کے یگانۂ روزگار محقق عالم آقا شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ نے ایک مستقل رسالہ اس کتاب کے

متعلق لکھا ہے جس میں اس کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

یہ رسالہ شائع نہیں ہوا لیکن ہم نے خود مصنف طاب ثراہ کے نوشتہ اصل مسودہ سے اس کتاب کو خود نقل کیا تھا جو بحمد اللہ موجود ہے۔

یہاں سے آئمہ علیہم السلام کے ظہور کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اصحاب آئمہ علیہم السلام کا سلسلہ بھی منقطع، اب علماء کا دور ہے جو آئمہ معصومین علیہم السلام کی صحبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوئے اور نہ ان سے روایت حاصل کی ہے۔ ان میں سے پہلے طبقہ میں جو تیسری صدی ہجری یعنی زمانۂ غیبت صغریٰ ہی سے تعلق رکھتا ہے حسب ذیل افراد ملتے ہیں۔

محمد بن ابوالقاسم بن عبید اللہ بن عمران الجنابی البرقی ابو عبد اللہ ماجیلویہ ان کا زمانہ آئمہ علیہم السلام کے زمانہ کا آخری دور سمجھا جا سکتا ہے لیکن کسی امام کی خدمت میں شرف یاب ہونا ثابت نہیں ہے۔ احمد بن محمد بن خالد برقی کے داماد تھے اور انہی سے تمام احادیث حاصل کیے ان کے متعدد تصانیف تھے جن میں سے کتاب تفسیر ہے۔

سعد بن عبد اللہ بن ابی خلف اشعری قمی انھوں نے امام حسن عسکریؑ کے زمانہ کا ادراک کیا مگر حضرت سے روایت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ نجاشی نے ان کے مصنفات میں کتاب ناسخ القرآن و منسوخہ و محکمہ و متشابہہ کا ذکر کیا ہے۔ سعد نے ۳۰۱ھ میں انتقال کیا۔

احمد بن صبیح ابو عبد اللہ اسدی کوفی شیعہ اثنا عشری تھے۔ زیدی شیعہ ان کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن درست نہیں ہے نجاشی نے لکھا ہے له کتب منها التفسیر وکتاب النوادر ان کے مصنفات میں سے ایک کتاب تفسیر ہے اور دوسرے کتاب نوادر، شیخ طوسی نے فہرست میں اور ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی کثیر التصانیف شخص تھے۔ شیخ طوسی اور نجاشی نے پچاس سے زیادہ مصنفات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب تفسیر ہے ۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔

سلمة بن الخطاب براوستانی ازدورقانی ان کا بھی تذکرہ شیخ طوسیؒ نے ان لوگوں میں کیا ہے جنھیں آئمہ علیہم السلام سے روایت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ صفار۔ سعد بن عبد اللہ اشعری، احمد بن ادریس وغیرہ ان سے نقل احادیث کرتے ہیں انھوں نے مستقل سورہ یٰس کی ایک تفسیر لکھی تھی جس کا تذکرہ نجاشی نے ان کے فہرست مصنفات میں کیا ہے

عیاشی محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمی سمرقندی مشہور و معروف مفسر قرآن ہیں ان کی کتاب تفسیر کے حوالے برابر تفسیر عیاشی کے نام سے تمام کتب تفاسیر میں موجود ہیں۔ ابن ندیم نے فہرست میں ایک سو ساٹھ کتب ان کے تصنیف سے ذکر کیے ہیں اور شیخ طوسیؒ کا بیان ہے کہ ان کے مصنفات دو سو سے زائد تھے۔ علاوہ کتاب التفسیر کے ان کے مصنفات میں ایک کتاب التنزیل بھی ہے وہ بھی غالباً معانی قرآن سے متعلق ہے۔

علی بن ابراہیم قمی ان کی کتاب تفسیر بھی بہت مشہور ہے اور اب تک موجود ہے۔ نجاشی نے اُن کے مصنفات میں علاوہ کتاب التفسیر کے کتاب الناسخ والمنسوخ بھی ذکر کی ہے۔ ان کے وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ بے شک یہ معلوم ہے کہ سنہ ۳۰۷ھ تک زندہ تھے اور اس کے بعد انتقال ہوا ہے محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ علی بن بابویہؒ یہ دونوں بزرگ جن کا انتقال سنہ ۳۲۹ھ میں ہوا ہے ان کے شاگرد تھے اور اُن سے احادیث اخذ کیے تھے۔

فرات بن ابراہیم کوفی یہ بھی بالکل اُسی زمانہ میں تھے۔ شیخ علی بن بابویہ نے اُن سے بھی احادیث اخذ کیے تھے۔ اُن کی تفسیر زیادہ تر اُن احادیث کے مضامین پر مشتمل ہے جو آئمہ معصومین کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے کہ تفسیر فرات بن ابراہیم کے مصنف کے متعلق اگرچہ علماء نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا ہے لیکن اس کے احادیث کا اُن اخبار کے مطابق ہونا جو ہمیں دوسرے ذرائع سے آئمہ معصومین کی جانب سے پہونچے ہیں اس کے مصنف کے وثاقت و اعتبار کا شاہد ہے۔

محمد بن علی شلمغانی یہ شخص آخر عمر میں اگرچہ غالی ہوگیا تھا اور حسین بن روح وکیل ناحیہ مقدسہ سے حسد و عداوت میں گرفتار ہلاکت ہوا لیکن اس کے قبل اپنی زندگی بھر ممتاز علمائے شیعہ میں محسوب رہا۔ اس کے مصنفات میں ایک کتاب نظم القرآن ہے جس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ قرآن مجید کے معنوی تسلسل سے متعلق ہے جو علم تفسیر ہی کا ایک شعبہ ہے۔

ابن حجام محمد بن عباس بن علی بن مروان بن ماہیار ابو عبداللہ بزاز، ان کے مصنفات میں شیخ طوسی نے لکھا ہے۔ کتاب تاویل ما نزل فی النبیؐ، کتاب تاویل ما نزل فی شیعتہم۔ کتاب تاویل ما نزل فی اعدائہم، کتاب تفسیر الکبیر کتاب الناسخ والمنسوخ، ان کے انتقال کی بھی صحیح تاریخ معلوم نہیں بے شک سنہ ۳۲۸ھ تک زندہ تھے اور تلعکبری نے اسی سنہ میں ان سے روایت حاصل کی تھی۔

علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی مشہور شیخ صدوق محمد بن بابویہ کے والد بزرگوار بڑے عالی مرتبت اور جلیل القدر عالم تھے۔ فہرست شیخ طوسیؒ و رجال نجاشی میں ان کے مصنفات کے ذیل میں کتاب التفسیر موجود ہے ان کا انتقال سنہ ۳۲۹ھ میں ہوا کہ جس میں محمد بن یعقوب کلینی نے بھی انتقال کیا تھا جس سے غیر معمولی طور پر آسمانی ستارے کثرت سے ٹوٹے تھے اور اس لیے یہ سنہ سنۃ تناثر النجوم کے نام سے مشہور ہوگیا۔

آخر الذکر افراد کی وفات اگرچہ چوتھی صدی میں ہوی ہے لیکن ان کا زیادہ تر زمانہ تیسری صدی میں گذرا ہے نیز اُن کا دورِ حیات پورا غیبت صغریٰ سے متعلق ہے جن میں امامؑ اگرچہ نظروں کے سامنے موجود نہ تھے۔ لیکن اُن کے خصوصی نائبین موجود تھے بے شک اسی سنہ ۳۲۹ھ میں علی بن محمد سمری کے انتقال پر زمانہ غیبت کبریٰ کا شروع ہو گیا اور اب وہ طبقہ ہے جنھوں نے تیس۳۰ برس سے زیادہ چوتھی صدی میں گذارے اور غیبت کبریٰ کے دور تک باقی رہے اگرچہ اُن کا ابتدائی حصہ یقیناً غیبت صغریٰ سے متعلق ہے۔

عبدالعزیز بن یحییٰ بن احمد بن عیسیٰ الجلودی بہت بڑے کثیر التصانیف شخص تھے نجاشی نے ان کے

ایک سو نوے۱۹۰ تصانیف ذکر کیے ہیں ان میں سے تفسیر قرآن کے متعلق حسب ذیل کتابیں تھیں۔ کتاب التفسیر عن علی۔ کتاب التنزیل عن ابن عباس۔ کتاب التفسیر عن ابن عباس۔ کتاب الناسخ والمنسوخ عن ابن عباس ابن ندیم نے ان کی وفات کو سنہ ۳۳۰ھ کے بعد بتلایا ہے۔

حافظ ابن عقدہ ابو العباس احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی مذہبی حیثیت سے زیدی شیعہ تھے لیکن اثنا عشری طبقہ کے علماء کے ساتھ بالکل وابستہ تھے یہاں تک کہ کتابوں میں اکثر امامی اثنا عشری نقطۂ نظر کے احادیث درج کیے۔ نجاشی نے لکھا ہے کہ میں نے ان کی کتاب تفسیر القرآن کا مشاہدہ کیا جو بہت عمدہ کتاب ہے۔ حافظ موصوف نے کوفہ میں سنہ ۳۳۳ھ میں انتقال کیا۔

ابوبکر صولی محمد بن یحییٰ اُن کے مصنفات میں جیسا کہ ابن ندیم نے ذکر کیا ہے کتاب الشامل فی علم القرآن ہے جو تکمیل نہیں ہوسکی اُن کی وفات سنہ ۳۳۵ھ میں ہے۔

محمد بن حسن بن الولید القمی شیخ صدوقؒ کے استاد تھے۔ فہرست شیخ طوسی میں اُن کے مصنفات سے کتاب الجامع اور کتاب التفسیر کا ذکر کیا ہے۔ نجاشی نے بھی لکھا ہے له کتب منها کتاب تفسیر القرآن " اُن کی بہت سی کتابیں تھیں جن میں سے ایک کتاب تفسیر قرآن ہے موصوف نے سنہ ۳۴۳ھ میں انتقال کیا۔

عباد بن عباس یہ مشہور یگانۂ روزگار ادیب صاحب ابن عباد کے والد تھے۔ ابن ندیم نے اُن کے فرزند صاحب ابن عباد کے حالات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اہل علم و فضل سے تھے اور اُنھوں نے ایک کتاب احکام القرآن میں لکھی ہے جس میں معتزلہ کے مسلک کی حمایت کی ہے۔

علامہ سید محسن عاملی نے اعیان الشیعہ میں لکھا ہے کہ ابن ندیم کا یہ فقرہ اس لحاظ سے ہے۔ کہ اصول دین میں شیعی عقائد اکثر معتزلہ کے عقائد سے متفق ہوتے ہیں اسی بنا پر بعض لوگوں نے صاحب ابن عباد اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تک کو معتزلی مذہب کا لکھ دیا ہے حالانکہ یہ سب لوگ شیعہ تھے۔

احمد بن محمد بن حسین بن حسن بن دول قمی ان کے تصانیف کی تعداد نجاشی کے قول کے مطابق ایک سو۱۰۰ تک پہونچی تھی۔ ان میں سے ایک کتاب تفسیر ہے سنہ ۳۵۰ھ میں وفات پائی۔

علی بن احمد ابو القاسم کوفی علمائے امامیہ میں سے تھے۔ بے شک آخر عمر میں بعض غالیانہ اقوال کی وجہ سے غیر معتبر ہوگئے۔ ان کے مصنفات میں سے ایک کتاب تفسیر تھی جو تکمیل نہیں ہوی سنہ ۳۵۲ھ میں انتقال ہوا۔

محمد بن احمد بن ابراہیم بن سلیمان صابوقی اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے اور مصر میں قیام رکھتے تھے۔ ان کے مصنفات میں سے ہے کتاب تفسیر معانی القرآن وتسمیۃ اصناف کلامہ" بحر العلوم طاب ثراہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اُنھوں نے غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ دونوں زمانوں کو پایا ہے۔ تاریخ وفات پورے طور سے معلوم نہیں کتاب "الشیعہ و فنون الاسلام" اور کتاب "اعیان الشیعہ" میں اُن کی وفات سنہ ۱۳۰ھ میں لکھی ہے مگر اس صورت میں اُن کا غیبت کبریٰ کے زمانہ کو پانا صحیح نہ ہوگا۔

محمد بن احمد بن محمد بن حارث ابوالحسن حارثی تقریباً اسی زمانہ میں تھے ان کے مصنفات سے ہے کتاب نوادر علم القرآن جس کا نجاشی نے تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد کا طبقہ وہ ہے جو بالکل غیبت کبریٰ کے دور سے متعلق ہے لیکن اسی چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ختم ہو گیا ہے۔

ان میں سب سے نمایاں ہستی **شیخ صدوق** محمد بن علی بن بابویہ قمی کی ہے ان کی ولادت غیبت صغریٰ میں حسین بن روح کے واسطہ سے حضرت حجت عجل اللہ فرجہٗ کی دُعا کی برکت اور بشارت کی بنا پر ہوئی تھی لیکن وہ بہت کمسن تھے جب زمانہ غیبت صغریٰ منقضی ہو گیا اور غیبت کبریٰ کا دور آ گیا۔ شیخ صدوق دنیائے تشیع کے اُن بے نظیر افراد میں سے ہیں جن کے کارنامے حیات جاوید رکھتے ہیں اُن کے مصنفات کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی۔ اُنھوں نے تفسیر قرآن کے موضوع کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ حسب ذیل کتابیں اس شعبہ میں تصنیف کیں کتاب جامع تفسیر المنزل فی الحج۔ کتاب تفسیر القرآن۔ کتاب مختصر تفسیر القرآن۔ سنہ ۳۸۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن علی بن عبدک ابوجعفر جرجانی ان کے متعلق نجاشی نے لکھا ہے جلیل القدر من اصحابنا فقیہ متکلم لہ کتب منہا کتاب التفسیر "ہمارے فرقہ کے جلیل القدر علماء میں سے فقیہ اور متکلم تھے اُن کے مصنفات سے کتاب تفسیر ہے۔

ابو منصور صرام نیشاپوری یہ بھی اسی طبقہ میں تھے۔ نجاشی نے لکھا ہے لہ کتاب تفسیر القرآن کبیر حسن " اُن کے مصنفات سے تفسیر قرآن بڑی اور عمدہ کتاب ہے۔

موسیٰ بن اسماعیل اُنھوں نے ایک کتاب تفسیر قرآن میں لکھی۔ فہرست شیخ طوسی میں اس کا نام "جامع التفسیر" اور رجال نجاشی میں "جوامع التفسیر" ہے۔

نعمانی محمد بن ابراہیم بن جعفر ابوعبداللہ کاتب معروف با بن ابی زینب ان کی کتاب "غیبت" مشہور ہے اور تفسیر قرآن میں امیرالمومنین کی طویل حدیث انواع علوم قرآن کے متعلق جس کا تذکرہ اس کے قبل آ چکا ہے انہی کی جمع کردہ ہے جو "تفسیر نعمانی" کے نام سے مشہور ہے۔

عبدالرحمان بن حسن قاشانی ابومحمد ضریر، نجاشی نے اُن کے نام کے ساتھ "مفسر" کی لفظ بھی لکھی ہے اور اُن کے حافظہ کی تعریف کی ہے۔

حسن بن موسیٰ نوبختی متکلم فلسفی بڑے جامع علوم و فنون شخص تھے۔ اُنھوں نے علم تفسیر میں کتاب "متشابہ القرآن" تصنیف کی جو آیات متشابہات کی تاویل میں ہے۔

اس کے بعد کا طبقہ شیخ صدوق کے تلامذہ کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ہوئے ہیں اور پانچویں صدی کی ابتدا تک رہے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں **شیخ مفید** محمد بن محمد بن نعمان معروف با بن المعلم البغدادی دنیائے تشیع کے سرآمد روزگار فقیہ و متکلم ہیں۔ اُنھوں نے مستقل طور سے کوئی تفسیر تو نہیں تحریر فرمائی لیکن ان کے مصنفات میں حسب ذیل کتابیں علم تفسیر سے متعلق ہیں۔ کتاب البیان فی تالیف القرآن۔ کتاب فی تاویل قولہ فاسئلوا اھل الذکر کتاب الرد علی الجبائی فی التفسیر۔ کتاب الکلام فی دلائل القرآن۔ کتاب البیان عن غلط قطرب فی القرآن۔ شیخ مفیدؒ نے سنہ ۴۱۳ھ میں رحلت فرمائی۔

حسین بن علی بن الحسین بن محمد بن یوسف وزیر ابوالقاسم مغربی سابق الذکر محمد بن ابراہیم بن جعفر کاتب نعمانی کے نواسے تھے۔ نجاشیؒ نے انھیں اپنا استاد کہا ہے اور اُن کے مصنفات سے کتاب خصائص علم القرآن کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۵ ماہ رمضان سنہ ۴۱۸ھ میں انتقال کیا۔

سید رضی محمد بن الحسین الموسوی مشہور کتاب نہج البلاغہ کے جامع، شیخ مفیدؒ کے شاگرد تھے مگر کم عمر میں اپنے استاد کی زندگی ہی میں انتقال کیا ان کی کتاب تفسیر "حقائق التنزیل و دقائق التاویل" وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جس کا سرا قدرت نے اسی سر کے لیے مخصوص کیا تھا۔ علامۃ الدہر آقا سید حسن صدر طاب ثراہ "الشیعہ و فنون الاسلام" میں تحریر فرماتے ہیں۔

کشف فیہ عن غرائب القرآن وعجائبہ وخفایاہ وغوامضہ وابان غوامض اسرارہ ودقائق اخبارہ وتکلم فی تحقیق حقایقہ وتدقیق تاویلہ بما لم یسبقہ احد الیہ ولا حام طائر فکر احد علیہ۔

اس تفسیر میں قرآن مجید کے عجیب رموز و اسرار اور مخفی نکات اور باریک باتوں کا انکشاف کیا گیا اور حقائق و دقائق تفسیر و تاویل میں اس طرح بحث و تحقیق سے کام لیا گیا ہے جس کی نظیر اس کے قبل ناپید تھی اور نہ کسی کا طائر فکر اس تک پہونچا تھا۔

اس تفسیر کا ایک حصہ قلمی صورت میں مشہد مقدس کے کتب خانۂ رضویہ میں موجود ہے جو بہت قدیم نسخہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے جس پر خود مصنف کے ہاتھ کی تحریر موجود تھی اس حصہ کی ابتدا سورۂ آل عمران کے شروع سے اور انتہا سورۂ نساء پر ہے اور اس پر تحریر ہے کہ یہ اس تفسیر کا پانچواں حصہ ہے۔ اس نسخہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تفسیر کی تصنیف سنہ ۴۰۲ھ میں ہوئی ہے جس کے چار ہی برس بعد علامہ سید رضی طاب ثراہ کا انتقال ہوا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے کمال شباب علمی کی تصنیف ہے۔ اس نسخہ کے ختم کتابت کی تاریخ ۲۱ رجب سنہ ۵۳۳ھ ہے جو تصنیف سے صرف ایک سو اکتیس برس بعد ہے اور جس کو اب تک آٹھ سو ستائیس برس کی مدت گذری ہے۔ اب اس تفسیر کا موجودہ حصہ نجف اشرف میں طبع بھی ہو گیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ مسلسل تفسیر نہیں ہے بلکہ متفرق آیات کی مختلف مقامات سے تفسیر لکھی گئی ہے۔

موصوف نے اس تفسیر کے علاوہ بھی اس شعبہ سے متعلق کتاب متشابہ القرآن اور مجازات القرآن

تصنیف فرمائی۔

علامہ سید رضی کی ولادت سنہ ۳۵۹ھ میں اور وفات ۴۷ برس کی عمر میں روز یکشنبہ سنہ ۴۰۶ھ میں ہوئی۔

محمد بن احمد وزیر عمیدی ۔ ان کے مصنفات سے ہے کتاب متشابہ القرآن اور کتاب انتزاعات القرآن۔ سنہ ۴۲۳ھ میں وفات پائی۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰ علی بن الحسین الموسوی طاب ثراہ علامہ سید رضی کے بڑے بھائی اور شیخ مفید کے شاگرد آسمان تشیع کے آفتاب درخشاں تھے۔ آپ کے مصنفات جمیع علوم وفنون میں بکثرت ہیں جن میں سے علم تفسیر کے متعلق حسب ذیل کتابیں ہیں۔

تفسیر سورۂ حمد۔ تفسیر سورۂ بقرہ جو مکمل نہیں ہوئی۔ تفسیر آیۂ مبارکہ قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم۔ الکلام علی من تعلق بقولہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر تفسیر آیہ شریفہ لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا۔ رسالہ محکم ومتشابہ جو تقریباً پورا تفسیر نعمانی سے ماخوذ ہے۔ سنہ ۴۳۶ھ میں رحلت فرمائی۔

اب وہ طبقہ ہے جو بالکل پانچویں صدی سے متعلق سمجھا جاسکتا ہے اُس میں علم تفسیر کے سب سے بڑے مصنف **شیخ الطائفہ** محمد بن الحسن الطوسیؒ تھے جو شیخ مفید علیہ الرحمہ کے شاگرد اور اس حیثیت سے سید مرتضیٰ رحمۃ اللہ کے ہمرتبہ تھے مگر خود سید مرتضیٰ رحمۃ اللہ کے حلقہ درس میں بھی شریک ہوئے تھے اس لیے شاگرد تھے۔ آپ کی تفسیر التبیان فی علوم القرآن وہ عظیم الشان تفسیر ہے جو دنیائے علم میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ طبرسیؒ کی کتاب مجمع البیان زیادہ تر اس سے ماخوذ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ کتاب اب شائع ہوچکی ہے۔ اس مستقل تفسیر کے علاوہ "مسائل رجبیہ در تفسیر بعض آیات قرآن" مسائل دمشقیہ جس میں ۱۲ مسئلے تفسیر قرآن کے متعلق حل کیے گئے ہیں۔ شیخ الطائفہ کی ولادت ماہ رمضان سنہ ۳۸۵ھ میں اور وفات سنہ ۴۶۰ھ میں ہوئی۔

علامہ کراجکی ابوالفتح محمد بن علی بن عثمان بن علی یہ بھی شیخ مفیدؒ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے اکابر تلامذہ میں سے تھے آپ کے مصنفات میں سے تفسیر میں کتاب الراشد المنتخب من غرر الفوائد ہے جو بعض آیات قرآن کی تفسیر پر مشتمل تھی اس کتاب کا حجم دو سو ورق کا تھا۔ اس کے علاوہ کتاب کنز الفوائد میں جو پانچ حصوں کے اندر متعدد علوم وفنون پر مشتمل ہے ایک شعبہ مستقل تفسیر کا ہے جس میں کثیر التعداد آیات قرآن کی شرح کی گئی ہے۔ آپ کی وفات سنہ ۴۴۹ھ میں ہوئی۔

اسماعیل بن علی بن حسین سمان انھوں نے مکمل طور سے ایک تفسیر دس جلدوں میں لکھی جس کا نام ہے "البستان فی تفسیر القرآن" شیخ منتجب الدین نے کتاب الفہرست میں اس کا تذکرہ کیا ہے

شیخ محمد بن احمد بن علی فتال نیشاپوری ان کا بھی ذکر منتجب الدین نے کتاب الفہرست میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ صاحب التفسیر ثقہ وای ثقہ" تفسیر قرآن کے مصنف اور بہت بڑے مستند شخص ہیں۔

شیخ ابوعبداللہ محمد بن ہارون الکال ان کے حالات بالکل معلوم نہیں اُنھوں نے شیخ الطائفہ کی تفسیر تبیان کا خلاصہ لکھا اور ایک کتاب "متشابہ القرآن" تصنیف کی۔

سید ضیاء الدین ابوالرضا فضل اللہ بن علی حسنی راوندی۔ شیخ ابوعلی ابن شیخ الطائفہ کے شاگرد اور منتجب الدین مصنف فہرست کے استاد تھے ان کی علم تفسیر میں "کافی" ایک کتاب تھی جس کے متعلق منتجب الدین نے لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کا کچھ حصہ خود مصنف سے پڑھا بھی ہے۔

محمد بن ابی الخیر علی بن ابی سلیمان ظفر ہمدانی۔ ان کا بھی تذکرہ منتجب الدین نے کیا ہے اور لکھا ہے عالم مفسر صالح واعظ لہ کتاب مفتاح التفسیر ودلائل القرآن" وہ عالم مفسر واعظ تھے۔ اُن کی تصنیف سے کتاب مفتاح التفسیر اور دلائل القرآن ہیں۔"

اب چھٹی صدی شروع ہوجاتی ہے اور اُن علماء میں جنھوں نے اس دور میں علم تفسیر کی خدمت کی ہے حسب ذیل حضرات ہیں۔ شیخ جمال الدین **ابوالفتوح رازی** حسین بن علی بن محمد خزاعی یگانۂ روزگار مفسر تھے ان کی کتاب تفسیر قرآن میں "روض الجنان وروح الجنان" بیس جلدوں میں سرمایۂ تحقیق ہے یہ شیخ منتجب الدین اور ابن شہر آشوب دونوں بزرگوں کے استاد تھے۔

سید عز الدین علی بن ضیاء الدین ابی الرضا فضل اللہ الحسنی الراوندی یہ مذکورہ بالا سید ضیاء الدین فضل اللہ بن علی حسنی کے بیٹے اور منتجب الدین کے معاصر ہیں منتجب الدین نے کتاب فہرست میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُنھوں نے ایک کتاب تفسیر قرآن میں لکھی جو تمام نہیں ہوئی۔ تاریخ وفات پورے طور سے معلوم نہیں لیکن اتنا ثابت ہے کہ سنہ ۵۴۸ھ تک یہ زندہ موجود تھے۔

اسی زمانہ میں **امین الاسلام شیخ ابوعلی** فضل بن حسن بن فضل **طبرسی** مشہور مفسر ہیں جن کی تفسیر مجمع البیان اس وقت دنیائے تشیع میں مرکز استفادہ ہے۔ یہ کتاب اصل تصنیف کے موقع پر دس حصوں میں منقسم کی گئی تھی جو ایران میں دو جلدوں میں طبع ہوئی اور اب مطبع العرفان صیدا میں پھر وہ بہت سی جلدوں میں پھیلا کر طبع کی گئی ہے۔ اس تفسیر میں اللغۃ الاعراب اور پھر المعنی کے عناوین قائم کیے گئے ہیں اور اوّل الذکر دونوں عنوانوں کے تحت میں سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

اس کتاب کے متعلق ایک عام اعتراض ہے جسے شیخ یوسف بحرینی نے لؤلؤۃ البحرین" میں صاف ظاہر کردیا ہے۔ وہ یہ کہ اُنھوں نے بہت سی چیزیں تفاسیر اہل سنت سے نقل کی ہیں اور تفاسیر اہل بیتؑ کو بہت کم درج کیا ہے۔ بے شک کہیں کہیں تفسیر عیاشی اور علی بن ابراہیم قمی سے بعض احادیث نقل کردیے ہیں اور بس۔ علامہ طبرسی کی علاوہ مجمع البیان کے دو تفسیریں اور تھیں ایک متوسط جو چار حصوں پر منقسم تھی اور دوسری مختصر جو ایک جلد میں تھی۔ اُس متوسط ہی کا نام "جوامع الجامع" تھا جو عام طور سے "جمع الجوامع" مشہور ہے۔ نیز ایک کتاب "الشافی الکاف من تفسیر الکشاف" علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کے تبصروں پر مشتمل تھی۔ آپ کا انتقال

سنہ ۵۴۸ھ میں ہوا۔

اس طبقہ کے بعد اسی صدی میں۔

قطب الدین راوندی سعد بن ہبۃ اللہ بن حسن ہیں جنھوں نے "خلاصۃ التفاسیر" تحریر کی جو دس جلدوں پر مشتمل تھی اس کے علاوہ کتاب فقہ القرآن اور کتاب آیات الاحکام تصنیف کی۔ شیخ حر عاملی کا امل الآمل میں یہ خیال ہے کہ شرح آیات الاحکام کتاب فقہ القرآن کے علاوہ ہے محدث نوری مستدرک الوسائل میں لکھتے ہیں کہ کتاب فقہ القرآن وہی کتاب آیات الاحکام ہے۔ اُس کے علاوہ نہیں ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ آیات الاحکام یا فقہ القرآن یعنی قرآن مجید کے اُن آیات کی تفسیر جو احکام فقہیہ سے متعلق ہیں سب سے پہلے انھی قطب الدین راوندی نے تصنیف کی جو سنہ ۵۶۲ھ میں پایۂ اتمام کو پہونچی۔ سنہ ۵۷۳ھ میں اُنھوں نے انتقال کیا۔

شیخ محمد بن ادریس عجلی حلی مصنف سرائر مشہور فقیہ و عالم ہیں اُنھوں نے کوئی مستقل تفسیر نہیں لکھی مگر کتاب التعلیقات ایک کتاب تفسیر "تبیان" مصنفہ شیخ الطائفہ کے متعلق حواشی اور اعتراضات کے طور پر تحریر فرمائی۔ شیخ حر عاملی امل الآمل میں لکھتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب ایران میں خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی۔ آپ کی وفات سنہ ۵۹۸ھ میں ہوی۔

محمد بن حسین فتال فارسی نیشاپوری آپ نے ایک کتاب "تنویر فی معانی التفسیر" تحریر فرمائی جس کا ابن شہر آشوب نے تذکرہ کیا ہے۔

شیخ رشید الدین محمد بن علی ابن **شہر آشوب** سروی مازندرانی مصنف کتاب المناقب بڑے پایہ کے مفسر تھے۔ علمائے اہلسنت میں سے شمس الدین محمد بن علی بن احمد داؤدی مالکی شاگرد جلال الدین سیوطی نے ان کا طبقات المفسرین میں تذکرہ کیا ہے۔ اُن کے مصنفات سے جو علم تفسیر سے متعلق ہیں دو کتابیں ہیں کتاب الاسباب والنزول علی مذہب آل الرسول اور کتاب متشابہ القرآن اس دوسری کتاب کا قلمی نسخہ میں نے کتب خانۂ آقا علی محمد نجف آبادی میں جو نجف اشرف کے حسینیۂ شوستریان کے اندر وقفی صورت سے موجود ہے۔ مشاہدہ کیا ہے۔ ابن شہر آشوب نے سنہ ۵۸۸ھ میں انتقال کیا۔

ساتویں صدی ہجری میں۔

سید احمد بن موسیٰ بن طاؤس مشہور و معروف سید علی بن طاؤس کے بھائی تھے انھوں نے ایک کتاب "شواہد القرآن" تحریر کی جو دو جلدوں میں تھی سنہ ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔

علامہ **حسن بن یوسف** بن مطہر حلی حقیقۃً آیۃ اللہ خدا کی نشانی تھے اتنے کثیر التعداد مصنفات کہ انسان متحیر ہو جائے۔ علم تفسیر میں اُن کی دو کتابیں ہیں۔ (۱) نہج الایمان فی تفسیر القرآن" اس میں انھوں نے کشاف تبیان وغیرہ تفاسیر کا خلاصہ ذکر کیا ہے (۲) السر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز۔ سنہ ۷۲۶ھ میں دنیا سے رحلت

فرمائی اور اُن کی ولادت ۲۹ رماہ رمضان سنہ ۶۴۸ھ میں ہوی تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ باون سال اُن کی عمر کے ساتویں صدی میں گذرے۔

آٹھویں صدی میں۔

ملا عبد الرزاق کاشی: ان کا ذکر آقا حاج شیخ عباس قمی طاب ثراہ نے کتاب الکنی والالقاب میں کیا ہے۔ اُن کی تصنیف سے ہے کتاب تاویل الآیات سنہ ۷۳۵ھ میں وفات پائی۔

شیخ **قطب الدین** محمد بن محمد رازی بویہی بڑے منطقی فلسفی فقیہ و مفسر شہید اول اور فخر المحققین فرزند علامہ حلی کے شاگرد تھے علم تفسیر کے سلسلہ میں ان کی تصنیف سے تفسیر کشاف زمخشری کے دو حاشیے تھے جو کثیر علمی و تفسیری نکات پر مشتمل تھے۔ سنہ ۷۶۶ھ میں وفات پائی۔

شیخ مقداد بن عبد اللہ سیوری حلی اسدی یہ بھی شہید اوّل کے شاگرد تھے۔ تفسیر میں ان کی کتاب کنز العرفان فی فقہ القرآن" ہے جو آیات الاحکام کی شرح میں تحریر فرمائی ہے آپ کی وفات سنہ ۸۲۶ھ میں ہوی۔

شیخ **جمال الدین احمد** بن عبد اللہ بن سعید المتوج معروف بہ **ابن متوج** بحرانی یہ بھی شہید اوّل اور فخر المحققین کے شاگرد تھے۔ فاضل مقداد اپنی کتاب کنز العرفان" میں ان کو" معاصر" کی لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

اُنھوں نے دو مستقل تفسیریں تحریر فرمائیں ایک مختصر اور ایک مطوّل اس کے علاوہ ایک رسالہ ناسخ اور منسوخ کے بیان میں۔ ایک کتاب" النہایۃ فی تفسیر المنسمائۃ آیۃ" اُس میں اُن پانچسو آیتوں کی تفسیر ہے جو احکام شرعیہ کے متعلق فقہا نے منتخب کی ہیں۔

نویں صدی میں۔

سید **بہاء الدین** علی بن سید غیاث الدین عبد الکریم بن عبد الحمید حسینی اُنھوں نے تفسیر کشاف زمخشری پر آٹھ سو اعتراض تحریر کیے جنھیں دو جلدوں میں مجتمع کیا ایک "تبیان انحراف صاحب الکشاف" دوسرے" النکت اللطاف الواردۃ علی صاحب الکشاف"۔

کمال الدین حسن بن محمد بن حسن استر آبادی نجفی اُنھوں نے آیات الاحکام" کی تفسیر میں" معارج السئول و مدارج المامول" جس کا مشہور نام کتاب" اللباب" ہے۔ تصنیف کی کہا گیا ہے کہ یہ آیات الاحکام کی شرح میں بہترین تصنیف تھی۔ اس کتاب کی تصنیف سنہ ۸۹۱ھ میں ختم ہوی ہے۔

دسویں صدی ہجری میں۔

امیر غیاث الدین منصور حسینی شیرازی جو سید علی خاں شارح صحیفۂ کاملہ کے اجداد میں سے ہیں اُن کے تصانیف سے ہے تفسیر القرآن وفات سنہ ۹۴۸ھ میں ہوی۔

شاہ طاہر دکنی جنھوں نے حیدر آباد میں تشیع کی بنیاد قائم کی اُن کے مصنفات میں سے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ ہے جو بہت نکات تفسیری پر مشتمل ہوگا۔ اُنھوں نے سنہ ۹۵۶ھ میں انتقال کیا۔

شہید ثانی شیخ زین الدین بن علی عاملی دینائے تشیع کے مستند ترین علماء میں سے تھے۔ اُن کے تصانیف کا بڑا حصہ علم فقہ واصول سے متعلق ہے علم تفسیر میں اُنھوں نے ایک رسالہ بسم اللہ کی شرح میں اور ایک رسالہ آیۂ مبارکہ والسابقون الاوّلون کی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔ آپ سنہ ۹۶۶ھ میں بجرم تشیع شہید ہوئے۔

ابوالغنائم عبدالرزاق کاشانی یہ شہید ثانی کے معاصرین میں سے تھے۔ اُنھوں نے ایک کتاب "التاویلات" تفسیر آیات متشابہات میں لکھی تھی۔ یہ کتاب کتب خانۂ رضویہ مشہد مقدس میں موجود ہے جس کے متعلق فہرست کتب خانہ میں لکھا ہے "انصاف این است کہ مثل این کتاب تصنیف نہ شدہ" یہ عجیب لطیفہ ہے کہ فہرست مذکور کے بیان کے مطابق اس کتاب "تاویلات" کو ہندوستان میں محیی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کر کے طبع کیا گیا جو بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

علی بن حسن زوّاری۔ محقق ثانی علی بن عبدالعالی کرکی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے فارسی زبان میں کتاب "ترجمۃ الخواص" قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے متعلق تحریر کی۔

محمد بن احمد معروف بہ **خواجگی شیرازی** اُنھوں نے تفسیر مجمع البیان کا خلاصہ تحریر کیا جس کو ابراہیم قطب شاہ (سلطان حیدرآباد دکن) کے نام سے معنون کیا۔

ملا فتح اللہ کاشانی، ان کی منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج دونوں مشہور ہیں سنہ ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔

اسی صدی کے اواخر میں **ملا احمد بن محمد** مقدس اردبیلی مشہور مجتہد تھے جنھوں نے تفسیر آیات الاحکام میں کتاب "زبدۃ البیان" تصنیف کی آپ نے سنہ ۹۹۲ھ میں وفات پائی۔

ملا خلیل قزوینی مشہور شارح اصول کافی تھے جنھوں نے تفسیر مجمع البیان کا ایک حاشیہ تصنیف کیا۔ شیخ حر عاملی امل الآمل میں لکھتے ہیں کہ میں نے موصوف کو اپنے پہلے سفر حج میں مکہ معظمہ میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں مجاور تھے اور حاشیۂ مجمع البیان کی تصنیف میں مشغول تھے آپ کا انتقال سنہ ۱۰۰۱ھ میں ہوا۔

فیضی مشہور ابوالفضل کے بھائی سلطان جلال الدین اکبر بادشاہ کے مشہور ارکان سلطنت میں سے بڑے ادیب اور مشکل پسند تھے۔ انھوں نے تفسیر قرآن صنعت اہمال یعنی غیر نقطہ دار حروف میں تصنیف کی جس کو "سواطع الالہام" سے نامزد کیا اس کتاب کی تصنیف سنہ ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی ہے اور یہ تفسیر موجود اور شایع ہے۔

اسی طبقہ میں جو دسویں صدی کے اواخر اور گیارھویں صدی کے اوائل میں موجود تھا۔

سید حسین خلخالی نے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ تحریر کیا۔ کشف الظنون میں اس حاشیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سورۂ لیس کی ابتدا سے آخر قرآن مجید تک ہے، لیکن کتب خانۂ امام رضا علیہ السلام میں اس حاشیہ کا ایک نسخہ موجود ہے جو ابتدائے قرآن مجید سے ہے۔ موصوف کا انتقال سنہ ۱۰۱۴ھ میں ہوا۔

قاضی نور اللہ شوستری جو ہندوستان میں شہید ثالث کے نام سے مشہور ہیں جن کا مزار آگرہ میں ہے اُنھوں نے تفسیر بیضاوی پر دو حاشیے تحریر کیے۔ سنہ ۱۰۱۹ھ میں بجرم تشیع جہانگیر کے حکم سے مقتول ہوئے۔

میرزا محمد استرآبادی مشہور مصنف رجال کبیر انھوں نے کتاب شرح آیات الاحکام یعنی احکام فقہیہ سے متعلقہ آیتوں کی تفسیر تحریر کی۔ سنہ ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی۔

سید محمد بن زین العابدین حسینی استرآبادی۔ ان کی تصنیف ہے تفسیر (ترجمۃ الخواص) میں نے اس کی دوسری جلد دیکھی ہے جو سورۂ مریم سے آخر قرآن تک ہے اور ۲۰ صفر کو سنہ ۱۰۱۶ھ کو اس کی تصنیف سے فراغت ہوئی ہے۔ وفات کا حال معلوم نہیں۔

اب یہ وہ طبقہ ہے جو اسی گیارھویں صدی کے اواسط سے تعلق رکھتا ہے۔

احمد بن زین الدین علوی اُنھوں نے کتاب "لطائف غیبی" فارسی میں تصنیف کی جس میں اُن آیات قرآن کی تفسیر لکھی ہے جو اصول دین سے متعلق ہیں۔ اس موضوع میں غالباً ان کے پہلے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی تھی اور ان کے بعد بھی ہماری نظر سے تو کوئی کتاب ایسی نہیں گذری۔ مشہد مقدس میں اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف شروع سنہ ۱۰۳۳ھ میں ہوئی ختم کا حال معلوم نہیں۔

معزّ الدین اردستانی ابن ظہیر الدین میر میران حسینی حیدرآباد میں مقیم تھے شیخ محمد بن خاتون عاملی کی فرمائش سے سورۂ ہل اتیٰ کی تفسیر لکھی اور اس کو سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ حیدرآباد کے نام سے معنون کیا اس کتاب کی تصنیف سنہ ۱۰۴۴ھ میں ہوئی۔

نعمت خان عالی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے شہرۂ آفاق رکن سلطنت فاضل شخص تھے ایک کتاب تفسیر قرآن تحریر کی زبان فارسی میں۔

آقا رضی الدین محمد قزوینی آپ کے اکثر علوم میں تصانیف میں منجملہ اُن کے ایک کتاب تفسیر قرآن میں ہے، اس میں ہر آیت کے ذیل میں اکثر علوم سے جو اُس سے تعلق رکھتے ہیں بحث کی گئی ہے۔

شیخ بہاء الدین عاملی مشہور جامع علوم وفنون مجتہد تھے۔ علم تفسیر میں آپ نے ایک مبسوط کتاب "عروۃ الوثقیٰ" تحریر فرمانا شروع کی تھی جس میں صرف تفسیر سورۂ فاتحہ میں ایک جلد پوری تالیف ہو سکی اور بس، ایک دوسری تفسیر اس کے علاوہ "عین الحیوٰۃ" تھی جس کا انداز پہلے کی بہ نسبت مختصر تھا۔ نیز تفسیر بیضاوی پر ایک حاشیہ لکھا وہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ سنہ ۱۰۳۱ھ میں رحلت فرمائی۔

میر محمد ہادی حسینی مرعشی شوستری۔ قاضی نور اللہ شہید ثالث کے اعزا میں سے تھے ان کی تفسیر مشہور ہے۔ سنہ ۱۰۳۸ھ میں رحلت فرمائی۔

تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی مشہور فاضل ہندی مصنف کشف اللثام کے والد تھے کتاب "بحر موّاج" تفسیر میں فارسی زبان میں تحریر کی۔ سنہ ۱۰۸۵ھ میں انتقال کیا۔

ملا نظام الدین ساوجی قریشی، شیخ بہائی کے شاگرد تھے ان کی تصنیف سے فارسی زبان میں ایک بڑی تفسیر ہے جس میں مفسرین کے اقوال اور محاکمہ اس کے ساتھ بعض اسرار حروف درج ہیں۔

ملا بدیع الزمان، ہرندی اصفہانی شیخ الاسلام یزد تھے۔ انکی ایک تفسیر فارسی زبان میں ہے جس کے بعض اجزا اصفہان میں موجود ہیں ۱۰۵۹ھ میں وفات پائی۔

ملا صدرا شیرازی جو سرآمد روزگار حکیم و متکلم فلسفی تھے انھوں نے اپنے مذاق پر ایک مجموعہ تفسیر تصنیف کیا جس میں ابتداء میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے پھر سورۂ بقرہ اس آیت تک فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین پھر تفسیر آیۃ الکرسی، تفسیر آیۂ نور، تفسیر سورۂ الم سجدہ، تفسیر سورۂ یٰس، تفسیر سورۂ واقعہ، تفسیر سورۂ جمعہ، تفسیر سورۂ طارق، تفسیر سورۂ اعلیٰ، تفسیر سورۂ زلزال، تفسیر آیہ (وتری الجبال تحسبھا جامدۃ) یہ سب کچھ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ صدر المتألہین شیرازی فلسفیات میں انتہائی شغف کی بدولت ظواہر الفاظ اور معانی متعارفہ سے اتنے بعید ہو گئے تھے کہ وہ الفاظ کے سیدھے معانی کے بجائے ہمیشہ حکمت و فلسفہ کے مذاق پیچ در پیچ معانی میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے الفاظ کے بالکل ظاہری پہلوان کی نظر سے مخفی رہ جاتے تھے اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کی شرح اصول کافی بھی ارباب فن کے لیے اقبال خیز ثابت ہوئی اور تفسیر قرآن بھی مقبولیت کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔

اسی صدی کے اواخر میں۔

ملا محسن فیض کاشانی نے جیسا کہ امل الآمل میں ہے تین تفسیریں تحریر کیں۔ بڑی۔ چھوٹی اور متوسط مگر خود موصوف نے جو اپنے مصنفات کی فہرست مرتب کی ہے۔ اُس میں دو ہی تفسیروں کا تذکرہ ہے ایک تفسیر صافی جو بہت مشہور و معروف ہے اس میں انھوں نے احادیث ائمہ معصومین نقل کیے ہیں لیکن جا بجا تاویل آیات اپنے مذاق عرفان و تصوف کے مطابق ذکر کی ہے یہ کتاب ۱۰۷۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ دُوسرے تفسیر اصفیٰ یہ ایران میں تفسیر صافی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ کتاب تنویر المذاہب جس میں حواشی ہیں۔ اُس تفسیر پر جس کا نام ہے "مواہب"۔

شیخ فخر الدین طریحی نے کتاب "کشف غوامض القرآن" تصنیف کی اور ایک کتاب "نزہۃ الناظر و سرور الخاطر" جو خاص لغات قرآن مجید کی شرح میں "غریب القرآن" مصنفۂ ابو حاتم سجستانی کے انداز پر ہے ۱۰۸۵ھ میں انتقال کیا۔

شیخ حسین بن شہاب الدین خاندار ابن حسین عاملی کرکی۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا ۱۰۷۶ھ میں وفات پائی۔

سید شرف الدین علی حسینی استرآبادی ان کی کتاب "تاویل الآیات الظاہرہ" کا علامہ مجلسی نے بحار الانوار کے تمہیدی مقدمہ میں تذکرہ کیا ہے۔

محمد بن محمد محسن الفیض الکاشانی یہ صاحب تفسیر صافی کے صاحبزادے ہیں "علم الہدیٰ" خطاب تھا انھوں نے علم تفسیر میں ایک کتاب "وجیزہ" تحریر کی جس میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

نور الدین محمد یہ ملا محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی کے بھتیجے تھے انھوں نے کتاب "المبین" تفسیر میں تحریر کی جو بالکل مختصر ہے اور مثل ترجمہ کے سمجھنا چاہیے۔

ملا محمد طاہر قمی۔ تفسیر کئی جلدوں میں لکھی ہے ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔

سید ہاشم بحرینی علامہ فخر الدین طریحی کے شاگرد اور مشہور کتاب "مدینۃ المعاجز" کے مصنف ہیں علامہ مجلسی کے بعد ان کا سا وسیع النظر اس دور آخر میں کوئی نہیں گذرا۔ ان کی کتاب تفسیر "برہان" اپنے رنگ کی مخصوص تفسیر ہے۔ جس میں بہت تتبع کے ساتھ احادیث آئمہ علیہم السلام کو تفسیر قرآن کے متعلق جمع کیا گیا ہے۔ اس سے مختصر دُوسری تفسیر "الہادی وضیاء النادی" تصنیف کی یہ بھی غالباً موجود ہے اور طبع ہو چکی ہے ۱۱۰۷ھ میں وفات پائی۔

شیخ جواد بن سعد اللہ بن جواد بغدادی کاظمی یہ شیخ بہاء الدین عاملی کے شاگرد تھے آیات الاحکام کی تفسیر "مسالک الافہام" تحریر کی جس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ اس موضوع میں سب سے بڑی اور جامع تصنیف ہے۔

شیخ حسام الدین طریحی، یہ شیخ حر عاملی کے معاصر تھے ان کی کتاب "تفسیر قرآن" کا تذکرہ امل الآمل میں موجود ہے۔

شیخ حسین بن مطر جزائری یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر ہیں اور اُن کی "تفسیر قرآن" کا تذکرہ بھی امل الآمل میں درج ہے۔

شیخ عبد علی بن جمعہ عروسی حویزی شیراز میں قیام رکھتے تھے۔ شیخ حر عاملی کے معاصر ہیں ان کی کتاب تفسیر "نور الثقلین" چار جلدوں میں تھی۔ اس میں بھی پابندی کی گئی ہے کہ احادیث آئمہ علیہم السلام کے سوا دُوسرے مفسرین کے اقوال نقل نہ ہوں۔

شیخ عبد علی بن رحمہ حویزی شیخ بہائی کے شاگرد تھے۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔

شیخ عبد القاہر بن حاج عبد بن رجب بن مخلص عبادی حویزی شیخ حر عاملی کے معاصر تھے شیخ جواد کاظمی کی تفسیر آیات الاحکام پر جس کا تذکرہ ہو چکا حواشی تحریر کیے جن کا نام رکھا "سلوک مسالک المرام فی مسلک مسالک الافہام" نیز تفسیر بیضاوی پر بھی حواشی تحریر فرمائے۔

سید علی خاں ابن خلف بن مطلب بن حیدر موسوی حویزی بہ حویزہ میں جو خوزستان کے علاقہ میں ہے حاکم تھے اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع، تفسیر قرآن چار جلدوں میں تحریر کی جس کا نام ہے "منتخب التفاسیر" اس میں پہلے اُن مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہیں جن کے تفاسیر اُن کے پاس موجود تھے جیسے کشاف۔ بیضاوی۔ مجمع البیان۔ عیاشی علی بن ابراہیم پھر خود تائیدی یا اعتراضی صورت سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ نیز جو نکات اور اشارات آیت کے خود اُن کی نظر میں ہیں انھیں ذکر فرماتے ہیں۔ اس کتاب کی ابتدا جمادی الاُخریٰ ۱۰۸۲ھ میں ہوئی ہے اور ربیع الاول ۱۰۸۸ھ میں سورۂ رحمن کی تفسیر تک پہونچی۔

شیخ فرج اللہ بن محمد بن درویش بن محمد بن حسین بن حماد بن اکبر حویزی۔ یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر

تھے۔ ایک کتاب لکھی "تذکرۃ العنوان" جو عجیب وغریب صورت رکھتی ہے اس کے بعض الفاظ سیاہی سے ہیں اور بعض دوسرے رنگوں سے جو طول میں بھی پڑھے جاتے ہیں اور عرض میں بھی۔ پوری کتاب دیکھنے میں ایک ہے لیکن اُس کے مختلف رنگوں کے الفاظ سے مختلف کتابیں مختلف علوم کی پیدا ہوتی ہیں ایک کتاب نحو میں ایک منطق میں۔ ایک عروض میں۔ ہیئت میں شرح تشریح الافلاک مصنفۂ شیخ بہائیؒ اور ایک منظومہ معانی وبیان میں اور ایک تفسیر اور ایک تاریخ اور ایک دیوان اور ایک رسالہ حساب میں اور اس کے علاوہ بعض دُوسری چیزیں سب اس کتاب میں داخل ہیں اور واقعہ اس کا یہ تھا کہ کسی نے علمائے اہل سنت میں سے کتاب لکھی تھی "عنوان الشرف" جس میں مذکورۂ بالا علوم تھے اور امام شافعی کی فقہ اور ایک تاریخ تھی۔ یہ تذکرہ شیخ فرج اللہ کے سامنے ہوا تو اُنھوں نے اس کے بعد ہی اس کتاب کو دیکھے بغیر "تذکرۃ العنوان" کتاب تصنیف کی جس میں یہی صنعت مدنظر رکھی ہے۔

بہر حال اس کتاب میں علم تفسیر کا ایک شعبہ مستقل رکھا گیا ہے۔

سید محمد رضا حسینی منشی الممالک ساکن اصفہان شیخ حر عاملی کے معاصر تھے امل الآمل میں ہے کہ انھوں نے کتاب تفسیر القرآن تصنیف کی تیس جلدوں سے زیادہ میں جو عربی اور فارسی پر مشتمل ہے اور اس میں احادیث کو ترجمہ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

احمد بن حسن حر عاملی مشہور شیخ حر عاملی کے بھائی تھے۔ شیخ حر نے اپنی کتاب امل الآمل میں اُن کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک کتاب "تفسیر قرآن" میں اُن کی تصنیف ہے۔

محمد حسین بن محمد قمی یہ قاضی سعید قمی کے بھائی اور رجب علی تبریزی فلسفی کے شاگرد تھے۔ اعیان الشیعہ میں ہے کہ ان کی کتاب تفسیر قرآن میں بڑی مبسوط فارسی زبان میں ہے جو اُن کے تبحر علمی کا پتہ دیتی ہے۔

محمد مومن سبزواری یہ بھی شیخ حر عاملی کے معاصر تھے اور "تفسیر قرآن" کے مصنف۔

امیر محمد مومن بن محمد زمان طالقانی قزوینی اسی زمانہ میں تھے۔ سورہ مُلک کی تفسیر لکھی اور اپنے زمانہ کے بادشاہ کے نام سے معنون کی۔

شیخ علی بن شیخ حسین کربلائی اُن کی کتاب "انوار الہدایۃ" مشہد مقدس کے کتب خانہ امام رضاؑ میں موجود ہے اس کی تین فصلیں ہیں پہلی تفسیر آیۂ (ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ) دُوسری تفسیر آیۂ (واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ) تیسری بیان علوم دینیہ میں۔ کتاب کے خاتمہ میں شیخ بہائیؒ اور ابن خاتون کے بعض اقوال نقل کیے ہیں۔ اس کے قلمی نسخہ کی جو کتب خانہ میں موجود ہے تاریخ ربیع الاول سنہ ۱۱۰۱ھ ہے۔

میرزا محمد رضا قمی ان کے تصانیف سے کتاب "کنز الدقائق" ہے جو تفسیر قران میں ہے روضات الجنات میں خیال قائم کیا ہے کہ غالباً یہ ملا محسن کاشانی کے شاگردوں میں سے تھے۔

علامہ سید محسن عاملی نے ان کا تذکرہ اس نام سے کیا ہے کہ "میرزا محمد مشہدی ابن محمد رضا القمی" اور لکھا ہے کہ اُن

کی تصنیف ہے کنز الدقائق و بحر الغرائب تفسیر قرآن میں اور قوسین میں لکھا ہے (المائۃ الثانیۃ عشر) یعنی وہ بارھویں صدی میں تھے۔

اب بارھویں صدی کا ابتدائی دور ہے۔

سید نعمت اللہ جزائری مشہور محدث اور علامہ مجلسیؒ کے شاگرد تھے۔ آپ کی ایک تفسیر "العقود والمرجان" بہت مختصر تھی جو قرآن مجید کے حواشی پر اکثر تحریر کی جاتی رہی ہے۔

امیر محمد صالح خاتون آبادی علامہ مجلسی کے داماد تھے ایک رسالہ تفسیر سورۂ حمد و تفسیر سورۂ قل ہو اللہ میں تحریر کیا سنہ ۱۱۱۶ھ میں انتقال کیا۔

امیر محمد اسماعیل خاتون آبادی ایک بڑی تفسیر تحریر فرمائی جو ۱۴ جلدوں میں تھی اُنھوں نے بھی سنہ ۱۱۱۶ھ میں وفات پائی۔

امیر ابراہیم بن محمد معصوم قزوینی تفسیر آیات الاحکام مصنفۂ ملا احمد اردبیلی کی شرح لکھی جس کا نام رکھا "تحصیل الاطمینان فی شرح زبدۃ البیان" اس کا کچھ حصہ آپ نے اپنے استاد آقا جمال خوانساری کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بہت پسند کیا اور گرانقدر الفاظ میں پشت کتاب پر تقریظ تحریر فرمائی جس کی تاریخ سنہ ۱۱۱۷ھ تھی۔

شیخ سلیمان بن عبد اللہ ماحوزی بحرینی، ان کی کتاب تفسیر میں علامہ سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان کے طرز پر ہے سنہ ۱۱۲۱ھ میں انتقال کیا۔

محمد بن عبد الفتاح سراب تنکابنی علامہ مجلسی کے شاگردوں میں سے ہیں کتاب تفسیر آیات الاحکام اردبیلی کے اوپر حواشی تحریر کیے سنہ ۱۱۲۴ھ میں انتقال کیا۔

شیخ عبد اللہ بن نور اللہ البحرانی مصنف مقتل عوالم، علامۂ مجلسی کے شاگرد تھے اور ایک کتاب تفسیر میں بھی لکھی ہے۔

ملا عبد اللہ مجلسی، یہ علامہ مجلسی کے بھائی تھے تفسیر کے مصنف ہیں۔

میرزا عبد اللہ آفندی مصنف ریاض العلماء، ان کی ایک کتاب تفسیر میں تھی جو وسط قرآن کے حدود تک پہونچی تھی اس کے بعض اجزا اصفہان اور شیراز میں موجود ہیں۔ سنہ ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی۔

سید نور الدین بن سید نعمت اللہ جزائری کتاب تفسیر میں لکھی جو مکمل نہیں ہوی۔

سید عبد اللہ بن سید نور الدین شوستری بڑے جامع علوم وفنون بزرگ تھے۔ ایک کتاب تفسیر میں بھی لکھی ہے۔

سید بہاء الدین محمد بن محمد باقر حسینی مختاری نائینی ان کی تفسیر تقریباً پانچ جلدوں میں ہے سنہ ۱۱۳۰ھ میں وفات ہوی۔

فاضل ہندی بہاؤ الدین محمد بن تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی انھوں نے ایک مبسوط کتاب تفسیر قرآن

میں تحریر کی سنہ ۱۱۳۷ھ میں انتقال فرمایا۔

سید محمد حیدر موسوی عاملی مکی آپ نے تفسیر آیات الاحکام تحریر کی جسے بادشاہ وقت سلطان حسین صفوی کے نام پر معنون کیا اور آپ نے عجیب و غریب طریقہ یہ اختیار کیا کہ آپ نے آیات احکام فقہیہ کے ساتھ اُن آیتوں کو بھی داخل کر لیا جن سے کوئی اصولی مسئلہ علم کلام کا یا اصول فقہ کا یا عقلی و نقلی مسائل میں کا استفادہ ہوتا ہے اور پھر اس میں نقض و ابرام اور احتجاج و استدلال بہت تفصیل کے ساتھ ہے۔ ایک رسالہ مستقل سورۂ یوسف کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ (اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم) سنہ ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی۔

یہ اس صدی کا وسطی دور ہے۔

ملا ابوالحسن شریف فتونی عاملی۔ صاحب جواہر کے نانا بڑے بلند مرتبہ عالم تھے ایک تفسیر "مرآۃ الانوار" سورۂ بقرہ کے وسطی حصہ تک تحریر کی جو کثیر الفوائد ہے۔ فاضل نوری مصنف مستدرک الوسائل کا بیان ہے کہ عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ اس تفسیر "مرآۃ الانوار" کے تمہیدی مقدمات جو خود ایک مستقل جلد میں ہیں اور اصل مصنف کے قلم کے لکھے ہوئے صاحب جواہر کے کتب خانہ میں موجود ہیں مَیں نے انھیں عاریت لیا اور بہت زحمت اور مشقت کے ساتھ انھیں نقل کیا۔ یہ نسخہ کتاب کا طہران کے ایک سفر میں میرے ساتھ تھا اس کو مجھ سے بعض ارکان سلطنت نے لے لیا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ تفسیر "برہان" مصنفہ سید ہاشم بحرینی کو طبع کرائیں مگر چونکہ اُس میں صرف نقل احادیث پر اکتفا کی ہے اور بیان و تشریح نہیں ہے اس لیے خیال کیا کہ اس کتاب کو بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے۔

اس طرح اس کتاب کی نقل انھوں نے بھی حاصل کر لی۔ میں عراق واپس ہوا اور اتفاق کی بات کہ وہ شخص جو اس طبع کے بانی تھے اُن کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کے مطبوعہ حصہ اور تفسیر "مرآۃ الانوار" کے اُس قلمی نسخہ کو بعض ارباب مطبع نے خرید کیا اور اُن ناقص اجزاء کو تمام کر کے مکمل تفسیر کو طبع کیا اور "مرآۃ الانوار" کو ایک علیحدہ جلد میں چھپوایا۔ یہ مطبوعہ نسخہ جب میری نظر سے نجف اشرف میں گذرا تو میں نے اس کے سرنامہ پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی دیکھی۔

"کتاب مرآۃ الانوار ومشکوٰۃ الاسرار وھو مصباح لانظار الابرار ومقدمۃ للتفسیر الذی صنفہ الشیخ الاجل والنحریر الانبل العالم العلامۃ والفاضل الفہامۃ الشیخ عبداللطیف الکازرانی مولدا والنجفی مسکنا"

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب مرآۃ الانوار تصانیف سے شیخ عبداللطیف کے ہے جو کازران میں متولد ہوئے تھے اور نجف میں قیام کیا۔

یہ دیکھنا تھا کہ میں ششدر ہو گیا۔ میں نے صاحب مطبع کو اطلاع دی کہ یہ تفسیر ملا ابوالحسن شریف کی ہے۔ اور شیخ عبداللطیف کا تو کوئی نام ہی کبھی میں نے نہیں سُنا ہے۔ غالباً جاہل کاتب اور مہتمم مطبع نے یہ عبداللطیف کے نام کا استنباط دیباچہ کے ان الفاظ سے کیا ہے۔ جو خطبہ کے بعد ہیں۔ (یقول العبد الضعیف الراجی لطف ربہ اللطیف خادم کلام اللہ الشریف) اس سے یہ خیال کیا کہ انھوں نے اپنے نام کی طرف لطیف اشارہ کیا ہو

لیکن کازران کی طرف نسبت کی بنیاد اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔

صاحب مطبع نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا تدارک کر دیں گے مگر افسوس ہے کہ اب تک یہ وعدہ وفا نہیں ہوا۔ اور کتاب اُسی صورت سے شایع ہے۔ لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ تفسیر جو سنہ ۱۲۹۵ھ میں طہران میں طبع ہوئی ہے جس کے سرورق پر مذکورہ بالا عبارت ہے۔ یہ ملا ابوالحسن شریف کی ہے جن کو صاحب جواہر "جدی العلامۃ" کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ عبداللطیف کازرانی کی نہیں ہے جن کی غالباً ولادت بھی اب تک نہیں ہوئی ہے۔

مُلا ابوالحسن شریف کی وفات سنہ ۱۱۴۰ھ کے حدود میں ہوئی۔

شیخ احمد بن اسماعیل جزائری انھوں نے کتاب تفسیر "آیات الاحکام" تصنیف کی جو ایران میں طبع ہو چکی ہے اس میں انھوں نے احادیث کی پابندی کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتاب تفسیر میں لکھ رہے تھے جو مکمل نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۱۵۰ھ میں انتقال کیا۔

ملا محمد اسمٰعیل مازندرانی خاجوئی "زبدۃ البیان" یعنی تفسیر آیات احکام مصنفۂ محقق اردبیلی پر حواشی تحریر کیے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۱۷۳ھ میں ہوا۔

شیخ محمد رضا بن محمد امین ہمدانی اُن کی تصنیف ہے "الدر النظیم فی تفسیر القران الکریم" جس کا تذکرہ علامہ سید محسن عاملی کی کتاب اعیان الشیعہ میں مندرج ہے۔

سلطان محمد بن حیدر بن محمد جنابذی اُن کی تفسیر بیان السعادۃ چھپ چکی ہے۔

شیخ علی حزیں مشہور عالم اور شاعر ہیں ان کے کثیر التعداد تصانیف میں سے تفسیر بھی ہے سنہ ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

سلیمان خرجی غالباً اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی ہے جس میں ملا محسن کاشانی اور علامہ مجلسیؒ کے حوالے دیے ہیں اس لیے باعتبار زمانہ مجلسی سے متاخر ضرور ہیں۔

تیرھویں صدی کا ابتدائی دور وہ ہے جب ہندوستان میں صوبۂ اودھ کے شہر لکھنؤ کا آفتاب کمال افق پر طلوع ہو گیا تھا یعنی جناب غفرانمآب طاب ثراہ کے فیوض علمیہ پھیل رہے تھے۔ خود آپ کے مصنفات میں تفسیر قرآن تو مستقل طور سے موجود نہیں ہے۔ لیکن آپ کے تلامذہ میں سے مولوی **یاد علی** صاحب نصیر آبادی جو آپ کے قریبی اعزا میں سے تھے انھوں نے فارسی میں تفسیر تحریر کی جو دو جلدوں میں ہے۔ اسی زمانے میں **میرزا محمد اخباری** نیشاپوری تھے ان کے تصانیف سے بھی ایک تفسیر ہے یہ سنہ ۱۲۳۲ھ میں قتل ہوئے۔

حاج میرزا یوسف طباطبائی تبریزی، آغا باقر بہبہانی وغیرہ کے شاگرد تھے۔ ایک بڑی تفسیر کے مصنف ہیں۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں انتقال فرمایا۔

جناب مولانا سید علی صاحب نے جو جناب غفرانمآب کے منجھلے صاحبزادے تھے تفسیر "توضیح مجید" اُردو زبان میں تحریر فرمائی جس میں ادبی و ذوقی نکات درج کیے ہیں اور عوام کی خاطر سے ہے اس لیے دقیق و غامض معانی درج نہیں ہیں آپ نے سنہ ۱۲۵۹ھ میں کربلائے معلیٰ میں انتقال کیا۔

مفتی محمد قلی صاحب نیشاپوری کنتوری یہ بھی جناب غفرانمآب کے ممتاز شاگرد تھے۔ انھوں نے کتاب "تقریب الافہام" تفسیر آیات الاحکام میں تحریر فرمائی۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔

سید عبداللہ شبر کاظمی بڑے کثیر التصانیف مجتہد تھے۔ آپ نے ایک کتاب "صفوۃ التفاسیر" تحریر فرمائی جو بتیس ہزار بیت پر مشتمل تھی (بیت پچاس حرفوں کی ہوتی ہے) دوسری کتاب "جوہر ثمین فی تفسیر القرآن المبین" ۲۴ ہزار بیت۔ ایک تیسری کتاب تفسیر میں ۱۸ ہزار بیت۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔

حاج میرزا لطف علی بن میرزا احمد تبریزی۔ انھوں نے ایک مبسوط تفسیر لکھی ہے دو جلدوں میں جو قرآن مجید کے وسطی حصہ سے آخری تہائی کے قریب تک ہے اور اس میں علم کلام کے مسائل میں اکثر بہت تفصیل سے کام لیا ہے سنہ ۱۲۶۲ھ میں رحلت ہوئی۔

آخوند ملا مہر علی تبریزی خوئی متخلص بفدوی ان کی تفسیر تصوف و عرفان کے مسلک پر ہے سنہ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔

حاج ملا عبدالوہاب قزوینی ان کے مصنفات میں تفسیر بھی ہے سنہ ۱۲۶۱ھ میں وفات ہوئی۔

جناب علیین مکان سید العلماء السید حسین اعلی اللہ مقامہ۔ جناب غفرانمآب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے آپ کی تصنیف سے حسب ذیل کتابیں ہیں۔ امالی فی التفسیر والمواعظ۔ تفسیر سورہ فاتحہ۔ تفسیر سورہ قل ہو اللہ۔ تفسیر سورہ دہر۔ تفسیر قولہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ تفسیر آیات ابتدائی سورہ بقر۔ سنہ ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے **جناب جنت مآب ممتاز العلماء السید محمد تقی** طاب ثراہ نے شہرۂ روزگار تفسیر "بنابیع الانوار" تصنیف فرمائی۔ اتنی مبسوط تفسیر موجودہ شیعی کتب تفسیر میں نایاب ہے۔ ہر پارہ کی تفسیر ایک جلد میں ہے اگر پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی تو بتیس جلدوں میں ہوتی۔ لیکن صرف تین جلدیں اس کی لکھی گئیں جو سورہ آل عمران تک پہونچی ہیں۔ اس میں احادیث بہت جستجو سے لکھے گئے ہیں اور اُن آیات میں جو اختلافی حیثیت رکھتے ہیں امام فخر الدین رازی اور دوسرے مفسرین کے اقوال سے مکمل بحث کی گئی ہے۔

یہ تفسیر آپ کے انتقال کے بعد جب علامہ کنتوری مولانا سید غلام حسنین صاحب اعلی اللہ مقامہ نے مدرسہ ایمانیہ قائم کیا ہے اور لکھنؤ سے اخبار جاری کیا ہے تو چھپنا بھی شروع ہوئی تھی جس کے بعض اوراق چھپے ہوئے ہم نے دیکھے ہیں مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ پھر طباعت ملتوی ہو گئی۔ وفات سنہ ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

آقا محمد حسین باشنہ طلائی ان کے تصانیف سے ایک بڑی تفسیر ہے سنہ ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی۔

اسی عصر میں مولانا **سید رجب علیخاں** جگراؤں (پنجاب) کے ذی علم رئیس تھے انھوں نے "کشف الغطا فی تفسیر سورہ ہل اتی" اور "السر الاکبر فی تفسیر سورۃ الفجر" تصنیف کی موصوف کا انتقال سنہ ۱۲۸۶ھ میں ہوا۔

ملا علی قاریوز آبادی قزوینی مقیم زنجان بزرگ مرتبہ عالم تھے۔ آپ کے مصنفات میں سے ایک کتاب

تفسیر قرآن ہے جو سورہ یٰسین سے آخر قرآن تک ہے ۸ محرم سنہ ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔

حاج محمد نجف کرمانی نسابہ۔ ایک کتاب تفسیر میں لکھی ہے سنہ ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔

اسی زمانہ میں **حاج ملا محمد صالح برغانی** مشہور شہید ثالث ملا محمد تقی برغانی صاحب مجالس المتقین کے بھائی قزوین کے مستند عالم تھے۔ انھوں نے تفسیر قرآن سات جلدوں میں تحریر فرمائی۔

محمد بن سلیمان تنکابنی مصنف قصص العلماء نے چند آیات قرآنی کی تفسیر آٹھ ہزار بیت میں لکھی ہے۔

ملا حسین علی تویسرکانی، ایک کتاب تفسیر میں لکھی۔ سنہ ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی۔

ملا محمد تقی ہروی حائری صاحب جواہر اور شیخ مرتضیٰ انصاری کے شاگرد تھے۔ علم تفسیر میں حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ خلاصۃ البیان فی تفسیر مشکلات القرآن۔ خلاصۂ تفسیر آیۃ الکرسی مصنفۂ سید کاظم رشتی تفسیر آیۂ مبارکہ فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔ سنہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔

سید مہدی قزوینی بڑے بلند مرتبہ جلیل القدر عالم۔ صاحب جواہر وغیرہ کے شاگرد تھے۔ ان کے مصنفات میں حسب ذیل کتابیں ہیں تفسیر سورہ حمد۔ تفسیر سورہ قل ہو اللہ و تفسیر سورہ انا انزلناہ۔ کتاب آیات الاصول جس میں آپ نے اصول فقہ کے تمام مباحث میں آیات قرآن سے استدلال کیا ہے سنہ ۱۳۰۰ھ میں سفر حج سے واپسی میں وفات پائی۔

حاج ملا رضا ہمدانی مصنف مفتاح النبوۃ اُن کی کتاب الدر النظیم فی تفسیر القرآن العظیم طبع ہو چکی ہے۔

ملا سلطان گونابادی مشہور صوفی شخص تھے جن کے نام سے ایک فرقہ ایران میں موجود ہے۔ اُن کی ایک بڑی تفسیر عربی زبان میں چھپی ہوئی موجود ہے جو اُنہی کے خیالات کے مطابق ہے۔

فردوس مکان سید العلماء حجۃ الاسلام مولانا سید محمد ابراہیم طاب ثراہ ہمارے جد امجد نے اپنے والد ماجد جناب جنت مآب کی تفسیر ینابیع کا تکملہ دو جلدوں میں تحریر فرمایا۔ نیز تفسیر سورہ یوسف مستقل طور سے تحریر کی۔ آپ کی وفات سنہ ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔

شیخ محمود مشیمی عراقی۔ ایک کتاب تفسیر میں تحریر کی۔ سنہ ۱۳۰۸ھ میں رحلت ہوئی۔

تاج العلماء مولانا السید علی محمد طاب ثراہ۔ آپ کے کثیر التعداد تصانیف میں سے جن کی تعداد دو سو کے قریب ہے حسب ذیل کتابیں مخصوص علم تفسیر سے متعلق ہیں۔ احسن القصص تفسیر سورہ یوسف جو مطبوع اور شائع ہے اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔ انوار الانظار در تفسیر سورہ نور دو جلدوں میں آپ کا ترجمہ قرآن بھی ہے جو آپ نے اپنے ایک شاگرد کے نام سے لکھا ہے اس کی ایک خصوصیت زبان کی ہے کہ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں لکھا گیا ہے اور ایک خصوصیت طباعت میں ہے کہ وہ متن سے علیحدہ چھپا ہے یعنی اصل قرآن اس کے ساتھ نہیں ہے یہ اس لیے کہ غیر مسلم افراد کے ہاتھ میں بلا تکلف دیا جا سکے، اسی ترجمہ کے ساتھ کافی مبسوط حواشی ہیں جن میں اکثر جگہ سر سید احمد خاں صاحب کے خیالات کی رو سے کی گئی ہے۔ سنہ ۱۳۱۲ھ میں انتقال کیا۔

مولوی عمار علی صاحب سونی پتی مرحوم جناب جنت مآب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اردو میں تفسیر

"عمدۃ البیان" تین جلدوں میں تحریر کی جو طبع ہو چکی ہے۔

اب یہ ہماری چودھویں صدی ہے۔

شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی یہ مشہور محقق شیخ محمد تقی مصنف ہدایۃ المسترشدین کے پوتے اور حاج شیخ محمد باقر اصفہانی کے بیٹے تھے۔ ایک کتاب تفسیر میں لکھنا شروع کی جو اواسط سورۂ بقر تک پہونچی اور اتنا ہی حصہ ایک جلد میں طبع کر دیا گیا جو موجود ہے آپ نے سنہ ۱۳۰۸ھ میں انتقال کیا۔

حاج میرزا محمد علی قراجہ داغی ایک بڑی تفسیر لکھی ہے سنہ ۱۳۱۰ھ میں دنیا سے رحلت کی۔

محقق شہرستانی حاج میرزا محمد حسین حائری۔ بڑے جامع علوم و فنون علامۂ روزگار کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ منجملہ تصانیف کے ایک بڑی تفسیر بھی ہے سنہ ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔

شیخ حسن ہشترودی تبریزی۔ ان کی تفسیر فارسی زبان میں ہے سنہ ۱۳۱۱ھ میں رحلت فرمائی۔

مولانا ابوالقاسم قمی لاہوری پنجاب کے جلیل المرتبت عالم تھے۔ لکھنؤ میں جناب سلطان العلماءؒ اور جناب جنت مآب سے تحصیل علم کی پھر عراق گئے اور آخر میں لاہور میں قیام فرمایا۔ آپ نے تفسیر لوامع التنزیل فارسی میں تحریر فرمائی جس میں یہی پابندی ہے کہ ایک پارہ کی تفسیر ایک جلد میں شاید تیرہ پاروں کی تفسیر آپ نے تحریر فرمائی اور بعض مجلدات اُس کے آپ کے بعد آپ کے خلف الصدق

شمس العلماء مولانا سید علی صاحب حائری دام ظلہ، نے جو اس وقت پنجاب میں مرجعیت رکھتے ہیں تصنیف فرمائے علامہ ابوالقاسمؒ نے سنہ ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔

ملا حسین سجاسی مقیم زنجان آپ کے تصانیف سے حسب ذیل کتابیں ہیں۔ تفسیر سورۂ رحمٰن، تفسیر سورۂ زمر، تفسیر سورۂ شمس جو طہران میں سنہ ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئی ہے۔

مولانا سید محمد محسن زنگی پوری مولانا سید محمد علی قائمۃ الدین کے شاگرد تھے اور اُس زمانہ میں جب انتزاع سلطنت کے بعد سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کلکتہ میں تھے تو آپ وہاں قیام فرما تھے۔ کتاب تفسیر سورۂ رحمٰن اور رازہار التنزیل تصنیف فرمائی سنہ ۱۳۲۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا سید احمد حسین صاحب امروہوی جناب مفتی صاحب قبلہ کے شاگرد تھے آپ کی تصنیف "معارج فی علوم القرآن" فارسی میں طبع ہو چکی ہے سنہ ۱۳۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

شیخ مرتضیٰ نظام الدین حلی کاظمینی۔ ان کی کتاب تفسیر قرآن میں ناتمام ہے سنہ ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی۔

آقا فتح علی زنجانی، نجف اشرف سے ہجرت کر کے کوفہ چلے گئے تھے اور خلق خدا سے الگ زندگی بسر کرتے تھے اس دوران میں ایک تفسیر لکھنا شروع کی جس کی دو جلدیں مکمل ہوئیں سنہ ۱۳۳۹ھ میں عالم آخرت کی طرف رہسپار ہوئے۔

سید علی طباطبائی یزدی حائری ان کی ایک کتاب تفسیر میں بڑی مبسوط ہے اور ایک کتاب ہے رق منشور در تفسیر آیہ نور۔

مولانا سید اعجاز حسین صاحب امروہوی جناب مفتی صاحب کے شاگرد تھے اور مولانا سید احمد حسین صاحب سے بھی تلمذ رکھتے تھے۔ ایک کتاب تفسیر آیات میں تحریر فرمائی۔ سنہ ۱۳۴۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا حافظ فرمان علی صاحب مرحوم، مشہور تو آپ کا ترجمہ قرآن ہے مگر اس ترجمہ میں جو بکثرت الفاظ قوسین کے اندر ہیں اس کی وجہ سے اُسے ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہیے نیز حاشیہ پر تفسیری نوٹ بھی تحریر کیے ہیں اس کے ساتھ شروع میں مضامین قرآن کی جو ایک مبسوط فہرست درج کی ہے وہ بڑی کار آمد چیز ہے

حکیم مقبول احمد صاحب دہلوی مرحوم۔ تھے تو آپ بلند پایہ جادو زبان مقرر مگر تصنیف کا بھی ذوق تھا چنانچہ آپ کا ترجمہ قرآن بھی مشہور و معروف ہے اور اس کا ایک مبسوط ضمیمہ کئی سو صفحات میں ہے جسے بلاشبہ تفسیر سمجھنا چاہیے۔

مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری مرحوم نے منجملہ کثیر التعداد تصانیف کے توحید القرآن۔ امامۃ القرآن۔ علوم القرآن۔ اُردو زبان میں تصنیف کی ہیں اور جب مدرسۃ الواعظین قائم ہوا تو موصوف تصنیف و تالیف کے کام پر اس مدرسہ کی جانب سے مقرر ہوئے۔

اس زمانہ میں آپ نے عربی زبان میں ایک کتاب "خلاصۃ التفاسیر" تحریر فرمانا شروع کی جس کی ایک قلمی جلد مدرسۃ الواعظین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی اور سنہ ۱۳۳۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

آخوند ملا حبیب اللہ کاشانی، اُن کے تصانیف سے ہے تفسیر سورۂ بقرہ، تفسیر سورۂ قدر، تفسیر آیۂ نور، تفسیر سورۂ اخلاص، درۃ الدرر فی تفسیر سورۃ الکوثر اور ایک کتاب تفسیر قرآن فارسی۔ سنہ ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی۔

اُن کے بھائی **آخوند ملا محمد تقی کاشانی** ساوجی نے بھی ایک کتاب تفسیر میں بڑی بھاری کئی جلدوں میں لکھی ہے۔

سید عبد الحسین حسینی آل کمونہ نجفی اُنھوں نے دو جلدوں میں ایک تفسیر نہایت اختصار کے ساتھ لکھی ہے اور ہر آیت کے ذیل میں متعلقہ روایات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

شیخ محمد حسین بن محمد خلیل شیرازی۔ تفسیر میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مصنفات اس سلسلہ میں حسب ذیل ہیں۔ تفسیر سورۂ یٰس۔ تفسیر سورۂ نبا تا آخر قرآن۔ تفسیر سورۂ مریم۔ تفسیر سورۂ حمد۔ تفسیر سورۂ کوثر۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی۔ حاشیہ کشاف وغیرہ۔

آقا سید ابوتراب خوانساری۔ نجف اشرف کے بڑے بلند پایہ مجتہد تھے آپ نے "البیان فی تفسیر بعض سور القرآن" اور "لب الالباب فی تفسیر احکام الکتاب" تصنیف فرمائی۔ سنہ ۱۳۴۲ھ میں جب کہ ہم نجف اشرف

ہی میں تھے آپ نے انتقال فرمایا۔

سید محمد رضا حسینی کاشانی لپشت مشہدی۔ ایک بڑی تفسیر کے مصنف ہیں ۱۳۴۷ھ میں انتقال فرمایا۔

آقا حسین نجم آبادی طہرانی۔ اکابر علمائے ایران میں سے تھے ہمارے زمانہ قیام نجف میں ان کے انتقال کی خبر آئی تھی اُن کے تصانیف سے تفسیر قرآن بھی ہے سنہ ۱۳۴۷ھ میں ۱۱ر رجب کو وفات پائی۔

شیخ علی اصغر بیرجندی ایران کے ممتاز عالم تھے لیکن کچھ تصوف کا مذاق غالب تھا۔ آپ نے ایک تفسیر لکھی جس میں بعض مقامات پر محیی الدین ابن عربی کی موافقت کی ہے۔ ایک کتاب "التفسیر بالماثور" سید ہاشم بحرینی کی تفسیر برہان کے انداز پر تحریر کی۔ یہ دو جلدوں میں تھی لیکن پھر بھی تفسیر برہان کی بہ نسبت مختصر ہے۔

اسی دور آخر میں عراق کے بلند پایہ مجاہد متکلم مناظر۔

آقا شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ جن کی عمر خدمت مذہب اور نصرت دین میں گذری اپنی آخر عمر میں تفسیر قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوئے مگر افسوس ہے کہ سورۂ نساء تک پہونچنے پائے تھے کہ انتقال کیا۔ اس تفسیر کا نام "آلاء الرحمن" ہے اور صیدا۔ سوریا کے مطبع العرفان میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ اپنے رنگ میں یہ تفسیر بہت خوب ہے۔ افسوس ہے کہ پایۂ اتمام کو نہ پہونچنے پائی۔ موصوف نے سنہ ۱۳۵۲ھ میں انتقال کیا۔

آقا شیخ محمد باقر بیرجندی طاب ثراہ۔ ہمارے شیخ الحدیث تھے آپ کے مصنفات سے تفسیر آیات الاحکام ہے سنہ ۱۳۵۲ھ کے حدود میں وفات پائی۔

موجودہ دور میں اُن حضرات میں سے کہ جو انشاء اللہ بقید حیات ہیں۔

آقا میرزا ہادی خراسانی دام ظلہ کربلائے معلی کے متبحر عالم ہیں آپ نے تفسیر بن ابراہیم قمی پر حواشی تحریر کیے ہیں جن میں جستجو کے ساتھ اہلسنت کے روایات کو بطور تائید درج فرمایا ہے۔

مولانا سید راحت حسین صاحب قبلہ گوپال پوری دام ظلہ بزرگ مرتبہ عالم، ہمارے والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کے بڑے بیجہت دوست، شریک درس اور ہم مباحثہ ہیں۔ آپ کتاب "انوار القرآن" کی تصنیف میں مشغول ہیں۔ جس کے بہت سے اجزا مطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن سے شائع ہوئے ہیں اُردو زبان میں یہ تفسیر مکمل ہونے پر بڑے مبسوط ذخیرہ کا اضافہ کرے گی۔

شیخ محمد نہاوندی، علمائے خراسان میں سے سر برآوردہ فرد ہیں، در تفسیر قرآن کی تحریر میں مصروف ہیں۔

شیخ محمد اشکوری نجفی:۔ ہمارے ہمعصر ہیں۔ تفسیر سورۂ حمد اور تفسیر سورۂ نور کے مصنف ہیں۔

فرقہ شیعہ کو ہر دور میں جن سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے اُن کو دیکھتے ہوئے اس فرقہ کے علماء

اور ارکان مذہب کے مذکورہ بالا خدمات اتنے اہم اور گرانقدر ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ساتوں آسمان وزن نہیں رکھتے۔

لیکن پھر بھی جیسی تفسیر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے وہ صرف فرقہ شیعہ کے تصانیف میں نہیں بلکہ مجموعۂ عالم اسلامی میں بھی موجود نہیں ہے۔

خدا اپنی توفیق جس کسی کے شامل حال کرے وہ اس فرض کو انجام دے۔ والسلام۔

علی نقی النقوی عفی عنہ
۳ر شعبان سنہ ۱۳۵۴ھ

علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر طبع ہوئی۔